

صَلَّى الْأَمَلُ الْحَسَنَ عَلَيْهِ السَّلَامُ

تصنيف

قَارِي ظَهْرُ أَحْمَدَ فَيَضِي

مَكْتَبَةُ رَأْيِ الْعُلَمَاءِ
لَا مَوْءِدَ بَلْ كُنْتُمْ





إِنَّ ابْنِي هَذَا سَيِّدٌ.

صَلِّ عَلَى الْأَمِيرِ الْحَسَنِ

تصنيف

قَارِي ظَهْرُ أَحْمَدَ فَيْضِي

مَكْتَبَةُ بَابِ الْعِلْمِ، لَاهُور، بَلُكْسْتَن

کمال الحق محفوظات

نام کتاب :	صحیح الامام الحسن علیہ السلام
مصنف :	قاری ظہور احمد فیضی
پروف ریڈنگ :	علامہ نصیر احمد نقشبندی، اویج شریف
صحیح و ترتیب :	محمد رفیعی
کپورنگ :	حسین ظہور قادری
بک درک :	محمد ساجد
تعداد :	1000
الطبعة الأولى :	۱۴۴۱ھ، مطابق ستمبر 2019ء
ہدیہ :	1200/- روپے
بتعاون :	حیاء الہدی، الشریشل

ناشر : مکتبہ باب العلم، لاہور۔ پاکستان

Tel: 042-37321214, 0300-4150021, 0321-178888
E-mail: maktababullim110lhr@gmail.com, www.mblp.com.pk

ڈسٹری بیوٹرز

ضیاء القرآن پبلی کیشنز: منج بخش روڈ لاہور / اردو بازار، کراچی

احمد بک کارپوریشن، اقبال روڈ کینٹی چوک، راولپنڈی

سیلی بک ڈپو احمد پور شرقیہ

مکتبہ اسلامیہ: لیعل آباد

مکتبہ خورشید ملت، نزد کینال ریسٹ ہاؤس، اویج شریف (بہاول پور)

0300 249 5037 - 0300 415 0021

وَأِنْ جُنْحُوا لِلْسَّلَامِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ

إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ. وَإِنْ يُرِيدُوا

أَنْ يَتَّخِذُوا فِئَةً حَسْبَكَ اللَّهُ.

اور اگر وہ مائل ہوں صلح کی طرف تو آپ بھی مائل ہو جائیے اُس کی طرف، اور بھروسہ کیجئے

اللہ تعالیٰ پر، بیشک وہی سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ ارادہ

کریں کہ آپ کو دھوکہ دیں تو بیشک کافی ہے آپ کو اللہ تعالیٰ۔

(الأنفال: ۶۱، ۶۲)

انتساب

تمام حق گو، حق پسند، اصحاب صدق و صفا اور ارباب عزیمت کے نام
بالخصوص فضیلۃ الشیخ عمدۃ الأولیاء نقیب الأشراف، مرشد شریعت
و طریقت السید محمد نور شاہ الجیلانی القادری الرازقی
الحموی أدام الله ظلّه و متّعنا به. سجادہ نشین
خانقاہ عالیہ سدرہ شریف، پاکستان۔

صَالِح النَّبِيِّ ﷺ الْمُشْرِكِينَ يَوْمَ الْحُدُيَّةِ
عَلَى ثَلَاثَةِ أَشْيَاءَ.

”نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ کے دن مشرکین کے ساتھ
تین شرطوں پر مصالحت فرمائی۔“

(بخاری: رقم الحدیث ۲۷۰۰)

إِهْدَاء

یہ فقیر اپنی اس معمولی کاوش کو اُس ہستی کی بارگاہ میں حد یہ کرتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے شیطان کے ہر مکر و فریب سے محفوظ فرما دیا تھا، جو ہستی حق و باطل، عدل و بغاوت، ہدایت و ضلالت اور دین و دنیا کے مابین حد فاصل اور امتیاز کی حیثیت رکھتی تھی۔ جن کی حقانیت کا یہ عالم تھا کہ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سامنے جنگِ جمل میں حق گوئی کا اظہار فرمایا تو اماں پاک نے فرمایا: میں دوسرے کسی بھی صحابی کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں تو کہہ سکتی ہوں مگر ان کے بارے میں کہنے کو کچھ بھی نہیں، کیونکہ یہ سر کے بالوں سے قدموں کے تلووں تک سراپا ایمان ہیں۔ نیز ام المومنین نے ان کے حق میں فرمایا: آپ بہت زیادہ حق گو ہیں، اس پر انہوں نے کہا: اُس اللہ تعالیٰ کے لیے حمد ہے جس نے آپ کی زبان پر میری حق گوئی کا فیصلہ جاری فرما دیا۔ یعنی پیکر حق، عاشقِ مصطفیٰ ﷺ، سپاہیِ مرتضیٰ ﷺ، شہیدِ ابنِ الشہیدین سیدنا و مولانا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ: ۴:

اگر قبولِ افتداز ہے عز و شرف

اظہارِ تشکر

حمد الہی کے بعد یہ عاجز اُن ہند گانِ خدا کا شکریہ ادا کرنا لازم سمجھتا ہے جنہوں نے کسی بھی طریقے سے اخلاقی حق اور باطلِ باطل میں تعاون کیا اور کرتے ہیں۔ خصوصاً میں اس مرتبہ ایک محبتِ اہل بیت کرام علیہم السلام کی مرضی کے خلاف تحریری صورت میں اُن کا شکریہ ادا کرنا لازم سمجھتا ہوں۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ مجھے مقاماتِ مقدسہ کی زیارات کرائیں بلکہ وہاں رورو کر میرے حق میں دعائیں بھی فرمائیں۔ بغداد شریف، نجف اشرف، کربلا مقدسہ اور دوسرے تمام مقامات پر دعائیں کیں۔ ایک مرتبہ ایک زیارت سے فارغ ہوئے اور اپنے رفقاء سفر کی طرف متوجہ ہوئے تو اُن کی ہشمانِ مبارک سے آنسو چھٹک رہے تھے۔ میں نے اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے عرض کیا: حضرت! میرے لیے دعا فرمادیں! فرمایا: کیا آپ کو بھی یہ کہنے کی ضرورت ہے؟ پھر فرمایا: میں نے آپ کے لیے از خود تین دعائیں کی ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ آپ کو باعزت سواری عطا فرمائے

۲۔ کشادہ گھر عطا فرمائے

۳۔ اور بہترین ادارہ عطا فرمائے۔

میں نے عرض کیا: خاتمہ بالخیر کی بھی دعا فرمادیں۔ فرمانے لگے: محبتِ اہل بیت کا خاتمہ خیر پر ہی ہوتا ہے، بلکہ وہ اُلٹا مجھے فرمایا کرتے ہیں کہ جب سیدنا علیؑ آپ کے ہاتھ کو تمام کر آپ کو جنت میں لے جا رہے ہوں تو اُس وقت ہمیں ضرور یاد رکھنا۔ زہے نصیب اللہ! اُن کے حسن ظن کو مجھ گنہگار کے لیے حقیقت بنادے۔

جس مقام پر انہوں نے رورو کر دعا مانگی تھی وہ سیدنا عباس بن علی بن ابی طالبؑ کا روضہ مقدسہ تھا۔ اُن کی مانگی ہوئی مذکورہ بالا دعاؤں میں سے پہلی دعا کو قبولیت کا جامہ عطا ہو چکا ہے، دوسری دعا کی قبولیت کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں اور ان شاء اللہ تعالیٰ تیسری دعا بھی ضرور قبول ہوگی۔

اہل بیت کرام علیہم السلام سے اُن کی والہانہ محبت کا عالم یہ ہے کہ میں اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے ایک ادارہ کا نوکر تھا، اُس ادارے کا تحقیقی کام کرنے کی وجہ سے میرا ذہن تھک جاتا تھا اور مجھ میں اپنا تحقیقی کام کرنے کی سکت باقی نہیں رہتی تھی۔ انہوں نے میری اس صورتِ حال کو بھانپ لیا تو از خود میرا اتنا وظیفہ مقرر کر دیا کہ مجھے اُس ادارے کا نوکر رہنے کی حاجت نہ رہی۔ اب میں ہمہ وقت اہل بیت کرام علیہم السلام کا نوکر ہوں اور اس نوکری سے زیادہ معزز نوکری کوئی بھی نہیں۔ یہاں یہ بھی عرض کرنا چلوں کہ میری کچھ کتب بھی اُن کے تعاون سے شائع ہوئیں اور بعض ہو رہی ہیں۔ اُس محب اہل بیت سے مراد سابق ایم پی اے، مرشد شریعت و طریقت حضرت علامہ سید شعیب شاہ نواز بخاری مہروی مدظلہ العالی کی شخصیت بابرکت ہے۔

یہاں یہ ناکارہ اپنے عزیز مکرم علامہ نصیر احمد نقشبندی آف اوچ شریف کا شکر یہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہے، کیونکہ وہ انتہائی باریکی بینی سے میری کتب کی پروف ریڈنگ فرماتے ہیں اور ہمہ قسم کی اغلاط کی نشاندہی کر کے حتی الامکان کتاب کو اغلاط سے مبرا بنانے میں معاونت فرماتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مجھ گنہگار کو، ان سب حضرات کو اور جملہ محبین، معاونین اور قارئین کو دارین کی ہر خیر عطا فرمائے اور ہر شر سے محفوظ رکھے۔ میری، اُن کی اور ہم سب کے زندہ اور وفات یافتہ والدین اور عزیز و اقارب کی کلی اور بے حساب مغفرت فرمائے، آمین بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ الطَّیِّبِیْنَ وَاصْحَابِہٖ السَّابِقِیْنَ الْمُقَرَّبِیْنَ۔



حمد و ضلّٰة

الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ
وآلِهِ الطَّيِّبِينَ الطَّاهِرِينَ الْمُطَهَّرِينَ وَأَصْحَابِهِ الْمُتَخَيَّرِينَ وَمَنْ
تَبِعَهُمْ يَإَحْسَنَ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ.

مقصدِ تالیف

یہ بات ضرور ذہن نشین رکھئے گا کہ اہل بیت کرام علیہم السلام کے متعلق میری کسی تحریر کا مقصد محض اُن کے فضائل یا تفصیل نہیں بلکہ اُن کی اعلیٰ سیرت سے آگاہ ہونا اور آگاہ کرنا، تمام امور میں اُن کے اعتدال و توازن سے اہل اسلام کو معلومات فراہم کرنا، خود غرضی سے اُن کا منزہ و مبرا ہونا اور ہر حال میں کتاب و سنت پر قائم رہنے اور اُمت کو قائم رکھنے میں اُن کی کادشوں اور قربانیوں کو پیش کرنا میرا مقصد ہے۔

اُن کی انصیت و تفصیل کا اثبات میرا مقصد تالیف ہے اور نہ ہی اُن ذواتِ مقدسہ کو اس سے کوئی سروکار ہے۔ اُن کے مد نظر تو ہمیشہ دین اسلام کا تحفظ، اُس کا ابلاغ اور اُس کی برتری رہی ہے، اور اُن کی اتباع میں ہمارا مقصد بھی یہی ہے۔ نبی کریم ﷺ کو بھی سب سے زیادہ فکر اسی بات کی تھی، یہی وجہ ہے کہ آپ نے، اپنے بعد اپنی خلافت کے لیے اہل بیت کرام علیہم السلام کے حق میں کوئی واضح حکم نہ فرمایا اور غیر اہل بیت کے لیے شارات و کنایات فرما گئے تاکہ کسی مسلم اور غیر مسلم کے دل میں یہ خیال ہی نہ آ سکے کہ (سید العالمین) محمد (ﷺ) اپنے گھروالوں کے لیے سب کچھ کرتے رہے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی اسی نبوی طرزِ عمل پر گامزن رہے، اُن سے جب بعض لوگوں نے کہا کہ خد فبت نبوت اہل بیت سے نکل کر دوسروں کی طرف جارہی ہے، در ساتھ ہی آفر بھی کر دی کہ اگر آپ چاہیں تو ہم آپ کی مدد کو تیار ہیں تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے برجستہ ارشاد فرمایا:

سَلَامَةُ الدِّينِ أَحَبُّ إِلَيْنَا مِنْ غَيْرِهِ.

”دین کی بقاء ہمیں دوسری باتوں سے زیادہ عزیز ہے۔“

(المرتضى لأبي الحسن علي الندوي، عربی ص ۸۹، و مترجم اردو ص ۱۴۹)

چنانچہ دین ہی کی سلامتی اور عروج کی خاطر وہ شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کے ساتھ تعاون فرماتے رہے، اسی لیے اُن دونوں حضرات کا دور خلافت بہترین رہا، مگر خلیفہ ثالث کے دور میں اُن کے رشتہ داروں نے اُن کے بڑھاپے سے ناجائز فائدے اٹھانے کی کوشش کی اور معاملہ بگاڑ دیا۔ بغرض اصلاح سیدنا علیؑ نے انہیں بھی سمجھانے کی بہت کوشش فرمائی اور بسا اوقات اُن کی نصیحتوں کو خلیفہ ثالث نے قبول بھی کیا لیکن معا بعد ہی خلیفہ ثالث کے بعض رشتہ داروں نے آکر ایسی چکنی چڑی باتیں کیں کہ سیدنا علیؑ کی اخلاص بھری نصیحتوں پر عمل نہ ہو سکا۔ بالآخر اُن ہی عاقبت نااندیش رشتہ داروں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے خلیفہ ثالثؑ شہید کر دیے گئے۔ اس کے بعد بار خلافت خود سیدنا علیؑ کے مبارک کندھوں پر آپڑا۔ انہوں نے خلافت سنبھالتے ہی محض کتاب و سنت کی بالادستی کی خاطر بعض اُن نالائق لوگوں کو معزول کر دیا جن کا تقرر بوجہ کتاب و سنت کے مطابق نہیں تھا اور اندیشہ تھا کہ اگر وہ اپنے منصب پر مزید برقرار رہ گئے تو خلافت کا رخ ملوکیت کی طرف مڑ جائے گا۔ اس حکم معزولی پر وہ بغاوت پر اتر آئے تو سیدنا علیؑ کو قرآن و سنت کی بالادستی کے لیے اُن کے خلاف جہاد کرنا پڑا، جس سے قیامت تک کے لیے سیدنا علیؑ کی حقانیت اور باغی کی بغاوت عیاں ہو گئی۔ پھر ایک موقع پر حکیم کا معاملہ سامنے آیا تو اُسے بھی مجبوراً قبول کرنا پڑا، پھر فریق مخالف نے حکیم میں تحریر کردہ شرائط کی خلاف ورزی کی تو سیدنا علیؑ **لَقَدْ بَلَغُوا الْبَيْتَ تَنْهَيْ حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ** کو مد نظر رکھتے ہوئے پھر اُن کے خلاف جہادی تیاریوں میں مشغول ہو گئے مگر درمیانی مدت میں خوارج کے ساتھ جنگ ناگزیر ہو گئی، ادھر سے فارغ ہوئے اور شام کی طرف جانے کے لیے تیاریوں میں مشغول تھے کہ اچانک انہیں شہید کر دیا گیا۔

پھر اُسی لشکر کو لے کر سیدنا امام حسن مجتبیٰؑ نے شام کا رخ کیا تو انہیں صلح کی پیش کردہ گئی، جس کو قبول کرنا بوجہ اُن کی مجبوری تھی۔ انہیں اقتدار عزیز نہیں تھا بلکہ وہ چیز محبوب تھی جو انہیں بطور گھٹی ورش میں ملی تھی، جس کو قرآن یوں بیان فرماتا ہے: **وَإِنْ صَلَّيْكُمْ وَلَسِيْكُمْ وَمَخَافِي وَمَخَافِي لِلَّهِ رَبِّ**

الْعَالَمِينَ ﴿۱﴾ اسی لیے معاہدہ صلح میں انہوں نے کتاب و سنت اور خلفاء راشدین علیہ السلام کی سیرت پر چلنے کی شرائط پر زیادہ زور دیا تھا اور اپنے مخالف کو دنیا و آخرت میں جو ابدہ بنایا تھا۔ معاہدہ صلح میں یہ شرائط لکھوا کر امام پاک علیہ السلام کو ذمہ ہو گئے لیکن دوسری جانب سے وہی کچھ ہوا جس کا انہیں اور ان کے بابا کریم علیہما السلام کو خدشہ تھا کہ خلافت کی جگہ ملوکیت آگئی، انتخاب کی جگہ موروثی سلطنت نے لے لی، عدل کی جگہ ظلم آگیا، اخلاص کی جگہ خود غرضی آگئی، سنت کے مقابلہ میں بدعت آگئی اور مشورہ کی جگہ جبر و استبداد آگیا۔ سو ہمارا مقصد تالیف حق و باطل کی اس معرکہ آرائی میں سیرت اہل بیت کو واضح کرنا ہے، تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس کشمکش میں اہل بیت کا ہدف کیا تھا اور ان کے مخالف کی غرض کیا تھی۔ یہ توضیح اس لیے ضروری ہے کہ اہل اسلام کی فوز و فلاح کے لیے قرآن مجید کے ساتھ جو دوسری چیز چھوڑی گئی وہ اہل بیت ہیں، اور انہیں امت میں محض محبت یا دعاؤں میں وسیلہ پیش کرنے کے لیے نہیں چھوڑا گیا بلکہ اس لیے چھوڑا گیا ہے کہ ان کی اتباع کی جائے۔

انعام یافتہ اور انعام پذیر

قرآن مجید میں انعام یافتہ ہستیوں کی راہ اور ان کے اسوہ کو اپنانے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ انعام یافتہ لوگوں میں کچھ ہستیاں ازلی منتخب ہوتی ہیں اور کچھ کسی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ کچھ انعام یافتہ ہوتی ہیں اور کچھ انعام پذیر۔ اسی حقیقت کو یوں بھی ادا کیا جاسکتا ہے کہ کچھ ہستیاں دنیا میں علم حاصل کرنے اور ریاضت و عبادت سے قبل ہی انعام یافتہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ انبیاء کرام علیہم السلام سب کے سب اسی شان کے حامل ہوتے ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ

”اللہ تعالیٰ منتخب فرماتا ہے فرشتوں اور لوگوں میں سے رسولوں کو۔“

(الحج: ۷۵)

سو چونکہ وہ ازلا منتخب ہوتے ہیں اسی لیے ارشاد فرمایا گیا:

وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُسْدَهُ مِنْ قَبْلُ

”اور یقیناً ہم نے عطا فرمایا تھا ابراہیم کو رشد پہلے سے۔“

(الانبیاء: ۵۱)

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے فرزند ارحمہ کے بارے میں بھی اسی طرح آیات آئی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے جب بیٹے کی دعا مانگی تو انہیں یوں خوشخبری دی گئی:

فَبَشِّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ.

”پس ہم نے مژدہ سنایا انہیں ایک حلیم فرزند کا۔“

(الصافات: ۱۰۱)

دوسرے مقام پر حلیم بیٹے کی بشارت دی گئی۔ ارشاد الہی ہے:

وَبَشِّرُوهُ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ.

”اور انہوں نے بشارت دی انہیں ایک صاحب علم فرزند کی۔“

(الذاریات: ۲۸)

اُن کے ازلی حلیم ہونے کی عملی شہادت یہ ہے کہ جب انہیں اُن کے بابا کریم علیہ السلام نے فرمایا کہ بیٹا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں ﴿وَمَا نُنْظِرُ مَاذَا تَرَى﴾ (غور کیجئے آپ کی کیا رائے ہے؟) بچے نے جواب یہ نہیں کہا کہ یہ خواب ہے، لہذا اس کی کوئی تعبیر ہوگی بلکہ عرض کیا:

يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ.

”ابا جی! کر ڈالو آپ کو حکم دیا گیا ہے۔“

خواب کو حکم الہی سمجھنا ازلی حلیم ہونے کی دلیل ہے، جبکہ اُن کے ازلی حلیم ہونے کا عالم یہ ہے کہ انہیں رضائے الہی کی خاطر ذبح کیا جانا تھا، لہذا نظری بات یہ ہے کہ اُن کے بابا انہیں قتل دیتے لیکن حیران کن بات ہے کہ یہاں ذبح ہونے والا بچہ اُلٹا اپنے بابا کریم علیہ السلام کو یوں عرض کر رہا تھا:

يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ. سَفَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ.

”ابا جی! کر ڈالو آپ کو حکم دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے چاہا تو آپ مجھ کو صبر کرنے

دالوں میں سے پائیں گے۔“

(الصافات: ۱۰۲)

یہ علم و حکم انہیں دنیا کے کس مکتب و مدرسہ سے حاصل ہوا تھا؟ کسی سے بھی نہیں بلکہ وہ ازلی منتخب ہستیوں میں سے تھے۔ اسی لیے علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے ارباب فکر و دانش کو اس علم و حکم میں غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے دریافت کیا ہے۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے، اسماعیل کو آدابِ فرزندگی؟

الغرض جس طرح انبیاء کرام علیہم السلام ازلا منتخب ہوتے ہیں اسی طرح غیر انبیاء کرام میں بھی کچھ ہستیاں ازلا منتخب ہوتی ہیں، جیسا کہ سیدہ ہاجرہ، سیدہ مریم، سیدینِ کریمین اور سیدینا مرثیٰ و زہرا علیہم السلام۔ راقم الحروف اوپر عرض کر چکا ہے کہ ازلی منتخب ہستیاں کسی قسم کی عبادت و ریاضت سے قبل ہی انعام یافتہ ہوتی ہیں۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے اُس حدیث میں غور فرمائیے جس میں ہے کہ حسین کریمین نو جوانانِ اہل جنت کے سردار ہیں، حالانکہ پانچ چھ برس کی عمر کے بچے مکلف ہی نہیں ہوتے۔ اسی طرح ان دونوں کے والدین بھی ازلی منتخب ہستیوں میں سے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کا سیدنا علیؑ کو ان کے بچپن میں ہی اپنی تربیت میں لے لیا درحقیقت انتخابِ الہی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے دعوتِ دو العشرہ میں فرمایا کہ کون ہے جو کارہائے نبوت میں میرا ہاتھ بٹائے اور میرا وزیر (بوجھ اٹھانے والا) بنے تو اُس وقت پوری قوم میں سے جس نے کھڑے ہو کر عرض کیا تھا کہ اس کام کے لیے میں ہوں، وہ دس سال کا بچہ علیؑ ہی تھا۔ حدیثِ پاک میں بھی اس کو انتخابِ خداوندی فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ سیدۃ نساء العالمین علیہا السلام کی زبان پر سیدنا علیؑ کی مسکینی کا شکوہ آیا تو آقا ﷺ نے انہیں فرمایا:

أَمَّا تَرْضَيْنَ يَا فَاطِمَةُ إِنَّ اللَّهَ اخْتَارَ مِنْ أَهْلِ الْأَرْضِ رَجُلَيْنِ أَحْلَاهُمَا
أَبُوكَ وَالْآخَرُ زَوْجُكَ.

”اے فاطمہ! کیا آپ اس پر بات راضی نہیں کہ اللہ ﷻ نے اہل زمین سے دو شخصوں

اُن سے لڑنا؟ اگر کہا جائے کہ وہ قصاصِ عثمان کی خاطر لڑ رہے تھے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں مسلح لشکر لے کر کیوں آئے تھے؟ کیا سیدنا امام حسن علیہ السلام کے سامنے قصاصِ عثمان علیہ السلام کا مطالبہ رکھا گیا تھا؟ نہیں، کیونکہ اُن کا ہدف قصاص تھا ہی نہیں بلکہ اُن کا ہدف اقتدار تھا اور نعرہ قصاص حصولِ اقتدار کا بہانہ تھا، جیسا کہ آئندہ صفحات میں اس سلسلے میں واضح تصریحات آئیں گی۔

نشہ خمار اور نشہ اقتدار

اقتدار کی لذت اور چمکا انسان میں اس حد تک مرایت کر جاتا ہے کہ انسان اقتدار کا بھی نشہ کی حد تک عادی بن جاتا ہے، الا ماشاء اللہ، اور جس طرح نشہ کا عادی شخص جسمانی صلاحیتوں کے نقصانات کو سمجھنے کے باوجود عداوت کو ترک نہیں کرتا اسی طرح اقتدار کے نشہ کا عادی شخص بھی دین و ایمان کے نقصانات کو سمجھنے کے باوجود عداوت کو ترک نہیں کرتا۔ اس کی ایک مثال اُس طویل حدیث میں موجود ہے جس میں ہرقل کا واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ اُس نے نبوتِ محمدی ﷺ کی حقانیت پر مبنی اُن تمام دلائل کا احاطہ کر لیا تھا جو اُسے مطلوب تھے اور اُس نے کامل یقین کے ساتھ کہا تھا:

سَيَمْلِكُ مَوْضِعَ قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ.

”عنقریب وہ نبی میری اس جگہ کا بھی مالک ہوگا۔“

حتیٰ کہ اُس نے یوں اظہارِ عقیدت بھی کیا تھا:

وَلَوْ كُنْتُ عَنْدَهُ لَعَسَلْتُ عَنْ قَدَمَيْهِ.

”اگر میں اُن کے قریب ہوتا تو ضرور اُن کے قدم مبارک دھوتا۔“

پھر اُس نے وہ خط طلب کیا جو اُس کے لیے نبی کریم ﷺ کی طرف سے آیا تھا، وہ اُس نے سنا، پھر اپنی کابینہ کے اراکین کو اپنے ایوان میں طلب کیا اور ایوان کے دروازوں کو بند کرنے کا حکم کیا، پھر کچھ دیر بعد اراکین کے سامنے آیا اور اُن سے یوں مخاطب ہوا:

يَا مَعْشَرَ الرُّومِ اَهْلُ لَكُمْ فِي الْفَلَاحِ وَالرُّشْدِ، وَاَنْ يَنْبُتَ مُلْكُكُمْ،

فَتَبَايَعُوا هَذَا النَّبِيَّ؟ فَحَاصُوا حَيْضَةَ حُمُرِ الْوَحْشِ إِلَى الْاَبْوَابِ،

فَوَجَدُوهَا قَدْ غُلِقَتْ ، فَلَمَّازَانِي هِرْقُلُ لَفَرْتَهُمْ وَأَيْسَ مِنَ الْإِيْمَانِ ، قَالَ :
رُدُّوهُمْ عَلَيَّ ، وَقَالَ : إِنِّي قُلْتُ مَقَالَتِي أَنَا أَعْتَبِرُ بِهَا شِدَّتَكُمْ عَلَى
دِينِكُمْ ، فَقَدْ رَأَيْتُ . فَسَجَدُوا لَهُ وَرَضُوا عَنْهُ .

”رومیو ادائیگی کامیابی اور ہدایت کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے، وہ یہ کہ
تمہارا ملک بھی باقی رہے اور تم اس نبی کی پیروی بھی کر لو؟ یہ سنتے ہی اُن تمام اراکین
نے جنگلی گدھوں کی طرح دروازوں کی طرف دوڑ لگادی تو انہیں بند پایا۔ پس جب
ہرقل نے اُن کی یہ نفرت دیکھی اور ایمان سے مایوس ہوا تو کہا: ان اراکین کو میرے
پاس لوٹا دو، اور کہا: میں نے ابھی ابھی جو کچھ کہا تھا اُس سے میں تمہاری دینی جنگی کو
آزمایا تھا تو وہ میں نے دیکھ لی۔ یہ سنتے ہی وہ تمام لوگ اُس کے سامنے سر بسجود ہو
گئے اور اُس پر خوش ہو گئے۔“

(بخاری، ص ۷۶۶ حدیث ۷)

اکثر جزوی یا کلی منصب و اقتدار ہی قبولِ حق کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے۔ کبھی غور فرمائیے کہ معروف
مقرر، نامور مفتی، مشہور پیر اور منصب پر فائز انسان حق کی حمایت و تائید سے گریزاں کیوں ہوتا ہے؟ علیٰ خدا
القیاس بین الاقوامی تناظر میں مسلم ممالک کے باہمی اتحاد کی راہ میں بھی منصب و کرسی رکاوٹ ہے۔ فی الجملہ
یہ کہ جس طرح سیدنا محمد ﷺ کو دل میں مہی برحق یقین کرنے کے باوجود کھلم کھلا آپ کی نبوت کے اعتراف
میں اقتدار مانع ہو گیا تھا اسی طرح نفسِ رسول، صنی نبی اور ”عَلِيِّ مَنِيِّ وَأَنَا مَنِيَّةُ“ کی شان والے خبیثہ برحق
کی خلافت و طاعت کو ماننے میں بھی جزوی اقتدار مانع ہوا تھا۔ کیوں اور کیسے؟ اس کو سمجھنے کے لیے آپ کو ذرا
ماضی میں جھانکنا ہوگا: خلافتِ مرتضوی کا منکر موافقہ القلوب سے تھا اور اُس کا شمار موافقہ القلوب کی اُس فیملی
سے تھا جسے ایک ہی جنگ میں یکجا تین سوانٹ اور ڈھیروں سونا چاندی مل گیا تھا۔ ایک ”ضَعْلُوک“
(نادار) شخص کا اپنے سامنے اس قدر مالی فراوانی کو دیکھنا معمولی بات نہیں تھی، لہذا خود سوچئے کہ اگر اُس
”ضَعْلُوک“ شخص کو اُسی دین کے جزوی یا کلی اقتدار تک پہنچنے میں کامیابی مل جائے اور وہ مسلسل کئی برس

تک اُس جزوی اقتدار کے مزے لوٹتا رہے، پھر اُسے کوئی خلیفہ برحق معزولی کا حکم نامہ بھیجے تو کیا وہ اُس قدر اقتدار کو ترک کرنے پر تیار ہوگا؟ ہرگز نہیں، یہی وجہ ہے کہ مغیرہ بن شعبہ نے سیدنا علیؑ کو مشورہ دیا تھا کہ اگر آپ معاویہ کو اُس کے منصب پر رہنے دیں گے تو آپ کا معاملہ مستحکم رہے گا، ورنہ وہ مزاحمت کرے گا۔ یہ بات باحوالہ آگے آئے گی۔

طلاق کے متعلق الفاظ نبوی ﷺ کا پورا ہونا

دراصل ایسے طلاق اور مؤلفۃ القلوب لوگوں کے ہارے میں وہ الفاظ تقدیر بن گئے تھے جو اُس وقت زبان نبوی ﷺ سے صادر ہوئے تھے جب آپ نے انہیں مال دیا تھا۔ آپ نے قدیم صحابہ کرامؓ کو فرمایا تھا کہ تمہیں میں نے تمہارے اسلام کے سپرد کیا ہے اور انہیں دنیا کے سپرد کیا ہے۔ عنقریب یہ الفاظ باحوالہ آرہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا اُن لوگوں کا اوڑھنا بچھونا بن گئی تھی۔ چنانچہ سیدنا عمار بن یاسرؓ نے میدانِ صفین میں فرمایا تھا کہ قصاص عثمانؓ ان کا بہانہ ہے اور اصل بات اقتدار کو پہچانا ہے۔

(البدایۃ والنہایۃ (قطر) ج ۷ ص ۴۵۵، ووط: بتحقیق عبدالمحسن الترمذی ج ۱۰ ص ۵۲۷)
اندر کی یہی بات خود معاویہ کی زبان سے بھی اُس وقت نکل گئی تھی جب عمرو بن العاص نے اُسے کہا تھا کہ علی تمہیں بلا رہا ہے کہ آؤ! میں اور تم ایک ایک ہاتھ کر لیتے ہیں تاکہ میرے اور تیرے درمیان اہل اسلام تو ہلاک نہ ہوں۔ اس پر معاویہ نے کہا تھا:

وَاللّٰہِ لَقَدْ عَلِمْتُ اَنْ عَلٰی لَمْ یَقْهَرْ قَطٌ ، وَاِنَّمَا اَزْدَتْ قَتْلِیْ لِنَصِیْبِ
الْخِلَافَۃِ مِنْ بَعْدِیْ ، اِذْهَبْ اِلَیْہِ فَلَیْسَ مِنِّیْ یُخَذَعُ .

”اللہ کی قسم تو خوب جانتا ہے کہ علی کبھی مغلوب نہیں ہوا، اور تو تو فقط میرا قتل چاہتا ہے تاکہ میرے بعد حکومت تجھے مل جائے، جا تو ہی اس کی طرف جا! مجھ ایسے شخص کو دھوکہ نہیں دیا جاسکتا۔“

(البدایۃ والنہایۃ ج ۷ ص ۴۵۱، ووط: ج ۵ ص ۳۶۳ ووط: ج ۱۰ ص ۵۱۸)

ایک اور مقام میں ہے کہ معاویہ نے عمرو بن العاص کو کہا:

إِنَّكَ لَتَعْلَمُ أَنَّهُ لَمْ يُبَارِزَهُ رَجُلٌ قَطُّ إِلَّا قَتَلَهُ ، وَلَكِنَّكَ طَمِعْتَ
لِيَهَيَّا بَعْدِي.

”تم خوب جانتے ہو کہ انہیں جس شخص نے بھی للکارا تو انہوں نے اُسے قتل کر
دیا، لیکن تم میرے بعد حکومت کی امید رکھتے ہو۔“

(البدایة والنهاية بتحقيق التركي ج ۱۰ ص ۵۴۱)

ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بھی اُن کے اقتدار کو دنیوی اقتدار قرار دیا تھا، بلکہ
اس سے بھی سخت ترین بات کر دی تھی۔

(سیر أعلام النبلاء ج ۳ ص ۱۴۳)

سیدنا فضیل بن عیاض رحمہ اللہ نے بھی معاویہ کو حب دنیا میں مبتلا قرار دیا تھا۔

(البدایة والنهاية ج ۸ ص ۲۰۳)

یہی وجہ ہے کہ اُن کے دور میں دنیوی فتوحات، چمک دمک اور ظاہری تمکنت تو تھی لیکن باطنی اور
دینی تمکنت مفقود تھی۔ چنانچہ مولانا محمد قاسم نانوتوی لکھتے ہیں:

”ہر چند کہ اُن کو بظاہر تمکین میسر آئی، لیکن حقیقت میں وہ تمکین دین نہ تھی، تمکین
ملک و سلطنت تھی۔“

(هدية الشيعة ص ۶۶)

شاید بعض لوگ اِن حقائق کو غیر معتبر، تاریخی روایات یا عام اقوال کہہ کر مسترد کرنے کی کوشش کریں
یا یہ کہنا شروع کر دیں کہ صحابہ کا دنیا سے کیا کام؟ ایسے لوگوں کو چاہیے کہ وہ قرآنی الفاظ ﴿مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ
الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ﴾ کے ساتھ ساتھ درج ذیل نبوی پیش گوئی کو بھی ضرور مد نظر رکھیں۔
امام بخاری لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا:

وَاللَّهِ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمْ أَنْ تُشْرِكُوا بَعْدِي ، وَلَكِنْ أَخَافُ
عَلَيْكُمْ الدُّنْيَا أَنْ تَنَافَسُوا فِيهَا.

”اللہ کی قسم! مجھے تم پر یہ خوف نہیں کہ تم میرے بعد شرک کر دو گے، لیکن میں تم پر دنیا کا خوف کرتا ہوں کہ تم اُس میں مبتلا ہو جاؤ گے۔“

(بخاری ص ۱۸۰ حدیث ۱۳۴۴)

مسلم شریف میں یہ حدیث بایں الفاظ آئی ہے:

وَلَكِنِّي أَخْشَى عَلَيْكُمْ الدُّنْيَا أَنْ تَتَنَافَسُوا فِيهَا وَتَقْتُلُوا فَتَهْلِكُوا،
كَمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ.

”لیکن مجھے تم پر دنیا کا خدشہ ہے کہ تم اس کے لالچ میں مبتلا ہو کر ایک دوسرے سے لڑنے لگو تو ہلاک ہو جاؤ، جیسا کہ تم سے پہلے لوگ ہلاک ہوئے۔“

(صحیح مسلم: کتاب الفضائل، باب إثبات حوض نبينا ﷺ وصفاته، ص ۱۰۱۶ حدیث

(۲۲۹۶)

یہ حدیث بخاری شریف میں تقریباً چھ مقامات پر آئی ہے، اُن میں سے بعض مقامات کی تشریح میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں جن جن باتوں کے واقع ہونے کی نبی کریم ﷺ نے خبر دی وہ واقع ہو کر رہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

وَأَنَّ أَصْحَابَهُ لَا يُشِيرُ كَوْنُ بَعْدَهُ فَكَانَ كَذَلِكَ، وَوَقَعَ مَا أَتَدَرَّ بِهِ
مِنَ التَّنَافُسِ فِي الدُّنْيَا.

”اور آپ ﷺ (نے خبر دی کہ آپ) کے اصحاب آپ کے بعد شرک نہیں کریں گے تو ایسا ہی ہوا، اور دنیا میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے متعلق جو انہیں ڈرایا تھا وہ بھی واقع ہو کر رہا۔“

(فتح الباری: کتاب المناقب ج ۸ ص ۲۷۷ حدیث ۳۵۹۶، البحر المحیط التاج شرح صحیح

مسلم لابن الحجاج، ج ۳۷ ص ۴۷)

علامہ ابوالعباس قرطبی لکھتے ہیں:

هَذَا الَّذِي تَوَقَّعَهُ النَّبِيُّ ﷺ مَرَّ الَّذِي وَقَعَ بَعْدَهُ ، فَعَمَّتِ الْفِتْنُ ،
وَعَظُمَتِ الْمِحْنُ ، وَلَمْ يَنْجُ مِنْهَا إِلَّا مَنْ عَصِمَ ، وَلَا يَزَالُ الْهَرَجُ إِلَى
يَوْمِ الْقِيَامَةِ .

”یہ خدشہ جس کی نبی کریم ﷺ نے توقع فرمائی تھی وہ آپ کے بعد ہو کر رہا، پس
فتنے عام ہو گئے، تکالیف بڑھ گئیں اور اُن فتنوں اور تکلیفوں سے نجات اُس نے پائی
جسے محفوظ رکھا گیا اور وہ فساد قیامت تک باقی رہے گا۔“

(المفہم لابی العباس القرطبی ج ۶ ص ۹۴)

جب اِس قتل و قتل کا سبب فقط مال دنیا کو قرار دیا گیا ہے تو ذرا غور کر کے بتلائیے کہ وہ کون سے صحابہ
تھے جو دنیا کی خاطر لڑے؟ اگر مال دنیا اور اقتدار کی خاطر اِزلی انعام یافتہ ہستیوں سے لڑنے والوں سے مراد
وہ لوگ نہ ہوں جنہوں نے جنگوں کے ذریعے اقتدار حاصل کیا اور پھر جاتے جاتے وہی اقتدار اپنی اولاد و
قوم کے سپرد کر گئے تو پھر تلاش کر کے بتائیے کہ دوسرے کون سے صحابہ مراد ہیں؟

بعد از وصال نبوی ﷺ دنیا کی خاطر لڑنے والوں کو اہل تحقیق محدثین نے صحابہ تو تسلیم کیا ہے لیکن
اُن کا تعین نہیں کیا۔ آئیے! اس سلسلے میں احادیث صحیحہ اور حسنہ میں جو کچھ اشارات ملتے ہیں اُن میں غور
و فکر کر لیتے ہیں۔ کتب احادیث و سیرت کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں میں طلقاء سرفہرست ہیں
جن کی تعداد تقریباً دو ہزار کے لگ بھگ تھی، اُن میں سے کچھ لوگ زیادہ مضراور جنگ جو تھے، اُن کے دلوں
کو نرم کرنے کے لیے انہیں مال دیا گیا، انہیں طلقاء کے علاوہ مؤلفۃ القلوب بھی کہا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں
میں ابوسفیان اور اُن کی فیملی کے نام سرفہرست آتے ہیں۔ چنانچہ سیرت نگار حضرات غزوہ حنین کے ذکر میں
لکھتے ہیں:

”رسول اللہ ﷺ نے مؤلفۃ القلوب کو عطا کیا، وہ لوگوں میں سے سرغنہ قسم کے
لوگ تھے، آپ نے انہیں اس لیے عطا کیا تا کہ اُن کے اور اُن کے رشتہ داروں کے
دل مائل ہوں، پس آپ نے ابوسفیان بن حرب کو سوانث دیے اور اُن کے بیٹے معاویہ

کو بھی سوا ونٹ دیے۔

(السيرة النبوية لابن إسحاق ص ۵۸۴؛ السيرة النبوية لابن هشام ج ۴ ص ۱۳۲؛ دلائل النبوة للبيهقي ج ۵ ص ۱۸۲؛ الروض الأنف للسيوطي ج ۴ ص ۲۷۰؛ البداية والنهاية، دار المعارف ج ۴ ص ۳۵۹؛ سبل الهدى للصالحی ج ۴ ص ۴۰۰)

اس سلسلے میں تفصیلی بحث تو ہم اپنی کتاب ”الصحابہ والطلاق“ میں کریں گے، یہاں صریح الفاظِ نبوی ﷺ سے اتنا جان لیجئے کہ ان لوگوں کو اس قدر مال کیوں دیا گیا، اور یہ کہ جن سابقین کو اس موقع پر مال نہ دیا گیا تو انہیں مال کی بجائے کیا دیا گیا؟ سو جانا چاہیے کہ انصار ﷺ کو اس موقع پر نبوی مال میں سے کچھ بھی نہیں دیا گیا تھا تو ان میں سے بعض حضرات کو رنج ہوا تھا۔ آقا ﷺ نے انہیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا تھا:

إِنِّي لَا أُعْطِي رَجُلًا حَدِيثٌ عَنْهُمْ يَكْفُرُ، أَمَا تَرْضَوْنَ أَنْ يَذْهَبَ
النَّاسُ بِالْأَمْوَالِ وَتَرْجِعُوا إِلَى رِحَالِكُمْ بِرَسُولِ اللَّهِ؟ قَالُوا: بَلَى يَا رَسُولَ اللَّهِ قَدْ رَضِينَا.
بِهِ خَيْرٌ مِمَّا يَنْقَلِبُونَ بِهِ. قَالُوا: بَلَى يَا رَسُولَ اللَّهِ قَدْ رَضِينَا.

”میں نے کچھ ایسے لوگوں کو عطا کیا ہے جن کا زمانہ کفر کے قریب ہے، کیا تم اس بات پر خوش نہیں ہو کہ لوگ مال لے جائیں اور تم اپنے گھروں میں رسول اللہ ﷺ کو لے جاؤ؟ اللہ کی قسم! جو چیز تم لے کر جاؤ گے وہ اُس سے بہتر ہے جس کو وہ لے کر جائیں گے۔ انہوں نے عرض کیا: کیوں نہیں یا رسول اللہ! ہم یقیناً راضی ہیں۔“

(صحیح بخاری ص ۴۲۶؛ حدیث ۳۱۴۷؛ مسلم ص ۴۲۶؛ حدیث ۲۴۳۶)

یہ حدیث متعدد الفاظ کے ساتھ آئی ہے۔ بعض مقامات پر الفاظ ہیں:

أَلَا تَرْضَوْنَ أَنْ يَذْهَبَ النَّاسُ بِالدُّنْيَا وَتَذْهَبُونَ بِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ -
تَحْوزُونَهُ إِلَى بُيُوتِكُمْ.

”کیا تم اس بات پر خوش نہیں ہو کہ لوگ دنیا لے جائیں اور تم رسول اللہ ﷺ

کو اپنے گھروں کی طرف لے جاؤ، آپ کو ہمیشہ کے لیے اپنالو؟“۔

(بخاری ص ۵۸۹ حدیث ۴۳۳۷، مسلم ص ۴۲۷ حدیث ۲۴۴۱)

”حَاذِرٌ يَحُوزُ حَوْزًا“ کا معنی ہے اکٹھا کرنا جمع کرنا۔ اس سے یہ تلمیذ مقصود ہے کہ لوگ جس دنیا کو لے کر جا رہے ہیں اُسے کوئی بقا نہیں اور تم جس چیز کو اپنا رہے ہو وہ ہمیشہ رہے گی۔

اسی حقیقت کو بایں الفاظ بھی بیان فرمایا گیا ہے:

يَا مَعْشَرَ الْأَنْصَارِ فِي لُعَاغَةٍ مِنَ الدُّنْيَا تَأَلَّفَتْ بِهَا قَوْمًا لَيْسَ لَكُمْ
وَوَكَّلْتُكُمْ إِلَىٰ إِسْلَامِكُمْ ، أَفَلَا تَرْضَوْنَ يَا مَعْشَرَ الْأَنْصَارِ أَنْ يَذْهَبَ
النَّاسُ بِالشَّاةِ وَالْبَعِيرِ وَتَرْجِعُونَ بِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ فِي رَحَالِكُمْ.

”اے جماعت انصار! دنیا کی لعل چیز سے میں نے قوم کے دل بھانے کی کوشش کی ہے اور تمہیں تمہارے اسلام کے سپرد کر دیا ہے، اے جماعت انصار! کیا تم اس بات راضی نہیں ہو کہ لوگ بکریاں اور اونٹ لے جائیں اور تم رسول اللہ ﷺ کو (سینوں میں) ساتھ لے کر اپنے گھروں کو لوٹو؟“۔

(مسند احمد [بتحقیق احمد شاہ] ج ۱۰ ص ۲۴۰، ۲۴۱ حدیث ۱۱۶۷۰)

”لُعَاغَةٌ“ کا معنی ہے وہ معمولی سا گنے والا سبزہ جو آگ کر فوراً ختم ہو جاتا ہے، اسی سے ایک عربی

مقولہ ہے:

”إِنَّمَا الدُّنْيَا لُعَاغَةٌ، یعنی دنیا ابتدائی روئیدگی کے مانند ہے جس کے لیے بقا نہیں۔“

(مصباح اللغات ص ۷۷۹)

حدیث پاک کے مذکور الصدر متعدد الفاظ میں غور فرمائیے کہ آقا ﷺ نے کس قدر واضح الفاظ میں فرما دیا ہے کہ کچھ لوگ مال دنیا، بکریاں اور اونٹ لے گئے اور کچھ اللہ ﷻ کے رسول ﷺ کو لے گئے، کچھ لوگوں کو مال دنیا کے سپرد کر دیا اور کچھ لوگوں کو ان کے اسلام کے سپرد کر دیا۔ جن لوگوں کو دنیا کے سپرد کیا گیا انہوں نے بعد میں فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا تو اُس میں بھی ان کا سطح نظر مال و زر ہی تھا۔ عرب جنگ جو

اور بہادر تو وہ پہلے سے ہی تھے لیکن اب انہوں نے اُس بہادری کا نرغ فتوحات اسلام کی طرف موڑ دیا تھا۔ یعنی شجاعت و طاقت کا مصرف بدل گیا تھا۔ شاید فاضل دیوبند مولانا سعید احمد اکبر آبادی بایں اغاظ یہی حقیقت سمجھانا چاہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”آپ (معاویہ) کو خلفاء اربعہ کی طرح آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں رہنے اور براہ راست آفتاب نبوت و رسالت سے کسب فیض کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش کے ایک معزز اور نامور خاندان سے تعلق رکھنے کے باعث آپ میں جو عمدہ صفات تھیں، مثلاً سیاسی تدبیر، استقامت و استقلال اور شہامت و شجاعت اسلام قبول کرنے کے بعد اُن پر اور جلا ہو گئی اور اُن تو توں کا مصرف بدل گیا۔“

(مسلمانوں کا عروج و زوال: ص ۴۵)

خلاصہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے نصیب میں رسول اللہ ﷺ آئے وہ آخر دم تک اسلام پر مر مٹتے رہے اور جن لوگوں کے نصیب میں دنیا آئی وہ دنیا پر مر مٹتے رہے اور اسلام اور اہل بیت کرام علیہم السلام کو مٹانے کی کوشش کرتے رہے۔ گویا اُن کے بارے میں صادر شدہ الفاظ نبوی ﷺ اُن کا مقدر بن گئے اور وہ ایک لمحہ کے لیے بھی دنیا سے پیچھا نہ چھڑا سکے، حتیٰ کہ انہیں یہ سعادت بھی حاصل نہ ہو سکی کہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی سنت پر عمل کرتے ہوئے بوقت وفات تو دنیا سے جان چھڑا لیتے۔ نہیں بلکہ وہ آخر تک دنیوی اقتدار سے نجات نہ پاسکے اور اُسے اپنی اولاد کو منتقل کر گئے۔ اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ انصار رضی اللہ عنہم اور مطلقاً کے بارے میں زبان نبوی ﷺ سے صادر شدہ الفاظ کس حد تک پورے ثابت ہوئے؟

حُبِ اقتدار پھر اجتہاد؟

یہاں ضمناً ایک نکتہ ذہن میں آ گیا ہے جسے پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں:

جب علمی، نقلی، اور مشاہداتی حقیقت یہ ہے کہ وہ سب کچھ حصولِ دنیا کے لیے کرتے رہے تو پھر دنیا کی خاطر ازلِ انعام یافتہ ہستیوں کے خلاف اٹھنے والے قدم کو اجتہاد قرار دینا کہاں کی دانش مندی ہے؟ اگر اُن کی ساری تنگ و دود دنیا کی خاطر نہیں تھی تو پھر علیٰ حسن کے خلاف اٹھنے والے قدم کو دینی تو حب کہا جاسکتا ہے

جب کوئی شخص اُن سے زیادہ دین کا عالم اور دین پر عامل ہو۔ جن ہستیوں سے ہر طرح کے رجس کو دور رکھا گیا، جنہیں شیطان سے یکسر محفوظ فرمایا گیا اور جن سے تمسک کو قرآن مجید سے تمسک کے ساتھ بیان فرمایا گیا اور اُس تمسک میں ہدایت کی حتمی ضمانت دی گئی، انصاف سے بتلائیے! اگر کوئی طلیق، موکفۃ القلوب اور طالبِ دنیا اُن کے خلاف قدم اٹھائے تو وہ کتاب و سنت سے انحراف ہوگا یا اجتہاد؟ شاید کسی کو میری یہ بات ناجائز جرات اور گستاخی محسوس ہو رہی ہو تو میں اُس کے سامنے ایک آدھ عبارت پیش کر دیتا ہوں۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے معاویہ کی پوری تک و دو کو دنیوی کہا ہے اور انہیں باغی، طاغی، مخرف، ظاہراً کچھ اور، باطناً کچھ اور، قبیح مؤول اور کتاب و سنت کا تارک کہا ہے۔ راقم الحروف نے اپنی کتاب ”الفتنۃ الباغیۃ“ کے لیے ملا علی کی وہ مکمل عبارت مع ترجمہ و اعراب ایک مقام پر تیار رکھی ہوئی ہے، اُسی مقام سے یہاں بھی نقل کیے دیتا ہوں۔ یاد رکھئے کہ ملا علی قاری نے اپنی مختلف کتب میں اس حدیث پر کلام کیا ہے لیکن انہوں نے مرقاۃ میں جو کلام کیا ہے وہ جامع بھی ہے اور مانع بھی۔ وہ لکھتے ہیں:

(تَقْتُلُكَ الْفِتْنَةُ الْبَاغِيَّةُ) أَيِ الْجَمَاعَةِ الْخَارِجَةِ عَلَى إِمَامِ الْوَقْتِ وَخَلِيفَةِ الزَّمَانِ، قَالَ الطَّبِيبِيُّ: تَرَحَّمْ عَلَيْهِ بِسَبَبِ الشِّدَّةِ الَّتِي يَقَعُ فِيهَا عَمَّارٌ مِنْ قَبْلِ الْفِتْنَةِ الْبَاغِيَّةِ يُرِيدُ بِهِ مُعَاوِيَةَ وَقَوْمُهُ لِأَنَّهُ قُتِلَ يَوْمَ صِفِّينَ، وَقَالَ ابْنُ الْمَلِكِ: اَعْلَمْ أَنَّ عَمَّارًا قَتَلَهُ مُعَاوِيَةُ وَفِتْنَتُهُ فَكَانُوا طَاغِيَيْنَ بَاغِيَيْنَ بِهَذَا الْحَدِيثِ، لِأَنَّ عَمَّارًا كَانَ فِي عَسْكَرِ عَلِيٍّ وَهُوَ الْمُسْتَحِقُّ لِلْإِمَامَةِ فَأَمْتَنَعُوا عَنْ بَيْعَتِهِ. وَحُكِيَ أَنَّ مُعَاوِيَةَ يُرْوَلُ مَعْنَى الْحَدِيثِ وَيَقُولُ: ”لَحْنُ فِتْنَةٍ بَاغِيَّةٍ طَالِبَةٌ لِدَمِ عُمَانَ“ وَهَذَا كَمَا تَرَى تَحْرِيفٌ، إِذْ مَعْنَى طَلَبِ الدَّمِ غَيْرُ مُنَاسِبٍ هُنَا، لِأَنَّهُ ﷺ ذَكَرَ الْحَدِيثَ فِي إِظْهَارِ فَضِيلَةِ عَمَّارٍ وَدَمِ قَاتِلِهِ، لِأَنَّهُ جَاءَ فِي طَرِيقِي رِيحَ. قُلْتُ: ”وَيْحَ“ كَلِمَةٌ تُقَالُ لِمَنْ وَقَعَ فِي هَلَكَةٍ لَا يَسْتَحِقُّهَا فَيَتَرَحَّمُ عَلَيْهِ وَيُرْتَلَى لَهُ بِخِلَافِ ”وَيْلَ“ لِأَنَّهَا كَلِمَةٌ عَقُوبِيَّةٌ تُقَالُ لِلَّذِي يَسْتَحِقُّهَا وَلَا يَتَرَحَّمُ عَلَيْهِ، هَذَا وَفِي الْجَامِعِ الصَّغِيرِ بِرَوَايَةِ الْإِمَامِ

أَحْمَدَ وَالْبُخَارِيَّ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ مَرْفُوعًا "رِيحَ عَمَارٍ تَقْتُلُهُ الْفِتْنَةُ الْبَاغِيَّةُ
يَدْعُوهُمْ إِلَى السَّجَنَةِ وَيَدْعُوهُ إِلَى النَّارِ" وَهَذَا كَالنَّصِّ الصَّرِيحِ فِي مَعْنَى
الصَّحِيحِ الْمُتَبَادِرِ مِنَ الْبَغْيِ الْمُطْلَقِ فِي الْكِتَابِ، كَمَا فِي قَوْلِهِ تَعَالَى:
﴿وَيَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ﴾ [النحل: ٩٠] وَقَوْلُهُ سُبْحَانَهُ ﴿فَإِنْ
بُغْتِ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى﴾ [الحجرات: ٩] لِإِطْلَاقِ اللَّفْظِ الشَّرْعِيِّ عَلَى
إِذَاقَةِ الْمَعْنَى اللَّغَوِيَّةِ عَدُوْلَ عَنِ الْعَدْلِ وَمَيْلَ إِلَى الظُّلْمِ الَّذِي هُوَ وَضْعُ
الشَّيْءِ فِي غَيْرِ مَوْضِعِهِ. وَالْحَاصِلُ أَنَّ الْبَغْيَ بِحَسَبِ الْمَعْنَى الشَّرْعِيِّ
وَلِإِطْلَاقِ الْعُرْفِيِّ خُصَّ مِنْ عَمُومِ مَعْنَى الطَّلِبِ اللَّغَوِيِّ إِلَى طَلَبِ الشَّرِّ
الْخَاصِّ بِالْخُرُوجِ الْمُنْهَوِيِّ، فَلَا يَصِحُّ أَنْ يُرَادَ بِهِ طَلَبُ دَمِ خَلِيفَةِ الزَّمَانِ
وَهُوَ عُثْمَانُ ؓ.

وَقَدْ حُكِيَ عَنْ مُعَاوِيَةَ تَأْوِيلُ أَقْبَحِ مِنْ هَذَا حَيْثُ قَالَ: إِنَّمَا قَتَلَهُ عَلِيٌّ
وَفِئْتُهُ حَيْثُ حَمَلَهُ عَلَى الْقِتَالِ وَصَارَ سَبِيًّا لِقَتْلِهِ فِي الْمَالِ، فَقِيلَ لَهُ فِي
الْجَوَابِ: فَإِذَا ذُنُ قَاتِلُ حَمْزَةٍ هُوَ النَّبِيُّ ﷺ حَيْثُ كَانَ بَاعِثًا لَهُ عَلَى ذَلِكَ
وَاللَّهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى حَيْثُ أَمَرَ الْمُؤْمِنِينَ بِقِتَالِ الْمُشْرِكِينَ. وَالْحَاصِلُ أَنَّ
هَذَا الْحَدِيثَ فِيهِ مُعْجَزَاتُ ثَلَاثَ، إِحْدَاهَا أَنَّهُ سَيُقْتَلُ، وَثَانِيهَا أَنَّهُ مَظْلُومٌ،
وَتَالِثُهَا أَنَّ قَاتِلَهُ بَاغٍ مِنَ الْبَغَاةِ وَالْكُلُّ صِدْقٌ وَحَقٌّ. ثُمَّ رَأَيْتُ الشَّيْخَ أَكْمَلَ
الِدَيْنِ قَالَ: الظَّاهِرُ أَنَّ هَذَا أَيُّ التَّأْوِيلِ السَّابِقِ عَنْ مُعَاوِيَةَ. وَمَا حُكِيَ عَنْهُ
أَيْضًا مِنْ أَنَّهُ قَتَلَهُ مَنْ أَخْرَجَهُ لِلْقَتْلِ وَحَرَضَهُ عَلَيْهِ كُلُّ مِنْهُمَا إِفْتِرَاءٌ عَلَيْهِ، أَمَّا
الْأَوَّلُ فَتَحْوِيفٌ لِلْحَدِيثِ، وَأَمَّا الثَّانِي فَلِأَنَّهُ مَا أَخْرَجَهُ أَحَدٌ بَلْ هُوَ خَرَجَ
بِنَفْسِهِ وَمَالِهِ مُجَاهِدًا فِي سَبِيلِ اللَّهِ قَاصِدًا لِإِقَامَةِ الْقُرْصِ، وَإِنَّمَا كَانَ كُلُّ
مِنْهُمَا إِفْتِرَاءٌ عَلَى مُعَاوِيَةَ، لِأَنَّهُ ﷺ أَعْقَلَ مِنْ أَنْ يَقَعَ فِي شَيْءٍ ظَاهِرِ الْفَسَادِ

عَلَى الْخَاصِّ وَالْعَامِّ . قُلْتُ : فَإِذَا كَانَ الْوَاجِبُ عَلَيْهِ أَنْ يُرْجَعَ عَنْ بَغْيِهِ بِإِطَاعَتِهِ الْخَلِيفَةَ وَيَتْرُكَ الْمُخَالَفَةَ رَطَلَبُ الْإِخْلَافَةِ الْمُنِيفَةِ ، فَتَبَيَّنَ بِهَذَا أَنَّهُ كَانَ فِي الْبَاطِنِ بَاغِيًا ، وَفِي الظَّاهِرِ مُتَسَتِّرًا بِذِمِّ عُثْمَانَ مُرَاعِيًا مُرَائِيًا ، فَجَاءَ هَذَا الْحَدِيثُ عَلَيْهِ نَاعِيًا ، وَعَنْ عَمَلِهِ نَاهِيًا ، لَكِنْ تَكَانَ ذَلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا ، فَصَارَ عِنْدَهُ كُلُّ مَنْ فِي الْقُرْآنِ وَالْحَدِيثِ مَهْجُورًا . فَرَحِمَ اللَّهُ مَنْ أَنْصَفَ وَلَمْ يَتَعَصَّبْ وَلَمْ يَتَعَسَّفْ ، وَتَوَلَّى الْإِقْبِصَادَ فِي الْإِعْقَادِ ، لِئَلَّا يَقَعَ فِي جَانِبِي سَبِيلِ الرَّشَادِ مِنَ الرِّفْضِ وَالنَّصَبِ بِأَنْ يُحِبَّ جَمِيعَ الْأَلِّ وَالصَّحْبِ .

”تَقَعُ لَكَ الْفِتْنَةُ الْبَاغِيَّةُ“ (تجھے باغی گروہ قتل کرے گا) اس سے وہ خارجی جماعت مراد ہے جس نے امام وقت اور خلیفہ زمان کے خلاف خروج کیا تھا۔ امام طہی فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کے حق میں کلمہ رحم اس لیے ارشاد فرمایا کہ وہ باغی گروہ کی جانب سے سختی میں مبتلا ہونے والے تھے، اس سے آپ ﷺ نے معاویہ اور اُن کی جماعت مراد لی ہے، کیونکہ وہ صفین کی جنگ میں قتل کیے گئے تھے۔ محدث ابن الملک فرماتے ہیں: جان لیجئے کہ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو معاویہ اور اُن کے گروہ نے قتل کیا تھا، لہذا اس حدیث کی رو سے وہ باغی اور طاغی قرار پائے، کیونکہ عمار رضی اللہ عنہ لشکر مرتضوی میں تھے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے حق دار تھے جبکہ اُن لوگوں نے اُن کی بیعت سے روگردانی کی تھی۔

منقول ہے کہ معاویہ نے اس حدیث کے معنی میں تاویل کی تھی اور کہا تھا: ”ہم فتنہ باغیہ قصاص عثمان کے طالبین کے معنی میں ہیں“ اور یہ جیسا کہ تم جانتے ہو تحریف ہے، کیونکہ اس مقام پر ”بَغْيِي“ بمعنی ”طلب کرنا“ کوئی مناسبت نہیں رکھتا، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ حدیث سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور اُن کے قاتل کی مذمت میں ذکر فرمائی

ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ حدیث لفظ ”ویسح“ سے آئی ہے۔ میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں: لفظ ”ویسح“ اُس شخص کے بارے میں استعمال کیا جاتا ہے جو کسی مصیبت کا شکار ہونے والا ہو لیکن بے گناہ ہو تو اس پر رحم کھاتے اور افسوس کرتے ہوئے یہ لفظ بولا جاتا ہے، بخلاف لفظ ”ویل“ کے، کہ وہ اظہارِ سختی کے لیے اُس شخص کے بارے میں بولا جاتا ہے جو سختی کا سزاوار ہو اور قابلِ رحم نہ ہو۔ اس لغوی تائید کے علاوہ اس سلسلے میں ”الجامع الصغیر“ میں بروایت امام احمد و بخاری سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً ایک حدیث میں آیا ہے: ”عمار پر رحمت ہو اُسے ایک باغی گروہ قتل کرے گا، یہ انہیں جنت کی طرف بلائے گا اور وہ اُسے جہنم کی طرف بلائیں گے“۔ اور یہ حدیث معنی کی صحت میں نصِ صریح کی مانند ہے، ایسا صریح معنی جو بغاوتِ مطلق کے لیے بلا تکلف ذہنوں میں آتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وہ بے حیائی، برائی اور بغاوت سے منع کرتا ہے﴾ اور ارشاد الہی: ﴿پس اگر اُن میں سے ایک گروہ دوسرے پر بغاوت کرے﴾ پس لفظِ شرعی کا اطلاق اپنے مطلب کے معنی کی طرف پھیرنا عدل سے روگردانی اور ظلم کی طرف میلان ہے۔ ظلم یہ ہے کہ کسی چیز کو اُس کے مقام پر نہ رکھنا۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ لفظ بغی اپنے شرعی معنی اور عرفی اطلاق کے لحاظ سے اُس لغوی معنی سے عام ہے جو طلب کے معنی میں خصوصاً اُس شر کے حصول کے لیے کیا گیا جو ممنوع ہے۔ لہذا اس کو خلیفہ زمان سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے مطالبہ کا معنی پہنانا درست نہیں۔

معاویہ سے اس سے زیادہ قبیح تاویل بھی منقول ہے، وہ یہ کہ انہوں نے کہا: عمار کو علی اور اُن کے گروہ نے قتل کیا، اس لحاظ سے کہ انہوں نے اُسے جنگ پر ابھارا تو انجامِ کار وہ جنگ اُن کے قتل کا سبب ثابت ہوئی۔ انہیں جواباً کہا گیا: تب تو سیدنا حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہما کے قاتل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرار پاتے ہیں کیونکہ آپ ہی نے انہیں اس جنگ پر آمادہ کیا تھا اور اللہ تعالیٰ بھی قاتل قرار پاتا ہے، کیونکہ اُسی نے مؤمنین کو مشرکین کے ساتھ

جنگ کرنے کا حکم فرمایا ہے۔

فی الجملہ یہ کہ اس حدیث میں تین معجزات ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ عمار عنقریب قتل کیے جائیں گے

۲۔ دوسرا یہ کہ وہ مظلوم ہوں گے

۳۔ تیسرا یہ کہ اُن کا قاتل باغیوں میں سے ایک باغی ہوگا۔

اور یہ تمام باتیں سچ اور حق ثابت ہوئیں۔

پھر میں نے شیخ اکمل الدین کے کلام کو دیکھا، اُنہوں نے کہا: ظاہر یہ ہے کہ معاویہ کی طرف سے یہ تاویل اور اُن کی طرف سے جو نقل کیا گیا وہ یہ ہے کہ اُنہوں نے کہا کہ عمار کا قاتل وہ شخص ہے جو انہیں میدان میں لایا اور جنگ پر ابھارا، یہ دونوں باتیں اُن پر بہتان ہیں۔ پہلی بات تحریف حدیث کے معنی میں آتی ہے، اور دوسری بات اس لیے غلط ہے کہ عمار ؓ کو کسی شخص نے نہیں نکالا تھا بلکہ وہ از خود اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ اور اقامتِ فرض کے جذبہ سے نکلے تھے۔ یہ دونوں باتیں معاویہ پر بہتان محض ہیں، اس لیے کہ وہ ؓ ایسی تاویل میں پڑنے سے زیادہ عقل مند تھے جو ہر خاص و عام پر ظاہر الفساد ہو۔ میں (علی قاری) کہتا ہوں: تب تو اُن پر واجب تھا کہ وہ بغاوت کو چھوڑ کر خلیفہ برحق کی اطاعت کی طرف رجوع کرتے، مخالفت ترک کر دیتے اور خلافتِ عظمیٰ کی طلب سے باز آ جاتے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ وہ باطن میں باغی تھے اور ظاہراً قصاصِ عثمان ؓ کی آڑ لے کر دکھاوا کرنے والے تھے۔ پس یہ حدیث ان پر طعن کرنے والی ہے اور ان کی اتباع سے روکنے والی ہے، لیکن وہی ہو کر رہا جو تقدیر میں لکھا تھا تو ان کے نزدیک جو کچھ قرآن و حدیث میں موقوف تھا سب متروک ہو گیا۔ پس اللہ تعالیٰ کی اُس شخص پر رحمت ہو جس نے انصاف کیا اور تعصب و بے راہ روی سے کنارہ کیا اور اعتقاد میں اعتدال کو محبوب رکھا تاکہ وہ رُشد کے راستے سے ہٹ کر رافضیت و ناصبیت میں مبتلا نہ ہو اور جمیع آل و اصحاب سے

محبت کرے۔

(مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح ج ۱۰ ص ۲۰۰، ۲۰۱، وط: ج ۱۱ ص ۱۸۰، ۱۷۱)
 اس تشریح کو صحیحین کی مذکورہ بالا متعدد احادیث سے ملا کر دیکھا جائے تو یہ حقیقت روز روشن سے بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ موصوف کی تمام تر کوشش فقط دنیا کے لیے تھی۔ اگر دین کے لیے ہوتی تو پھر انہیں باغی، طاغی، مجرّف اور تارکِ قرآن و سنت کہنا گمراہی اور گناہ ہوتا۔ سو جب وہ باغی، طاغی اور تارکِ کتاب و سنت فقط دنیا کی وجہ سے قرار پائے تو اس سے یہ بات متحق ہو گئی کہ غزوہ حنین کے مال کی تقسیم کے وقت آقا ﷺ کی زبان اقدس سے صادر شدہ الفاظ ”کہ یہ دنیا لے جائیں“ کمان سے ٹکلا ہوا تیر ثابت ہوئے۔

زاویہ نگاہ اپنا اپنا

بنظر انصاف دیکھا جائے اور صحابیت کے ٹائٹل کو عصمت نہ سمجھا جائے تو اہل ایمان پر یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ اسلام کے زوال کا آغاز ملوکیتِ اولین کے آغاز سے ہی ہو چکا تھا، تاہم زاویہ نگاہ اپنا اپنا ہوتا ہے، بعض اہل تحقیق اہل بیت کرام علیہم السلام کے ساتھ اسلام کے اولین بادشاہ کی ٹکڑ کو، ہاشم اور بنو امیہ کی سابقہ کشمکش کے تناظر میں دیکھتے ہیں، بعض اس کو خلافت و ملوکیت یعنی دین و دنیا کی کشمکش سمجھتے ہیں۔ یہاں سے آگے پھر زاویہ نگاہ بدل جاتا ہے، کچھ لوگوں کی نگاہ اہل بیت کرام علیہم السلام کے مقابل آنے والی شخصیت کی صحابیت پر جا کر مرکوز ہو جاتی ہے تو وہ اُن کے تمام اقدامات کے دفاع اور اُن کی تاویلات میں کھو جاتے ہیں اور اس سلسلے میں اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ اُن کے دنیوی اقدامات کو انبیاء کرام علیہم السلام کی سنت کے مطابق باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں اور انہیں علم و سیاست میں سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے بھی بڑھا کر پیش کرتے ہیں، جبکہ ان کے برعکس کچھ لوگوں کی نگاہیں شخصیات پر نہیں ٹھہرتیں بلکہ اُن کی سوچ کا مرکز و محور اسلام ہوتا ہے، اس لیے وہ منہاج نبوت کے مطابق خلافت کی بات کرتے ہیں، خلافت و ملوکیت کے فرق کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں اور اسلام کے عروج و زوال کے اسباب کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ لوگ صحابیت کی آڑ میں ملوکیت کے تمام اقداماتِ باطلہ کا دفاع نہیں کرتے، ملوکیت کی سیاست کو نہ تو سنتِ انبیاء بتانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں اور نہ ہی اسلام کے اولین بادشاہ کے علم و سیاست

کو شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کے علم و سیاست سے بہتر سمجھتے ہیں بلکہ یہ لوگ زوالِ اسلام کے اسباب میں اولین سبب اسلام کے اولین بادشاہ کو قرار دیتے ہیں۔

راقم الحروف نے آئندہ سطور میں مختلف مکاتبِ فکر کی کتب سے دونوں زاویہٴ نگاہ پیش کیے ہیں تاکہ اعتدال پسند عقلیں اصل حقیقت تک پہنچ سکیں۔ کوئی کسی کی سوچ و فکر پر تو پہرہ نہیں دے سکتا لیکن یہ عاجز اتنی التجا کرتا ہے کہ ایسی کسی بھی تحریر کو تفضیلی، غیر تفضیلی، سنی اور شیعہ کی عینک لگا کر نہیں بلکہ مکاتبِ فکر کی قیود سے بالاتر ہو کر فقط اسلامی نگاہ سے پڑھیے گا۔

اعتناء

دین اسلام کی محبت میں راقم الحروف نے اپنی فکر کے مطابق جس بات کو حق سمجھا اُسے حق کہنے اور جس کو باطل یا غلط سمجھا تو اُسے باطل یا غلط کہنے میں کوئی تاثر نہیں کیا۔ اس سلسلے میں متعدد مقامات پر قابلِ تعظیم اور نامور علماء اسلام سے بھی اختلاف کرنا پڑا ہے تو دائرۂ ادب میں رہتے ہوئے اختلاف کیا گیا ہے، اس لیے کہ کسی بھی غیر معصوم شخصیت سے اختلاف کرنا بے ادبی میں شمار نہیں ہوتا اور یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ شخصیات پر حق بہر حال مقدم ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں اہل تحقیق اور حق پسند مسلمان تصریحات کتاب و سنت اور دلائل و براہین کی روشنی میں حق کو شخصیات پر ترجیح دیتے آئے ہیں۔ سو کتابِ خدا کے قارئین کرام سے امید ہے کہ وہ بھی دلائل کی روشنی میں حق کو ہی ترجیح دیں گے اور انہیں کتابِ خدا میں جو بات حقائق کے منافی اور باطل نظر آئے گی تو وہ ضرور مکمل سیاق و سباق کے ساتھ نقل کر کے دلائل و براہین کے ساتھ مصنف پر اُس کا بطلان واضح فرمائیں گے۔ بخدا اگر مکمل دیانت، امانت اور متانت کے ساتھ مصنف پر اُس کے موقف کا بطلان واضح کر دیا گیا تو وہ ضرور باطل کو چھوڑ کر حق کی طرف رجوع کر لے گا۔

ضروری وضاحت

اہل علم اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ کوئی مصنف اپنے سابقہ نظریہ کے برعکس کچھ لکھ جائے تو وہ اُس کا سابقہ نظریہ سے رجوع سمجھا جاتا ہے تاہم راقم الحروف مزید عرض کناں ہے کہ میری کتب میں کسی اہم مسئلہ

کے بارے میں میرا موقف بعد میں ترمیم شدہ طے یا سابق موقف کے بالکل برعکس طے تو اس کو میرا تضاد نہ سمجھا جائے بلکہ سابق تحریر سے میرا رجوع سمجھا جائے۔ میری بعض کتب متعدد بار شائع ہو چکی ہیں لیکن بعض لوگ طبع اول ہی کے حوالے دیے جا رہے ہیں، حالانکہ میں حسب موقع بعد والے ایڈیشن میں اغلاط درست کرتا، ترمیم کرتا اور سابق موقف میں سختی یا نرمی کرتا رہتا ہوں، لہذا میری زندگی میں میری کسی بھی کتاب کے آخری ایڈیشن کے مندرجات کو ہی میرا موقف سمجھ جائے، کیونکہ آئے روز مطالعہ میں وسعت اور مزید تحقیق کی وجہ سے بعض مسائل میں میرا سابق موقف جوں کا توں باقی نہیں رہتا۔ بعض اسلاف کرام کا ارشاد ہے کہ آج کے فیصلہ کے بارے میں کل تم پر عیاں ہو جائے کہ وہ غلط تھا تو تم اس سے رجوع کرنے میں تاخیر نہ کیا کرو، کیونکہ باطل پر ڈٹے رہنے سے حق کی طرف رجوع کر لینا بہتر ہے۔

اللَّهُمَّ ارِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنَا اِيَّابَاعَهُ

وَارِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَارْزُقْنَا اجْتِنَابَهُ.



تذکرہ صلح از کتب حدیث و تاریخ

سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی معاویہ کے ساتھ صلح کا تذکرہ کتب حدیث و تاریخ دونوں میں آیا ہے۔ کتب حدیث میں اختصار اور کتب تاریخ میں تفصیل آئی ہے۔ پھر تاریخ کی بعض کتب میں اختصار ہے اور بعض میں تفصیل۔ ہم نے مختلف کتب سے تلخیص پیش کی ہے اور شرائط وغیرہ کا تذکرہ کر کے اس امر کو سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ یہ صلح کیوں کی گئی، کن شرائط پر کی گئی اور کیا وہ شرائط پوری کی گئیں یا نہیں؟ پھر اس مسئلہ میں جو ادھام پیدا کیے جاتے ہیں، جو باطل استدالات کیے جاتے ہیں، جو تاویلاتِ فاسدہ پیش کی جاتی ہیں اُن سب کا جو نزہ لیا ہے اور مغالطہ آفرینیوں کا قلع قمع کیا ہے۔

صلح امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام از حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

امام بخاری رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا: اللہ تعالیٰ کی قسم! جب سیدنا امام حسن بن علی رضی اللہ عنہ معاویہ کے مقابلہ میں پہاڑوں کی مثل لشکر کے ساتھ آئے تو عمرو بن العاص نے کہا: میں ایسا لشکر دیکھ رہا ہوں جو مخالفین کو مارے بغیر نہیں لوٹے گا۔ اس پر معاویہ نے کہا: (اور اللہ کی قسم! وہ دو شخصوں میں بہتر تھے) اے عمرو! اگر ان لوگوں نے انہیں اور انہوں نے ان کو قتل کر دیا تو پھر لوگوں کے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے کون ہوگا؟ اُن کی عورتوں کی حفاظت کے لیے کون ہوگا؟ اور اُن کی جائیداد کے لیے کون ہوگا؟ پھر انہوں نے قریش کے دو شخص ص جو بنی عبد شمس کی اولاد میں سے تھے، عبد الرحمن بن سمرہ اور عبد اللہ بن عامر بن کریم کو امام حسن رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا اور کہا: ان کے پاس جاؤ اور انہیں صلح کی پیش کش کرو، وہ اپنی بات چیت میں جو مطالبہ کریں قبول کر لو۔ وہ دونوں ان کے پاس گئے، گفتگو کی اور صلح کی درخواست کی۔

امام حسن بن علی علیہ السلام نے انہیں فرمایا: ہم عبدالمطلب کی اولاد ہیں اور ہم کو اس مال سے حصہ ملنا ہے اور اُمت میں بہت خون ریزی ہوئی ہے۔ ان دونوں نے کہا: معاویہ نے آپ کو یہ اور یہ پیش کش کی ہے، وہ آپ سے صلح کی درخواست کرتا ہے اور آپ جو مطالبہ فرمائیں وہ قبول کرنے کو تیار ہے۔ امام حسن علیہ السلام نے فرمایا: اس بات کی ضمانت کون دے گا؟ انہوں نے کہا: ہم ذمہ دار ہیں۔ پھر امام حسن علیہ السلام نے جو شرط رکھی انہوں نے کہا: ہم ذمہ دار ہیں، تو اس پر امام پاک نے معاویہ سے صلح کر لی۔

حسن بھری علیہ السلام کہتے ہیں: میں نے حضرت ابوبکرہ کو بیان کرتے ہوئے سنا ہے، انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر دیکھا جبکہ سیدنا حسن بن علی علیہ السلام آپ کے پہلو میں تھے، آپ کبھی لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے اور کبھی اُن کی طرف، اور آپ فرما رہے تھے: میرا یہ بیٹا سید ہے اور اُمید ہے اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں کے درمیان صلح کرادے گا۔

(بخاری: کتاب الصلح، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم هذا سید لعل اللہ ان یصلح بہ بین فتنین عظیمین ص ۳۶۱ حدیث ۲۷۰۴؛ المستدرک للحاکم ج ۳ ص ۱۹۱ حدیث ۴۸۰۸)

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی خصوصیت

اس حدیث میں امام حسن علیہ السلام کی عظیم فضیلت ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت کے تنازع میں فقط انہیں کی اصلاح کی تعریف فرمائی ہے، اور یہ مسلمانوں کے اتحاد کی عظیم اصل اور صلح پر ابھارنے کی دلیل ہے۔ اس کے برخلاف جو شخص مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرے، اُن میں تفریق پیدا کرے اور اچھے حکمرانوں کے خلاف خروج کرے تو ایسے شخص کو کہیں بھی قابل ستائش نہیں ٹھہرایا گیا۔ چنانچہ محدث ابو حفص ابن شامین کہتے ہیں:

”اس فضیلت میں امام حسن علیہ السلام تہا ہیں، اس میں اُن کا اور کوئی شریک نہیں، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام علیہم السلام میں سے بجز امام حسن علیہ السلام کے کسی کی مطلق

سیادت کا ذکر نہیں فرمایا۔“

(شرح مذاہب اہل السنۃ لابن شاہین ص ۲۶۳)

جہاں تک مقید سیادت کا تعلق ہے تو وہ متعدد احادیث میں آئی ہے، جیسا کہ صحیحین میں سیدنا سعد

بن معاذ رضی اللہ عنہ کے لیے آیا:

قُومُوا إِلَيَّ سَيِّدُكُمْ.

”اپنے سردار (کی تعظیم) کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔“

(بخاری: کتاب الجہاد والسير، باب إذا نزل العدو على حكم رجل، حدیث ۴۳۰۴۳)

مسلم: کتاب الجہاد والسير، باب جواز قتال من نقض العهد، حدیث ۱۷۶۸)

شیخ عبداللہ بن صالح اس حدیث سے حاصل ہونے والے فوائد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اس حدیث میں دلیل ہے کہ جب حق سے متعلق قربانی عظیم ہو تو اس کی جزا

بھی عظیم ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب امام حسن رضی اللہ عنہ دنیا میں اپنے حق سے دست بردار

ہوئے تو ان رضی اللہ عنہ نے انہیں دنیا میں سیادت عطا کی اور وہ آخرت میں جنتی جوانوں کے

مردار ہوں گے اور جزا عمل کے مطابق ہوتی ہے۔“

(کتاب الأربعین فی فضائل آل البيت الطاہرین ص ۶۲)

دست برداری امام میں صوفیانہ نکتہ

صلحاء و صوفیہ کرام رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کی اس قربانی کی بدولت اللہ

ﷻ نے اہل بیت کرام علیہم السلام اور قیامت تک ان کی اولاد کے اندر خلافت باطنیہ رکھ دی ہے، اور اب

قیامت تک قطب الاقطاب فقط اسی ذریت طاہرہ سے ہوتا ہے، اور اہل اسلام کو روحانی فیض فقط اہل بیت

کرام علیہم السلام سے ہی ملتا ہے، ان کے واسطہ کے بغیر روحانی فیض کے حصول کا کوئی تصور نہیں۔ اگر آپ

چاہیں تو اس موضوع کی مکمل اور باحوالہ تفصیل کے لیے راقم الحروف کی کتاب ”شرح أسنى المطالب

فی مناقب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ“ کا مطالعہ فرمائیں۔

یہاں سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جب روحانیت کی یہ سرداری دنیوی اقتدار سے دست برداری کے عوض ملی تو پھر اس روحانیت کا اُن لوگوں کے پاس ہونا بعید ہے جو اس اقتدار کے حصول کے لیے ان قدسی صفت ہستیوں کے خلاف مسلح ہو کر آئے تھے۔ یہ بات اُس بات سے مماثلت رکھتی ہے جو گذشتہ سطور میں غزوہ حنین کے مال غنیمت کے حوالہ سے نقل ہو چکی ہے کہ طلقاء کو مال دیا گیا اور انصار رضی اللہ عنہم کے حصے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ آئی، یعنی بعض طلقاء بار بار دنیا پر لپکتے رہے اور محض دنیا ہی انہیں ہاتھ آتی رہی۔ ذرا سوچئے کہ غزوہ حنین کے مال کی تقسیم کے موقع پر مولفۃ القلوب طلقاء کے بارے میں زبانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو الفاظ صادر ہوئے تھے وہ اس طرح اُن کا مقدر بن گئے کہ ہر اہم موڑ پر وہ دین پر دنیا ہی کو ترجیح دیتے رہے، لیکن تعجب ہے کہ اس حقیقت کے باوجود عصر حاضر میں بعض لوگ انہی مولفۃ القلوب طلقاء سے فیض کے سلاشی ہیں، مگر ح:

ایں خیال است و محال ست و جنوں

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی خصوصیت کا راز

اوپر آپ محدث ابنِ شاہین کا قول پڑھ چکے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: اس حدیث میں جس فضیلت کا ذکر ہے اُس میں امام حسن علیہ السلام کا کوئی شریک نہیں۔ بلاشبہ یہی حقیقت ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ حدیثِ خدا میں جس صلح کا ذکر ہے وہ فقط امام حسن علیہ السلام کی جانب سے تھی، کیونکہ معاویہ نے تو اقتدار کے طمع میں اپنے سفیروں کو کہا تھا کہ تم فلاں فلاں پیش کش کر کے امام حسن کو صلح پر آمادہ کرو۔ ظاہر ہے کہ امام حسن علیہ السلام مذکورہ پیش کشوں کے باوجود اگر صلح پر آمادہ نہ ہوتے تو موصوف ضرور جنگ کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف میں بھی اس صلح کی نسبت فقط امام حسن علیہ السلام کی طرف کی گئی اور ضمیر بھی واحد استعمال فرمائی گئی۔ نیز صلح کے وقت جانین سے موجود لوگوں کے نزدیک بھی سببِ صلح سیدنا امام حسن علیہ السلام تھے، اور مورِ طعن بھی وہی ہوئے تھے، اُن پر خود اُن کے بعض ساتھیوں نے بھی طعن کیا تھا اور انہیں باعثِ عار سمجھا تھا، جس پر امام پاک نے فرمایا تھا: العَارُ خَيْرٌ مِنَ النَّارِ (عارِ نار (آگ) سے بہتر ہے)۔

امام حسن علیہ السلام کو سید فرمانے میں لطیف حکمت

یوں تو بختن پاک علیہم السلام کا ہر فرد سید ہے، چنانچہ نبی کریم ﷺ سید الناس، سید الانام اور سید العالمین ہیں، مولا علی علیہ السلام سید العرب اور سید المسلمین ہیں، خاتونِ جنت فاطمہ الزہراء سیدۃ نساءِ اہل الجنتہ اور سیدۃ نساءِ العالمین ہیں اور حسین کریمین سیدۃ شبابِ اہل الجنتہ ہیں مگر خاص اس موقع پر امام حسن علیہ السلام کو کسی قسم کی اضافت کے بغیر مطلقاً سید فرمانے میں یہ حکمت ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ اُن کا دھیان اس صلح میں فقط امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام پر ہی رہے اور وہ سمجھ لیں کہ یہ صلح صرف اور صرف انہیں کی اعلیٰ ظرفی اور بلند ہمتی کی بدولت ہوئی۔ اس میں امام پاک کے مد نظر کسی کی اہلیت و صلاحیت نہیں تھی، وہ جس کے ساتھ صلح کا معاملہ طے فرما رہے تھے اُس کی چالوں، خدع، دُخن اور مکر و فریب سے خوب آگاہ تھے مگر اُن کی نگاہ جانہن کے لوگوں میں سے اُن خالص مسلمانوں پر تھی جن سے مستقبل میں اسلامی فوائد حاصل ہو سکتے تھے۔ اس لیے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ جو شخص اپنی اعلیٰ بصیرت کی بدولت مستقبل میں عظیم اسلامی فوائد کو مد نظر رکھتے ہوئے کسی نا اہل شخص کے ساتھ بھی محدود مدت کے لیے کوئی سمجھوتہ کر لے تو حقیقی معنی میں سید وہی ہے نہ کہ اُس کا مد مقابل۔

کیا صلح میں اہلیتِ معاویہ مد نظر تھی؟

کچھ لوگ اس صلح کو عمومی نگاہ سے دیکھتے ہیں، لیکن محققین و مدترین کے نزدیک یہ عظیم ترین قربانی اور دور رس نتائج کی حامل صلح تھی، کیونکہ اس کی بدولت جانہن سے ہزاروں مسلمانوں کی جانیں اور اسلام کا مستقبل محفوظ ہوا تھا۔ اس صلح میں امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے مد نظر کیا چیز تھی؟ آیا کسی فرد کی اہلیت تھی یا اہل اسلام کا تحفظ تھا؟ بوجہ عدم تدبیر بہت لوگ امام حسن علیہ السلام کی دست برداری کو اہلیتِ معاویہ کی دلیل سمجھتے ہیں۔ یہاں ہم بہت لوگوں کی عیارات و آراء کو نقل کرنے کی بجائے بطور نمونہ ایک آدھ اقتباس پیش کر رہے ہیں۔ بعض نامور متاخرین ہند لکھتے ہیں:

”امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگر خلافت کے اہل نہ ہوتے (تو) امام مجتبیٰ ہرگز انہیں

تفویض نہ فرماتے۔“

(فتاویٰ رضویہ ج ۲۹ ص ۳۳۷)

مد نظر اہلیت تھی یا دفع شر؟

اردو اور عربی وغیرہ زبانوں میں معاویہ کی اہلیت کے متعلق اس قسم کے جملے بڑے بڑے لوگوں نے استعمال کیے ہیں۔ ہم نے مذکورہ بالا جملہ بطور نمونہ نقل کیا گیا ہے، اس کو نقل کرنے میں ہمارا مقصود یہ ہے کہ عربی اردو یا کسی بھی زبان میں ایسا مفہوم کسی بھی کتاب میں کسی بھی چھوٹی یا بڑی شخصیت سے منقول ہو تو اس کا اعتبار نہ کیا جائے، کیونکہ یہ خیال کتاب و سنت اور سیدنا امام حسن ؓ کی تصریحات کے منافی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا.

”بیشک اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے تمہیں کہ سپرد کرو امانتوں کو جو ان کے اہل ہیں۔“

(النساء: ۵۳)

احادیث مبارکہ میں بھی غیر مبہم انداز میں فرمایا گیا ہے کہ یہ بات خیانت کے زمرہ میں آتی ہے کہ اہل شخص کو نظر انداز کرتے ہوئے نا اہل کو منصب سونپ دیا جائے۔ چنانچہ اسی آیت کے تحت مفتی محمد شفیع عثمانی لکھتے ہیں:

”بعض روایات میں ہے کہ جس شخص نے کوئی عہدہ کسی شخص کے سپرد کیا حالانکہ

اُس کے علم میں تھا کہ دوسرا آدمی اُس عہدہ کے لیے اُس سے زیادہ قابل اور اہل ہے تو

اس نے اللہ کی خیانت کی اور رسول ﷺ کی اور سب مسلمانوں کی۔“

(معارف القرآن للعثماني ج ۲ ص ۴۴۶، ۴۴۷)

معاویہ بن ابی سفیان طلقاء اور موثقۃ القلوب میں سے تھے اور طلقاء کسی منصب کے لائق نہیں تھے۔

وہ کیسے؟ اس کو سمجھنے کے لیے درج ذیل سطور میں غور فرمائیں۔

طلاق اور مؤلفۃ القلوب میں فرق

فتح مکہ کے بعد جن لوگوں کو غلام بنانے کی بجائے آزاد کر دیا گیا تھا اُن سب کو طلاق کہا جاتا ہے، پھر اُن میں سے جن سے سازشوں اور شرارتوں کا اندیشہ تھا اور اسی وجہ سے انہیں دوسرے لوگوں کی بہ نسبت مال زیادہ دیا گیا، انہیں طلاق کے ساتھ ساتھ مؤلفۃ القلوب بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی لفظ طلاق کا اطلاق تو فتح مکہ کے بعد مجبوراً مسلمان ہونے والے تمام لوگوں پر ہوتا ہے مگر مؤلفۃ القلوب کا اطلاق سب طلاق پر نہیں بلکہ فقط اُن طلاق پر ہوتا ہے جن سے مستقبل میں کسی قسم کے ضرر کا اندیشہ تھا۔

کیا سب طلاق مجبوراً مسلمان ہوئے تھے؟

یہاں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ فتح مکہ کے موقع پر اکثر لوگ تو مجبوراً اسلام لائے تھے مگر بعض خوش بختوں کی قسمت نے یاوری فرمائی تو انہیں دل سے ایمان لانا نصیب ہوا۔ انہی میں سے حضرت عتاب بن اسید اور اُن کے تین ساتھی ہیں۔ علماء حدیث و سیر نے اُن کے واقعہ کے بارے میں جو کچھ نقل کیا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے:

”فتح مکہ کے روز جب نماز ظہر کا وقت ہوا تو نبی کریم ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کہنے کا حکم دیا تو قریش کے چار لوگ جو ایک مخفی مقام پر بیٹھے تھے، کہنے لگے: بشکر ہے کہ ہمارے فلاں فلاں بزرگ اس ذلت کے دن سے محفوظ رہے اور کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اس سیاہ کالے کی آواز سننے سے محفوظ رہے۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں اُن کی اس سرگوشی سے آگاہ فرما دیا تو انہوں نے کہا: ہمارے ساتھ کوئی ایسا آدمی ہرگز نہیں تھا جس کے بارے میں ہم کہہ سکیں کہ اُس نے آپ کو ہماری گفتگو سے آگاہ کیا ہے۔“

مَا أَخْبَرَكَ إِلَّا اللَّهُ، وَشَهِدُوا شَهَادَةَ الْحَقِّ.

آپ کو اللہ تعالیٰ نے ہی خبر دی ہے، اور وہ صدق دل سے مسلمان ہو گئے۔

پھر آپ ﷺ نے حضرت عتاب بن اسید کو مکہ المکرمہ کا گورنر مقرر فرمادیا۔

(الإصابة (ط: علمية) ج ۴ ص ۳۵۶)

اسی طرح حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ بھی اگرچہ فتح مکہ کے دن اسلام لائے تھے مگر مجبوراً انہیں بلکہ دل سے اسلام قبول کیا تھا۔ چنانچہ وہ خود بیان فرماتے ہیں:

”ہجرت سے پہلے مکہ المکرمہ میں حضور ﷺ کے ساتھ میری ملاقات ہوئی تو آپ نے مجھے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ میں نے کہا اے محمد! تعجب ہے کہ آپ مجھ ایسے شخص میں طمع رکھتے ہیں کہ میں آپ کی پیروی کروں گا حالانکہ آپ قوم کے دین کی مخالفت کرتے ہیں اور ایک نیا دین نکال لائے ہیں۔ حضرت عثمان کہتے ہیں زمانہ جاہلیت میں ہم ہر پیر اور جمعرات کو کعبہ معظمہ کا دروازہ کھولتے تھے۔ ایک دن ہم نے کعبہ معظمہ کا دروازہ کھول رکھا تھا کہ دیگر لوگوں کے ساتھ نبی کریم ﷺ بھی اُس میں داخل ہونے لگے تو میں نے آپ پر غصہ کیا اور خوب دِل کی بھڑاس نکالی، لیکن آپ نے حلم و بردباری کا مظاہرہ کیا، پھر فرمایا:

يَا عُثْمَانُ اَلْعَلَّكَ سَتَرْنِي هَذَا الْخِفَافَ بِيَدِي اَضَعُهُ حَيْثُ شِئْتُ.

اے عثمان! عنقریب تم دیکھو گے کہ یہ چابی میرے ہاتھ میں ہوگی، میں اسے جہاں چاہوں گا رکھوں گا۔

میں نے کہا: اس دن قریش تباہ اور ذلیل ہو جائیں گے۔ آپ نے فرمایا: نہیں بلکہ آباد ہوں گے اور عزت حاصل کریں گے۔ پھر آپ کعبہ میں داخل ہو گئے۔ پس آپ کا یہ جملہ میرے دل میں پوسٹ ہو گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہ معاملہ عنقریب ضرور ہوگا۔ پھر میں نے اسلام قبول کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو میری قوم نے مجھے بہت سختی سے منع کر دیا۔ پھر فتح مکہ کے دن حضور ﷺ نے حکم فرمایا: عثمان کو بلاؤ! میں حاضر ہوا تو فرمایا: چابی لاؤ! میں چابی لے آیا تو آپ نے مجھ سے لے لی، پھر مجھے

واپس کرتے ہوئے فرمایا: یہ پکڑو! ہمیشہ یہ تمہارے پاس رہے گی اور تم سے کوئی چھین نہیں سکے گا مگر ظالم۔ پھر جب میں چابی لے کر چل دیا تو آپ نے مجھے پکارا۔ میں پلٹ کر آیا تو ارشاد فرمایا:

أَلَمْ تَكُنِ الْيَدِي قُلْتُ لَكَ؟ فَلَذَكَرْتُ قَوْلَهُ لِي بِمَكَّةَ قَبْلَ الْهَجْرَةِ
لَعَلَّكَ سَتَرْتَنِي هَذَا الْمِفْتَاحَ بِيَدِي أَضَعُهُ حَيْثُ شِئْتُ.

کیا ہم نے تمہیں کہا نہیں تھا؟ تو مجھے آپ کا وہ ارشاد یاد آ گیا جو آپ نے ہجرت سے قبل فرمایا تھا: ”عنقریب تم دیکھو گے کہ یہ چابی میرے ہاتھ میں ہوگی، میں اسے جہاں چاہوں گا رکھوں گا“ میں نے عرض کیا: میں گواہی دیتا ہوں: بیشک آپ اللہ کے رسول ہیں۔“

(سبل الہدی ج ۱۰ ص ۶۵، ۶۶؛ تاریخ مکة للأزرقی ج ۱ ص ۲۷۸، ۲۷۹؛ شفاء الغرام للفاہسی ج ۲ ص ۲۴۱، ۲۴۲؛ عیون الأثر ج ۲ ص ۲۴۰، ۲۴۱)

خلاصہ یہ ہے کہ سب طلقاء مجبوراً مسلمان ہوئے تھے اور نہ ہی سب طلقاء یکساں تھے بلکہ ان میں کچھ اچھے تھے اور کچھ خراب، اور جو زیادہ خراب تھے وہی مؤلفہ القلوب تھے۔

کیا طلقاء منصب کے اہل تھے؟

معاویہ طلقاء میں سے بھی تھے اور مؤلفہ القلوب میں سے بھی اور ایسے لوگ کسی منصب کے اہل نہیں تھے۔ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے جو بامر مجبوری معاویہ کو ملک سونپا تھا اسے معاویہ کی اہلیت کی دلیل سمجھنا حقائق سے غفلت کی علامت ہے۔ تعجب ہے کہ بعض نامور اکابر اس بات کو اہلیت معاویہ قرار دینے کی غلطی کے مرتکب ہو گئے اور یہاں تک لکھ دیا:

”امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگر خلافت کے اہل نہ ہوتے (تو) امام مجتبیٰ ہرگز انہیں تفویض نہ فرماتے۔“

(فتاویٰ رضویہ ج ۲۹ ص ۳۳۷)

سیدنا عمرؓ کا موقف

امام ابن سعد نے خلافت پر مبنی روایات کے ضمن میں اپنی سند کے ساتھ لکھا ہے کہ عبدالرحمان بن ابزىؓ بیان کرتے ہیں: خلیفہ ثانی سیدنا عمرؓ نے فرمایا:

هَذَا الْأَمْرُ لِي أَوْ لِأَهْلِ بَيْتِي مَا بَقِيَ مِنْهُمْ أَحَدٌ ، ثُمَّ لِي أَوْ لِأَهْلِ بَيْتِي مَا بَقِيَ مِنْهُمْ أَحَدٌ ، وَلِي كَذَا وَكَذَا ، وَلَيْسَ فِيهَا لِطَلِيقِي وَلَا لِوَلَدِ طَلِيقِي وَلَا لِمُسْلِمَةِ الْفَتْحِ شَيْءٌ.

”یہ امر اہل بدر میں رہے گا جب تک کہ اُن میں سے کوئی ایک باقی رہا، پھر یہ اہل احد میں رہے گا جب تک کہ اُن میں سے کوئی ایک باقی رہا، پھر درجہ بدرجہ چلتا رہے گا، اور اس میں طلقاء، طلقاء کی اولاد اور فتح مکہ کے مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔“

(الطبقات الكبرى لابن سعد ج ۳ ص ۳۱۷؛ وط: علمية ج ۳ ص ۳۶۰؛ أسد الغابة ج ۵ ص ۲۰۴؛ تاریخ دمشق ج ۵۹ ص ۱۴۵؛ مختصر تاریخ دمشق ج ۲۵ ص ۴۲؛ فتح الباری ج ۱۷ ص ۶۰؛ حدیث ۷۲۲۱؛ جمع الجوامع للسيوطی ج ۱ ص ۱۵۲؛ حدیث ۱۸۶۲؛ کنز العمال ج ۱۲ ص ۶۸۱ حدیث ۳۶۰۴۶)

اس اثر کی سند میں چار راوی ہیں، اُن کی ثقاہت وغیرہ کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے بطور خلاصہ یوں حکم لگایا ہے:

۱۔ عفان بن مسلم: ثقہ اور ثبت ہے۔

(تقریب التہذیب ۶۸۱)

۲۔ ابوعوانہ و ضاح بن عبداللہ الشکری: ثقہ اور ثبت ہیں۔

(تقریب التہذیب ص ۱۰۳۶)

۳۔ حسین بن عمران: سچا ہے، شک میں پڑتا ہے۔

(تقریب التہذیب ص ۲۴۹)

۴۔ عبدالرحمان بن ابزی: کم عمر صحابی ہیں اور سیدنا عمرؓ کے دور میں ”زجل“ (مرو) تھے۔

(تقریب التہذیب ص ۵۶۹)

اس سند میں حضرت عبدالرحمان بن ابزیؓ سے جس شیخ نے سنا ہے، اُن کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ تاہم حافظ ابن حجر عسقلانی کے نزدیک یہ حدیث قابلِ حجت ہے، کیونکہ انہوں نے اس سے سیدنا عمرؓ کے اس ارشاد سے صحابہ کرامؓ کی طبقاتی فضیلت کی دلیل اخذ کی ہے۔ نیز اس اثر کی صحت کی اہم دلیل یہ بھی ہے کہ اس کے پہلے راوی عفان بن مسلم کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے محدث ابن المدینی کا قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

كَانَ إِذَا شَكَّ فِي حَرْفٍ مِنَ الْحَدِيثِ تَرَكَهُ.

”جب انہیں حدیث کے کسی ایک حرف میں بھی شک پڑ جاتا تو وہ اُسے چھوڑ دیتے۔“

(تقریب التہذیب ص ۶۸۱)

سیدنا عمر بن الخطابؓ سے ایک اور قول بھی اسی طرح منقول ہے۔ چنانچہ حافظ ہی لکھتے ہیں:

إِنْ عُمَرَ قَالَ لِأَهْلِ الشُّوْرَى: لَا تَخْتَلِفُوا، فَإِنَّكُمْ إِنْ اخْتَلَفْتُمْ جَاءَ كُمْ مُعَاوِيَةُ مِنَ الشَّامِ، وَعَبْدُ اللَّهِ بْنُ رَبِيعَةَ مِنَ الْيَمَنِ، فَلَا يَرِيَانِ لَكُمْ فَضْلًا لِسَابِقَتِكُمْ، وَإِنْ هَذَا الْأَمْرُ لَا يَصْلُحُ لِلطَّلَاقِ وَلَا لِابْنَاءِ الطَّلَاقِ، فَهَذَا يَقْتَضِي أَنْ يَكُونَ عَبْدُ اللَّهِ مِنْ مُسْلِمَةِ الْفَتْحِ.

”سیدنا عمرؓ نے مجلس شوریٰ سے فرمایا: اختلاف میں نہ پڑنا، اگر تم اختلاف میں پڑ گئے تو معاویہ شام سے اور عبد اللہ بن ربیعہ یمن سے آجائے گا، پھر وہ دونوں تمہارے سابقین ہونے کی فضیلت کو نہیں دیکھیں گے، اور یہ معاملہ خلافت طلقاء اور اولاد طلقاء کے لیے درست نہیں ہے۔ حافظ فرماتے ہیں: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبد اللہ بن ربیعہ فتح مکہ کے مسلمانوں (طلاق) میں سے تھا۔“

(الإصابة ج ۴ ص ۷۰ فی ترجمة عبد الله بن ربيعة ذوالرمحين)

ہر چند کہ اس روایت کی سند معلوم نہیں تاہم اس کا متن سورۃ الانفال کی آیت [۷۲] اور ایک صحیح حدیث سے مؤید ہے، اور وہ یہ ہے:

الْمُهَاجِرُونَ وَالْأَنْصَارُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ،
وَالطَّلَاقُ مِنْ قُرَيْشٍ ، وَالْعَتَقَاءُ مِنْ ثَقِيفٍ ، بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ فِي
الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ .

”مہاجرین و انصار دنیا اور آخرت میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور قریش کے
طلاق اور ثقیف کے عتقاء دنیا اور آخرت میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔“

(مسند أحمد ج ۴ ص ۳۶۴ و ط: ج ۶ ص ۵۱۳ حدیث ۱۹۴۲۷)

ظاہر ہے کہ جب معاویہ اور عبداللہ بن ربیعہ طلقاء میں سے تھے تو وہ خلافت کے معاملہ میں طلقاء
اور عتقاء کو چھوڑ کر سابقین کی فضیلت کو مد نظر رکھتے تو یہ حدیث نبوی غلط ہو جاتی۔ معلوم ہوا کہ قول عمر ؓ
ارشاد نبوی ﷺ کے مطابق ہے۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ معاویہ سابقین پر طلقاء وغیرہ کو ترجیح دیتے تھے۔
نیز طلقاء کے بارے میں سیدنا عمر ؓ کا موقف درج ذیل الفاظ سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ علامہ ابن
عبدالبرہ اندلسی لکھتے ہیں کہ معاویہ نے حکیم کے بعد سیدنا سعد بن ابی وقاص ؓ کو ایک خط لکھا جس میں
انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ وہ ایک مجلس شوریٰ میں خلافت کا معاملہ رکھنا چاہتے ہیں، لہذا اس میں
سعد بن ابی وقاص بھی شریک ہوں۔ انہوں نے جواباً لکھ بھیجا:

أَمَّا بَعْدُ ، فَإِنَّ عُمَرَ ؓ لَمْ يَدْخُلْ فِي الشُّورَى إِلَّا مَنْ تَجَلَّى لَهُ
الْخِلَافَةُ ، فَلَمْ يَكُنْ أَحَدٌ أَوْلَىٰ بِهَا مِنْ صَاحِبِهِ إِلَّا بِاجْتِمَاعِنَا عَلَيْهِ ، غَيْرَ
أَنْ عَلَيَا كَانَ فِيهِ مَا لَنَا ، وَلَمْ يَكُنْ لَنَا مَا لَيْهِ .

”اما بعد، سیدنا عمر ؓ نے تو مجلس شوریٰ میں نہیں داخل کیا تھا مگر انہیں جن کے
لیے خلافت جائز تھی، پس کوئی شخص خلافت کے لیے اپنے دوسرے ساتھی سے زیادہ
بہتر نہیں تھا، الا یہ کہ ہم سب اس کے حق میں جمع ہو جاتے ماسوا علی ؓ کے، ان میں وہ

تمام صفات جمع تھیں جو ہم سب میں نہیں تھیں اور ہم سب میں وہ خوبیاں نہیں تھیں جو تنہا اُن میں تھیں۔“

(العقد الفرید ج ۵ ص ۸۶)

اس میں سیدنا سعد بن ابی وقاص ؓ نے دو باتیں سمجھائی ہیں:

- ۱۔ ایک یہ کہ تم اور خلافت کے لیے مجلس شوریٰ کا کوئی جوڑ نہیں
- ۲۔ دوسری یہ کہ تم اُس علی کی حیات میں خلافت اور مجلس شوریٰ کے متمنی ہو جن کی خوبیوں کا یہ عالم ہے کہ ہم سب کی خوبیوں کو ملا کر بھی اُن کی خوبیوں کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔

یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ ایک طرف تو سیدنا عمر ؓ طلقاء کو مجلس شوریٰ میں لینا جائز نہیں سمجھتے تھے اور اپنی زندگی کے آخری دو چار دنوں میں بھی صحابہ کرام ؓ کو طلقاء سے خبردار کر رہے تھے اور دو ٹوک انداز میں فرما رہے تھے کہ طلقاء خلافت کے لیے موزوں نہیں ہیں، جبکہ دوسری طرف بعض طلقاء کو انہوں نے یہ منصب سونپا بھی تھا، یہ تضاد کیسا؟ اس اشکال کا حل عنقریب آ رہا ہے۔

سیدنا ابن عباس ؓ کا موقف

ایک مرتبہ معاویہ نے سیدنا ابن عباس ؓ کی طرف خلافت کے معاملات میں خط ارسال کیا اور اُس میں لکھا کہ اگر لوگ آپ کی بیعت کرتے تو ہم علی کی بجائے تمہاری بیعت کے لیے جلدی کرتے۔ اس کے جواب میں سیدنا ابن عباس ؓ نے لکھ بھیجا:

وَإِنَّ الْخِلَافَةَ لَا تَصْلُحُ إِلَّا لِمَنْ كَانَ فِي الشُّورَى مِمَّنْ مَمَّاهُ عَمْرُ،
فَمَا أَنْتَ وَالْخِلَافَةُ يَا مُعَاوِيَةُ! وَأَنْتَ طَلِيقُ الْإِسْلَامِ، وَابْنُ رَأْسِ
الْأَحْزَابِ، وَابْنُ آيَكِلَةِ الْأَشْجَادِ.

”خلافت صرف اُن لوگوں کے لیے مناسب ہے جن کا نام سیدنا عمر ؓ نے
مجلس شوریٰ میں لیا تھا، لہذا اے معاویہ تمہارا اور خلافت کا کیا جوڑ؟ تم اسلام کے طلق
(آزاد شدہ) ہو، غزوہ احزاب میں کفر کے سرغنہ کے بیٹے ہو اور کچا کلیجہ چبانے والی

کے بچے ہو۔

(أنساب الأشراف للبلاذري ج ۵ ص ۱۱۵)

ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا موقف

ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بھی طلاق کی امارت کو پسند نہیں فرماتی تھیں اور ان کی مملکت کو انتہائی سخت الفاظ سے تعبیر فرماتی تھیں۔ اس سلسلے میں راقم الحروف مزید کچھ کہنے سے قاصر ہے، آپ ان ہی کے الفاظ میں غور فرمائیے۔ علامہ ذہبی، ابن عساکر اور ابن کثیر حالات معاویہ میں سند کے ساتھ لکھتے ہیں:

أَيُّوبُ بْنُ جَابِرٍ، عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ، عَنِ الْأَسْوَدِ، قُلْتُ لِعَائِشَةَ: أَلَا تَعْجِبِينَ لِرَجُلٍ مِنَ الطَّلَقَاءِ يُنَازِعُ أَصْحَابَ مُحَمَّدٍ فِي الْخِلَافَةِ؟ قَالَتْ: وَمَا تَعْجَبُ مِنْ ذَلِكَ؟ هُوَ سُلْطَانُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ الْبَرُّ وَالْفَاجِرُ، وَقَدْ مَلَكَ يَرْغَوْنَ مَصْرَ أَرْبَعِ مِائَةِ سَنَةٍ.

”حضرت اسود بن یزید کہتے ہیں: میں نے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا: کیا آپ کو تعجب نہیں ہوتا کہ خلافت کے معاملہ میں حضور ﷺ کے صحابہ کرام کے ساتھ ایسا شخص تنازع کر رہا ہے جو طلقاء میں سے ہے؟ انہوں نے فرمایا: تم اس معاملہ میں حیرت زدہ کیوں ہو؟ یہ خدا کا ملک ہے وہ نیک و فاجر ہر ایک کو دے دیتا ہے، فرعون نے بھی تو مصر پر چار سو سال حکومت کی تھی۔“

(سير أعلام النبلاء ج ۳ ص ۱۴۳؛ تاریخ دمشق ج ۵۹ ص ۱۴۵؛ مختصر تاریخ دمشق ج ۲۵ ص ۴۲؛ البداية والنهاية ج ۱۱ ص ۴۳۰، وط: ج ۸ ص ۱۹۰؛ الدر المنثور ج ۱۳ ص ۲۱۵، ۲۱۶، سورة الزخرف، آية: ۵۱)

اس سند میں ایک راوی ایوب بن جابر ہے، اس کے متعلق جرح و تعدیل کے مختلف اقوال مذکور ہیں، لیکن کسی نے اس کو کذاب یا وضاع نہیں کہا۔ اسی لیے حافظ ابن حجر عسقلانی نے سب اقوال کو مد نظر رکھ کر نتیجہ اخذ کرتے ہوئے لکھا ہے:

ضَعِيفٌ مِنَ الثَّانِيَةِ.

”آٹھویں طبقہ سے ہے، ضعیف ہے۔“

(تقریب التہذیب ص ۱۵۸)

لہذا کوئی اور سنگین وجہ نہ ہو تو اس حدیث کو موضوع یا متروک نہیں کہا جاسکتا، بلکہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے امام بخاری سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

هُوَ أَوْثَقُ مِنْ أَخِيهِ مُحَمَّدٍ.

”وہ اپنے بھائی محمد سے زیادہ ثقہ ہیں۔“

(تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۷۶)

اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تصحیف و توثیق میں اختلاف ہے، اور جب کسی سند میں ایسا مختلف فیہ راوی ہو تو اس سند سے مروی حدیث کو محدثین حسن کہتے ہیں۔ چنانچہ علامہ ظفر احمد عثمانی تھانوی لکھتے ہیں:

إِذَا كَانَ الرَّاوي مُخْتَلَفًا فِيهِ: وَثَقَهُ بَعْضُهُمْ، وَضَعَفَهُ بَعْضُهُمْ فَهُوَ حَسَنُ الْحَدِيثِ.

”جب راوی مختلف فیہ ہو: بعض نے اس کی توثیق کی ہو اور بعض نے اس کو ضعیف کہا ہو تو وہ حسن الحدیث ہے۔“

(قواعد فی علوم الحدیث ص ۷۲)

اس سند کے دوسرے راوی ابوالاحق کے بارے میں حافظ رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

بِقَّةٌ مُكْثَرٌ عَابِدٌ، مِنَ الثَّالِثَةِ، اخْتَلَطَ بِآخِرِهِ.

”طبقة ثالثہ کے ثقہ، بکثرت روایت کرنے والے اور عبادت گزار تھے، آخر میں اختلاط کا شکار ہو گئے تھے۔“

(تقریب التہذیب ص ۷۳۹)

یہ تابعی ہیں، سیدنا مولیٰ علیؑ اور دوسرے کئی صحابہ کرامؓ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ صحاح ستہ کے رواد میں سے ہیں، حافظ رحمۃ اللہ علیہ کا ان کے بارے میں دو ٹوک انداز میں ”اِخْتَلَطَ بِآخِرِهِ“ لکھنا غیر مناسب ہے، کیونکہ یہ اُن کے بارے میں بعض کا قول ہے اس پر اتفاق نہیں ہے، چنانچہ محدث وہی لکھتے ہیں:

أَبُو إِسْحَاقَ السَّبْعِيُّ، مِنْ أَيْمَةِ التَّابِعِينَ بِالْكُوفَةِ وَآبَائِهِمْ، إِلَّا أَنَّهُ شَاخٌ وَنَسِيَ وَلَمْ يَخْتَلَطْ.

”ابو اسحاق سبعی کوفہ کے ائمہ تابعین اور مثبت حضرات میں سے تھے، الا یہ کہ وہ بوڑھے ہو چکے تھے، بھول چکے تھے اور خلط ملط کا شکار نہیں ہوئے تھے۔“

(میزان الاعتدال ج ۵ ص ۳۲۶)

اسی لیے دورِ حاضر کے بعض لوگوں نے بھی حافظ رحمۃ اللہ کے اس قول کو غیر مناسب قرار دیا ہے۔ چنانچہ دکتور بشار عواد معروف اور شیخ شعیب الارنؤوط لکھتے ہیں:

قَوْلُهُ: ”اِخْتَلَطَ بِآخِرَةٍ“ لَيْسَ بِجَيِّدٍ.

”حافظ کا قول ”اِخْتَلَطَ بِآخِرَةٍ“ غیر مناسب ہے۔“

(تحریر تقریب التہذیب ج ۳ ص ۹۹)

اس سند کے تیسرے راوی اسود بن یزید کے بارے میں حافظ رحمۃ اللہ نے لکھا ہے:

مُخْصَرَّمٌ، ثِقَّةٌ مُكْثِرٌ فَقِيهٌ.

”دورِ نبوی ﷺ کے مومن، ثقہ، بکثرت روایت کرنے والے فقیہ ہیں۔“

(تقریب التہذیب ص ۱۴۶)

لہذا اس روایت کو مسترد نہیں کیا جاسکتا، اگر کوئی شخص اس قسم کے راویوں کی روایت کو مسترد کرنے کی کوشش کرے تو اُسے متعدد ایسی احادیث سے ہاتھ دھونا پڑے گا جو امت میں مقبول اور قابل عمل ہیں۔ اُم المؤمنین کے اس قول کی تائید اُن احادیث صحیحہ سے بھی ہوتی ہے جن میں ارشاد فرمایا گیا کہ ”مجھے خدشہ

ہے کہ تم دنیا کی خاطر لڑو گے۔“ نیز سیدنا عمرؓ کی وہ پیش گوئی بھی اس فرمان کی مؤید ہے کہ ”اے صحابہ! باہم اتحاد قائم رکھا ورنہ معاویہ وغیرہ خلافت کے معاملہ میں تم پر غالب آ جائیں گے اور تمہارے سابق ہونے کی پروا نہیں کریں گے۔“

عبدالرحمان بن غنم الاشعریؓ کا موقف

انہیں اکثر علماء نے صحابی مانا ہے لیکن امام ابن عبدالبر کے مطابق یہ حیات نبوی ﷺ میں اسلام تو لاپکے تھے مگر آپ ﷺ سے ملاقات نہیں کر سکے تھے۔ سیدنا معاذ بن جبلؓ کی محبت میں رہتے تھے اور اہل شام میں بڑے فقیہ مانے جاتے تھے۔ انہوں نے دورانِ گفتگو حضرت ابوالدرداء اور حضرت ابوہریرہؓ کو فرمایا تھا:

وَأَيُّ مَذْخَلٍ لِمُعَاوِيَةَ لَيْسَ الشُّرُوحِي؟ وَهُوَ مِنَ الطُّلُقَاءِ الَّذِينَ لَا تَجُوزُ لَهُمُ الْخِلَافَةُ، وَهُوَ وَأَبُوهُ عَنْ رُؤُوسِ الْأَحْزَابِ.

معاویہ کا شوروی سے کیا واسطہ؟ وہ اُن طلقاء میں سے ہے جن کے لیے خلافت جائز نہیں، وہ اور اُس کا باپ غزوۂ احزاب کے سرغنہ لوگوں میں سے تھے۔“

(الاستيعاب ج ۱ ص ۴۸۲؛ أسد الغابہ ج ۳ ص ۴۸۲؛ إزالة الخفاء ج ۱ ص ۴۸، ۴۹، ۵۰)

سیدنا ابوالدرداءؓ کی وفات کے بارے میں کئی اقوال ہیں: ایک قول یہ ہے کہ وہ سیدنا عثمانؓ کے دورِ خلافت میں وفات پا گئے تھے، جبکہ ایک جماعت کا قول یہ بھی ہے کہ اُن کی وفات جنگِ صفین کے بعد ۳۸ یا ۳۹ھ میں ہوئی تھی۔

(الاستيعاب ج ۲ ص ۱۲۳)

دوسرے قول کی رو سے سیدنا عبدالرحمان بن غنم اشعریؓ کا یہ واقعہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

حضرت صعصعہ بن صوحانؓ کا موقف

یہ انتہائی عقل مند، بلغ، فصیح، اعلیٰ درجہ کے خطیب اور عالم قرآن تھے۔ نبی کریم ﷺ کی ظاہری

حیات میں ایمان لاسچکے تھے مگر شرف ملاقات و دیدار سے بہرہ ور نہیں ہو سکے تھے۔ سیدنا عمرؓ نے ان کی قرآن فہمی اور حاضر جوابی کی وجہ سے اُن کو فرمایا تھا:

أَنْتَ مِنِّي وَأَنَا مِنْكَ.

”آپ مجھ سے ہیں اور میں آپ سے ہوں۔“

(الاستيعاب في معرفة الأصحاب ج ۱ ص ۴۳۱؛ أسد الغابۃ ج ۳ ص ۲۱)

ایک مرتبہ اُن کو اور اُن کے ساتھیوں کو معاویہ نے محبوس کر لیا اور پھر ایک دن ان سب کے پاس جا کر ایک ایک کے ساتھ بات چیت کی، اور پوچھا:

أَيُّ الْخُلَفَاءِ رَأَيْتُمُونِي.

”تم مجھے کیسا خلیفہ سمجھتے ہو؟“

ہر ایک نے اپنے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا اور آخر میں سیدنا صمصمہ بن صوحانؓ کو پایا ہوئے تو اُنہوں نے فرمایا:

تَكَلَّمْتُ يَا مُعَاوِيَةَ فَأَبْلَغْتُ ، وَلَمْ تَقْصُرْ عَمَّا أُرَدْتُ ، وَلَيْسَ الْأَمْرُ عَلَى مَا ذَكَرْتُ ، أَنِّي يَكُونُ الْخَلِيفَةُ مَنْ مَلَكَ النَّاسَ قَهْرًا ، وَدَانَهُمْ كِبْرًا ، وَاسْتَوْلَى بِأَسْبَابِ الْبَاطِلِ كَذِبًا وَمَكْرًا ؟ وَإِنَّمَا أَنْتَ طَلِيقُ ابْنِ طَلِيقٍ ، أَطْلَقَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَأَنْتَ تَصْلُحُ الْخِلَافَةَ لِطَلِيقٍ.

”معاویہ! تم نے کلام کیا تو پورا کیا، تمہارا جو ارادہ تھا اُس میں کمی نہیں کی اور معاملہ ایسا نہیں جیسا کہ تم نے ذکر کیا۔ بھلا وہ شخص خلیفہ کیسے ہو سکتا ہے جو جبراً لوگوں پر غالب ہو جائے اور اسبابِ باطلہ کے ذریعے مکر و کذب کے ساتھ قابض ہو بیٹھے؟ تم محض طلیق ابن طلیق ہو، رسول اللہ ﷺ نے تمہیں آزاد کیا تھا، سو خلافت کسی طلیق کے لیے کیسے جائز ہو سکتی ہے؟“

مروج الذهب کی سند کے بعض راویوں کے حالات نہیں مل سکے، تاہم حضرت مصعب بن صوحان ؓ کے اس قول کی تائید سیدنا عمر ؓ کے اس قول سے ہو جاتی ہے جو گذشتہ سطور میں لکھا جا چکا ہے۔

خلیفہ اور بادشاہ ایک واضح فرق

حضرت مصعب ؓ کے قول سے خلیفہ اور بادشاہ کا فرق بھی معلوم ہو گیا کہ خلیفہ وہ ہوتا ہے جس کو لوگ اپنی رضا و رغبت کے ساتھ لوگوں میں سے منتخب کریں، اور جو شخص خود کو شش کر کے اور لڑ بھگڑ کر اقتدار تک پہنچے تو وہ خلیفہ نہیں بلکہ بادشاہ ہوتا ہے۔ اس پر مزید گفتگو کتاب کے آخر میں آئے گی۔

مولانا علی ؒ کا موقف

سیدنا مولیٰ علی ؓ بھی طلقاء کو خلافت کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے معاویہ کو جو خط لکھا تھا اُس میں فرمایا تھا کہ وہ بھی اہل حجاز کی طرح خلیفہ برحق کی بیعت و اطاعت کرے تو اُس میں ایک جملہ یہ بھی مرقوم تھا:

وَأَعْلَمُ بِأَنَّكَ مِنَ الطَّلَاقِ الَّذِينَ لَا يَحِلُّ لَهُمُ الْخِلَافَةُ.

”اور جان لو کہ تم اُن طلقاء میں سے ہو جن کے لیے خلافت جائز نہیں ہے۔“

(اکمال، اكمال المعلم شرح صحيح مسلم للوشائفي الأبي ج ۶ ص ۴۴۵؛ شرح صحيح مسلم للسعيد ج ۵ ص ۸۰۵؛ تاريخ الطبري ج ۵ ص ۸)

فاروق اعظم ؓ کی ندامت

سیدنا امام حسن مجتبیٰ ؓ بھی معاویہ کو خلافت کے قابل نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کے الفاظ عنقریب پیش کیے جائیں گے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا معاویہ کو خلافت کا اہل قرار دینا عدم تدریجی ہونے کی وجہ سے لائق التفات نہیں۔ خود انصاف فرمائیے! جو بات سیدنا عمر، سیدنا ابن عباس، ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ، سیدنا عبدالرحمان بن غنم، سیدنا مصعب بن صوحان، مولیٰ علی اور سیدنا امام حسن مجتبیٰ ؓ ایسے اکابر کی تصریحات کے خلاف ہو، وہ کیونکر قابل قبول ہو سکتی ہے؟

یہاں کوئی شخص سوال کر سکتا ہے کہ پھر سیدنا عمرؓ نے معاویہ کو مصر کا گورنر کیوں مقرر کیا تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اپنے اس فعل پر اپنی زندگی کے آخری ایام میں نادم ہو گئے تھے۔ چنانچہ مولانا شبیر احمد عثمانی اور دوسرے محدثین لکھتے ہیں:

وَتَطَاوَلَ عُمَرُو بْنُ الْعَاصِ لِلشُّورَى ، فَقَالَ لَهُ عُمَرُ : اِطْمَئِنَّ كَمَا وَضَعَكَ اللَّهُ ، وَاللَّهِ لَا جَعَلْتُ فِيهَا حَمَلَ السَّلَاحِ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ ، وَقَالَ مَرَّةً : إِنَّ هَذَا الْأَمْرَ لَا يَصْلُحُ لِلطَّلَاقِ وَلَا لِإِبْنَاءِ الطَّلَاقِ ، وَلَوْ اسْتَقْبَلْتُ مِنْ أَمْرِي مَا اسْتَذْبَرْتُ مَا جَمَعْتُ لِيَزِيدَ بَنِي أَبِي سُفْيَانَ وَمُعَاوِيَةَ بَنِي أَبِي سُفْيَانَ وَلَايَةَ الشَّامِ .

”عمر بن العاص نے شورئی (میں شمولیت) کی آرزو کی تو سیدنا عمرؓ نے انہیں فرمایا: وہیں رہو، جہاں اللہ تعالیٰ نے تمہیں رکھا ہے۔ بخدا! میں اس معاملہ میں کسی ایسے شخص کو شامل نہیں کروں گا جس نے رسول اللہ ﷺ کے مقابلہ میں ہتھیار اٹھائے تھے، نیز فرمایا: طلاق اور طلاق کی اولاد کا حکومت کے لائق نہیں، اور اگر مجھے موجودہ صورت حال پہلے سمجھ آ جاتی تو میں یزید بن ابوسفیان اور معاویہ بن ابوسفیان کے لیے شام کی حکومت جمع نہ کرتا۔“

(فتح الملہم ج ۴ ص ۱۱۸؛ اكمال اكمال المعلم ج ۲ ص ۴۷۴؛ مکمل اكمال الاكمال ج

۲ ص ۴۷۴؛ الکوکب الوہاج ج ۸ ص ۲۰۷)

یزید بن ابی سفیان کو گورنر کیوں بنایا؟

پھر کوئی شخص سوال کر سکتا ہے کہ معاویہ کے بھائی یزید بن ابی سفیان بھی تو طلاق میں سے تھے اور انہیں سیدنا ابوبکرؓ نے مصر کا گورنر بنایا تھا۔ اگر طلاق کو کوئی منصب سونپنا جائز نہ ہوتا تو سیدنا ابوبکرؓ یزید بن ابی سفیان کو کیوں گورنر بناتے؟ چونکہ یہ انتہائی حساس مقام ہے، لہذا اس سوال کا جواب ایک آدھ جملہ میں دینا مشکل ہے، اس کی تفصیل درج ذیل عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

بوجہ فہم کی عدم رسائی غیر مناسب فیصلہ

یوں محسوس ہوتا ہے کہ جب سیدنا ابو بکر صدیق ؓ نے یزید بن ابی سفیان کو مصر کا گورنر مقرر کرنے کا فیصلہ کیا تو ان کی فہم اس خطرہ کو نہ بھانپ سکی جس کو بصیرت مرتضوی نے شروع سے ہی بھانپ لیا تھا۔ اسی طرح سیدنا عمر ؓ کی فہم بھی شروع شروع میں اس خطرہ کو نہیں بھانپ سکی تھی، جیسا کہ آپ ابھی پڑھ چکے ہیں کہ انہوں نے پہلے معاویہ کو گورنر مقرر کیا مگر اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس تقرر پر نادم ہوئے۔

فہم صحابہ اور فہم مرتضوی ؓ

در اصل ذہانت و فطانت، حکمت و بصیرت اور فہم و ذکاوت کی جو فراوانی بنو ہاشم کو عطا ہوئی تھی وہ قریش کو حاصل نہیں تھی، پھر بطفیل نبی کریم ﷺ بنو ہاشم میں سے سیدنا علی ؓ کے حصے میں جو حکمت آئی تھی وہ کسی بھی ہاشمی اور غیر ہاشمی کو نصیب نہیں ہوئی تھی، حتیٰ کہ پوری امت کو حکمت کے دس حصوں میں سے ایک حصہ عطا ہوا اور باقی نو حصے تنہا مولیٰ ؓ کے حصے میں آئے، یہی وجہ ہے کہ کسی بھی معاملہ اور فیصلہ کی تہہ تک جس سرعت سے بصیرت مرتضوی پہنچتی تھی دوسری کوئی بصیرت نہیں پہنچتی تھی۔ صحابہ کرام ؓ ان کی ایسی غیر معمولی فہم و بصیرت پر حیرت زدہ رہتے تھے، حتیٰ کہ وہ پوچھنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ کیا آپ کو قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز بھی دی گئی ہے جو دوسروں کو نہ دی گئی ہو، جیسا کہ بخاری شریف وغیرہ میں ہے۔ اسی حقیقت کو بعض سلفی علماء نے یوں بیان کیا ہے:

هَذَا أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ - عَلَيْهِ السَّلَام - اخْتَصَّ مِنْ بَيْنِ الصَّحَابَةِ وَالْقَرَابَةِ بِالْعِلْمِ الَّذِي لَمْ يَمَثَلْ فِيهِ ، وَلَمْ يُشَارِكْ وَلَمْ يُشَابَهْ فِيهِ ، وَلَمْ يُقَارَبْ ، بِحَيْثُ إِنَّهُ لَمْ يُعْلَمْ - بَعْدَ الْأَنْبِيَاءِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ - لَظِيْرُهُ فِي عِلْمِهِ ، الَّذِي خَيْرَ الْعُقُولِ ، وَأَسْكَنَ الْوَاصِفِينَ ، إِلَى أَنْ قَالَ ... إِنَّمَا هِيَ مِنْحَ رَبَّانِيَّةٍ ، وَمَوَاهِبُ لَدُنِّيَّةٍ ، وَلَكِنَّهُ عِلْمُهُ ﷺ أَنَّهُمْ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَخْبَرَهُ مِنَ الشَّرِيعَةِ بِمَا أَخْفَا عَنْ النَّاسِ ، فَسَأَلَهُ رَجُلٌ : مَا الَّذِي

أَسْرَ إِلَيْكَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ؟ فَغَضِبَ ، وَقَالَ : وَاللَّهِ مَا أَسْرَ إِلَيَّ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ شَيْئًا كَتَمَهُ عَنِ النَّاسِ ، وَإِنَّمَا عِنْدَنَا كِتَابُ اللَّهِ ، وَهِيَءَ مِيقَ السَّنَةِ ذَكَرَهُ النَّبِيُّ ﷺ ، أَوْفَهُمْ أَوْفَىءَ رَجُلٌ .

”یہ امیر المؤمنین (سیدنا علیؑ) ہیں جو صحابہ و اہل بیت کے مابین علم میں اس قدر مخصوص تھے کہ اُس میں اُن کا کوئی مد مقابل، کوئی شریک، کوئی مشابہ اور کوئی قریب بھی نہیں تھا، علم میں جو اُن کی حیثیت تھی انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد اُس کی نظیر نہیں جانی گئی، اُن کے علمی مقام نے عقلوں کو حیران اور بیان کرنے والوں کو ششدر کر رکھا تھا۔ یہ محض ربانی عطائیں اور فیوضات الہیہ ہیں۔ علمی فراوانی کی وجہ سے اُن پر شک کیا جانے لگا کہ شاید رسول اللہ ﷺ نے انہیں شریعت کے کچھ ایسے امور بتلائے ہیں جو دوسروں سے مخفی رکھے گئے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے اُن سے سوال کیا: آپ کو رسول اللہ ﷺ نے مخفی طور پر کیا کیا بتایا؟ اس پر انہوں نے غضب ناک ہو کر فرمایا: اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ نے مجھے ایسا کچھ نہیں بتایا جسے دوسرے لوگوں سے چھپایا ہو، ہمارے پاس فقط اللہ تعالیٰ کی کتاب، رسول اللہ ﷺ کی بیان فرمودہ احادیث یا وہ فہم ہے جو کسی شخص کو عطا کی جاتی ہے۔“

(العواصم والقواصم فی الذب عن سنة أبي القاسم، لابن الوزير الیمانی ج ۱ ص ۲۴۱)

علامہ موصوف ایک اور مقام میں لکھتے ہیں:

الْأَحَرَى أَنْ أَبَا بَكْرٍ وَعُمَرُ وَعُثْمَانُ وَكَثِيرٌ مِنَ الصَّحَابَةِ كَانُوا مُجْتَهِدِينَ ، وَلَمْ يَكُونُوا فِي الرُّسُوحِ فِي الْعِلْمِ كَأَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ .

”کیا آپ نے غور نہیں کیا کہ حضرت ابوبکر، عمر، عثمان اور صحابہ کرامؓ میں سے کافی حضرات مجتہدین تھے، لیکن انہیں امیر المؤمنین کی طرح علم میں رسوخ حاصل نہیں تھا۔“

(العواصم والقواصم فی الذب عن سنة أبي القاسم ج ۸ ص ۲۶۵)

انبیاء کرام علیہم السلام میں تفاوتِ فہم

ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو ذہن میں یہ اشکال پیدا ہو کہ سیدنا مولیٰ علیؑ فہم، قوتِ فیصلہ اور علمی رسوخ میں جمیع صحابہ خصوصاً بزرگ صحابہ کرامؓ سے کیونکر فائق و برتر ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں گزارش ہے کہ یہ کوئی اجنبی کی بات نہیں ہے، کیونکہ ان باتوں میں تو انبیاء کرامؑ علیہم السلام میں بھی تفاوت ہوتا ہے، حتیٰ کہ قرآن مجید میں ایسے دونوں کا ذکر کیا گیا ہے جو باپ بیٹا تھے لیکن بیٹا قوتِ فیصلہ اور فہم میں اپنے والد سے بھی زیادہ تھا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَدَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ إِذْ يَحْكُمَانِ فِي الْحَرْثِ إِذْ نَفِثَتْ فِيهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شَاهِدِينَ. فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ وَكُلًّا آتَيْنَا حُكْمًا وَعِلْمًا.

”اور یاد کرو داود و سلیمان (علیہما السلام) کو جب وہ فیصلہ کر رہے تھے ایک کھیتی کے جھگڑے کا جب رات کے وقت چھوٹ گئیں اس میں قوم کی بکریاں، اور ہم ان کے فیصلے کا مشاہدہ کر رہے تھے، سو ہم نے سمجھا دیا وہ معاملہ سلیمان کو، اور ان سب کو ہم نے بخشا تھا حکم اور علم۔“

(سورۃ الانبیاء، علیہم السلام: ۷۸، ۷۹)

پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”ایک شخص کی بکریاں رات کے وقت کسی کھیت میں گھس گئیں اور اسے اُجاڑ کر رکھ دیا۔ کھیت والا داؤدِ سی کے لیے حضرت داودؑ کی خدمت میں حاضر ہوا، بکریوں کے مالک کو بھی بلایا گیا۔ دونوں کے بیان سن کر آپ نے فیصلہ کیا کہ بکریاں کھیت والے کو دے دی جائیں تاکہ اس کے نقصان کی تلافی ہو سکے۔ کیونکہ کھیت کا جو نقصان ہوا تھا بکریوں کی قیمت اندازاً اس کے لگ بھگ تھی۔ حضرت سلیمانؑ (علیہ السلام) جو ابھی کمسن تھے نے جب یہ فیصلہ سنا تو کہا کہ اس سے بھی فیصلہ کی ایک بہتر صورت

ہو سکتی ہے، کہ بکریاں عارضی طور پر کھیت والے کو دے دی جائیں، وہ ان کا دودھ پیے اور دوسرے فوائد حاصل کرے اور بکریوں والے کو حکم دیا جائے کہ وہ اس اجڑے ہوئے کھیت کی نگرانی اور حفاظت کرے۔ جب کھیت اپنی اصلی حالت پر آجائے تو کھیت والے کو اس کا کھیت دے دیا جائے اور بکریوں کا مالک اپنی بکریاں لے لے۔ یہ فیصلہ سن کر حضرت داود (علیہ السلام) کی خوشی کی انتہا نہ رہی، چنانچہ اسی کے مطابق عمل کیا گیا۔

(ضمیمہ القرآن ج ۳ ص ۱۷۷)

کتاب صحاح میں حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے اپنے والد سے زیادہ فہیم ہونے کا ایک اور واقعہ بھی آیا ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا:

”دو عورتیں تھیں، اُن میں سے ہر ایک کے ساتھ اپنا اپنا بچہ تھا۔ بھیڑیا آیا اور ان میں سے ایک کے بچے کو کھا گیا۔ ایک نے دوسری سے کہا: بھیڑیے نے تمہارے بچے کو کھایا ہے، دوسری نے کہا: نہیں، بلکہ تمہارے بچے کو کھایا ہے۔۔۔۔۔ دونوں سیدنا سلیمان (علیہ السلام) کے پاس فیصلہ کے لیے گئیں تو انہوں نے فرمایا: چھری لاؤ، میں اس بچے کے دو ٹکڑے کر دیتا ہوں۔ اس پر چھوٹی عورت کہنے لگی: اَتَشُقُّہُ (آپ اس کے دو ٹکڑے کر دیں گے؟) فرمایا: ہاں، کہنے لگی: لَا تَفْعَلْ حَقِیْ مِنْہُ لَهَا، قَالَ: هُوَ اَبْنُکَ، فَقَضٰی بِہِ لَهَا (ایسا نہ کریں، میرا حصہ بھی اسی کا ہو گیا، اس پر سلیمان (علیہ السلام) نے فرمایا: یہ بچہ تمہارا ہی ہے، پھر اُسی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔“

(بخاری: کتاب أحادیث الأنبياء، باب قول الله تعالى: وَوَهَبْنَا لِذَاوُدَ سَلِيمَانَ الْخ، ص ۴۶۸)

حدیث ۳۴۲۷؛ مسلم: کتاب الأقضية، باب بیان اختلاف المجتہدین، ص ۸۲۲ حدیث

۱۷۲۰؛ سنن النسائی: کتاب آداب القضاة، باب حکم الحاكم بعلمه، ص ۸۱۲، ۸۱۳

حدیث ۵۴۰۳، ۵۴۰۴، ۵۴۰۵

غور فرمائیے! حضرت داود علیہ السلام صاحب کتاب تھے، انہیں زبور شریف دی گئی تھی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے والد گرامی تھے مگر قوتِ فیصلہ اور کسی معاملہ کی کنہ (حقیقت) تک پہنچنے میں ان کے لختِ جگر ان سے زیادہ تھے۔ اسی طرح اگرچہ سیدنا مولیٰ علی علیہ السلام عمر میں سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے چھوٹے تھے مگر عقل، علم، قرآن نہیں، حکمت، ذکاوت، فراست، قوتِ قضاء و فیصلہ اور معاملہ کی تہہ تک پہنچنے میں ان سے بہت بڑھ کر تھے۔

بعض طلاقاء اقتدار پر کیسے پہنچے؟

جب قرآن و سنت کی روشنی میں معلوم ہو گیا کہ انسانوں کا فہم میں متفادات ہونا ایک اہل حقیقت ہے اور بسا اوقات کم عمر شخص فہم و فراست میں اکابر پر فائق ہوتا ہے۔ سواگر کتاب و سنت کی اس روشنی میں دیکھا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جب سیدنا ابوبکر صدیق علیہ السلام نے یزید بن ابی سفیان کو مصر کا گورنر مقرر کیا تو ان کی فہم وہاں تک نہ پہنچ سکی جہاں تک سیدنا علی علیہ السلام کی فہم مرحلہ اول میں پہنچ گئی تھی۔ فرق یہ ہے کہ سیدنا داود علیہ السلام کے فیصلہ پر فوراً آیت نازل ہو گئی اور سیدنا سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ نافذ ہو گیا۔ اگر سیدنا داود علیہ السلام کا فیصلہ برقرار رہتا تو نہ کورالصدر حدیث میں جس بچے کا ذکر ہوا ہے وہ ہمیشہ کے لیے اس عورت کے پاس رہتا جو کہ حق دار نہیں تھی۔ سو چونکہ سیدنا ابوبکر صدیق علیہ السلام کے فیصلہ پر نہ کوئی وحی نازل ہونا تھی اور نہ ہی سیدنا سلیمان علیہ السلام کی طرح ان کے فیصلہ کے سامنے کسی دوسرے فیصلہ کا آنا منقول ہے، اس لیے ان کا فیصلہ برقرار رہا اور اس کی بدولت یزید بن ابی سفیان تاحیات مصر کے گورنر رہے۔ امام ذہبی لکھتے ہیں:

وَلَمَّا اخْتَصَرَ، اِسْتَعْمَلَ اَخَاهُ مُعَاوِيَةَ عَلٰى عَمَلِهِ ، فَاقْرَءَ عُمَرُ عَلٰى ذٰلِكَ.

”جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے اپنے بھائی معاویہ کو اپنے کام پر مقرر کر دیا، پھر سیدنا عمر علیہ السلام نے بھی انہیں اس پر قائم رکھا۔“

یزید بن ابی سفیان کا سیدنا ابوبکر ؓ کی نافرمانی کرنا

نہیں معلوم کہ مگر بن خلافت راشدہ سیدنا ابوبکر صدیق ؓ کے اس فیصلہ کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یزید بن ابی سفیان کو گورنر مقرر کرتے وقت سیدنا ابوبکر صدیق ؓ پر یزید بن ابی سفیان کا غیر مستحق ہونا اسی طرح مخفی رہا جس طرح سیدنا داؤد ؑ پر مذکور الصدر و عورتوں میں سے بڑی عورت کا غیر مستحق ہونا مخفی رہا۔

سیدنا ابوبکر ؓ کا اتباع ہوا سے مبراء ہونا

ہر چند کہ سیدنا ابوبکر ؓ نے یزید بن ابی سفیان کو شام کا گورنر مقرر کیا تھا لیکن اس سلسلے میں وہ خواہش نفس کی پیروی سے منزہ و مبراء تھے۔ میرے اس دعویٰ کی دلیل یہ حدیث ہے۔ امام احمد لکھتے ہیں:

عَنْ يَزِيدَ بْنِ أَبِي سُفْيَانَ قَالَ قَالَ أَبُو بَكْرٍ ؓ حِينَ بَعَثَنِي إِلَى الشَّامِ :
يَا يَزِيدُ إِنْ لَكَ قَرَابَةٌ عَسَيْتَ أَنْ تُؤَيِّرَهُمْ بِالْإِمَارَةِ ، وَذَلِكَ أَكْثَرُ مَا
أُخْفَاكَ عَلَيْكَ ، فَإِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ : مَنْ وَلِيَ مِنْ أَمْرِ الْمُسْلِمِينَ
شَيْئًا فَأَمَرَ عَلَيْهِمْ أَحَدًا مُحَابَاةً فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللَّهِ ، لَا يَقْبَلُ مِنْهُ حَرْفًا وَلَا
عَدْلًا حَتَّى يَدْخُلَهُ جَهَنَّمَ .

”یزید بن ابی سفیان بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر ؓ نے جب مجھے شام بھیجا تو فرمایا: اے یزید! یقیناً تمہارے رشتہ دار ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم امارت میں انہیں ترجیح دے دو، مجھے تمہارے بارے میں سب سے بڑا خدشہ یہی ہے۔ بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے مسلمانوں کے کسی معاملہ میں کسی کو باہمی محبت کی وجہ سے سربراہ مقرر کیا تو اس پر اللہ کی لعنت ہو، اللہ تعالیٰ اس کے نفل و فرض قبول نہیں فرمائے گا، یہاں تک کہ اسے جہنم میں داخل فرما دے گا۔“

(مسند احمد: من مسند أبي بكر ؓ ج ۱ ص ۲۰۲ حدیث ۲۱)

ہر چند کہ اس حدیث کی سند پر بعض لوگوں کو تحفظات ہیں، لیکن سیدنا ابو بکر صدیق ؓ کے ورع و تقویٰ کے پیش نظر قرین قیاس یہی ہے کہ انہوں نے یہ ارشاد ضرور فرمایا ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود اُن کا یزید بن ابوسفیان کو مقرر کرنا قرابت داری یا یاری کی وجہ سے نہیں تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ طلقاء تو کسی منصب کے لائق ہی نہیں تھے تو پھر انہوں نے یزید بن ابوسفیان کو گورنریوں بنایا؟ اس کا جواب وہی ہے جو ہم ابھی ابھی بیان کر چکے ہیں کہ اُس وقت اُن کی فہم طلقاء کے غیر مستحق ہونے کی طرف اُسی طرح نہیں جا سکی تھی جس طرح سیدنا عمر ؓ کی فہم نہیں پہنچ سکی تھی مگر بعد میں وہ نادم ہوئے تھے۔

علامہ بیہانی کے کلام سے یہ تاثر ملتا ہے کہ چونکہ نبی کریم ﷺ اپنے آخری ایام میں طلقاء کو دوسروں سے زیادہ عطا فرماتے رہے تاکہ وہ مائل بہ اسلام ہوں، اس لیے سیدنا ابو بکر ؓ اُس سیرت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس خاندان کو مناصب پر فائز کر بیٹھے۔ وَكَانَ أَبُو بَكْرٍ ؓ يُجِلُّهُمْ أَيْضًا وَيُذَارِيهِمْ أَقْبَدَاءَ بِالنَّبِيِّ ﷺ وَيُؤَيِّرُ مِنْهُمْ الْأَمْرَاءَ، وَهُوَ الَّذِي أَمَرَ يَزِيدَ بْنَ أَبِي سَفْيَانَ...

(الأساليب البديعة مع شواهد الحق ص ۳۹۴)

بہر حال یزید بن ابی سفیان کے تقرر میں سیدنا ابو بکر صدیق ؓ کی فہم بروقت اُسی طرح نہیں پہنچ سکی تھی جس طرح سیدنا داود ؑ کی فہم بروقت نہیں پہنچ سکی تھی مگر اُن کے فرزند کی فہم بروقت پہنچ گئی تھی اور کارگر بھی ثابت ہوئی تھی۔

معاویہ کی معزولی اور بغاوت

سیدنا علی المرتضیٰ ؓ طلقاء کو کسی منصب کے لیے اہل نہیں سمجھتے اسی لیے خلیفہ منتخب ہونے کے فوراً بعد انہوں نے طلقاء کی معزولی کا حکم جاری کر دیا۔ چونکہ معاویہ بھی طلقاء میں سے تھے، لہذا انہیں بھی معزولی کا آرڈر لکھ بھیجا اور اُس میں صاف صاف لکھا کہ تم طلقاء میں سے ہو اور طلقاء کے لیے خلافت جائز نہیں ہے مگر چونکہ وہ گزشتہ پندرہ سال سے مسلسل ایک ہی مقام پر گورنر کے عہدے پر بر اجماع تھے اور طاقت حاصل کر چکے تھے اس لیے انہوں نے معزولی کے حکم کو مسترد کر دیا اور بہانہ یہ بنایا کہ اُن کے رشتہ دار (حضرت عثمان بن عفان ؓ) کو ناحق شہید کر دیا گیا ہے، لہذا اُن کے قاتلین کو اُن کے سپرد کیا جائے وہ اُن قاتلین

کو قصاص میں قتل کریں گے پھر خلیفہ وقت کی بیعت کریں گے۔ اُن کی یہ بہانہ بازی درحقیقت ہٹ دھرمی تھی اور ہٹ دھرمی کا سبب اُن کی وہ طاقت تھی جو پچھلے پندرہ سولہ سالوں میں انہیں مسلسل ایک ہی مقام پر گورنر رہنے کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی۔ اگر انہیں وہ قوت حاصل نہ ہوتی تو وہ قطعاً معزولی سے انکار نہ کرتے۔ بے طاقت شخص ہٹ دھرمی نہیں کر سکتا، اسی لیے حدیث میں اُن کے گروہ کو باغی کہا گیا ہے اور باغی گروہ ہوتا ہی وہی ہے جو لڑنے کی طاقت رکھتا ہو۔ چنانچہ امام عبداللہ بن محمود موسلی حنفی، امام ابن عابدین شامی حنفی اور امام یحییٰ حنفی لکھتے ہیں:

وَأَهْلُ الْبَغْيِ: كُلُّ فِتْنَةٍ لَهُمْ مَنَعَةٌ، يَتَغَلَّبُونَ وَيَجْتَمِعُونَ وَيَقَاتِلُونَ أَهْلَ الْعَدْلِ يَتَأَوَّلُونَ، يَقُولُونَ: الْحَقُّ مَعَنَا.

”اہل بغاوت ہر وہ گروہ ہے جو غلبہ پانے، کٹھ کرنے اور اہل عدل کے ساتھ تاویل جنگ کرنے کی طاقت رکھتا ہو اور کہتا ہو کہ حق ہمارے ساتھ ہے۔“

(الاختیار لتعلیل المختار ج ۴ ص ۱۰۰؛ رد المحتار ج ۶ ص ۴۱۲؛ البناية للعيني ج ۷ ص ۲۹۸)
شیخ محمد زکریا انصاری شافعی شافعی لکھتے ہیں:

الْبَغَاةُ: هُمْ مُخَالِفُوا إِمَامٍ يَتَأَوَّلُ بَاطِلًا ظَنًّا وَشُكًّا لَهُمْ.
”وہ طاقت ور لوگ جو گمان کی پیروی میں باطل تاویل کے ساتھ امام کی مخالفت کریں باغی ہیں۔“

(منهج الطلاب للزكريا الشافعي ص ۱۵۷؛ كفاية الأخيار للحصني الشافعي ص ۶۳۶)
یہاں باغیوں کی تاویل کا حقیقۃً باطل ہونا مراد ہے، ورنہ ظاہر اتو باغیوں کی تاویل خوش گوار ہوتی ہے، اگر ظاہر اُن کی تاویل خوبصورت نہ ہو تو لوگ اُن کی حمایت میں کیوں جمع ہوں؟ ان شاء اللہ اس کی مکمل تحقیق یہ عاجز اپنی کتاب ”الفتنۃ الباغیة“ میں سپرد قلم کرے گا۔

فی الجملہ یہ کہ معاویہ کی تمام تر بغاوت کا سبب وہ طاقت و شوکت تھی جو وہ شام پر مسلسل گورنری کی وجہ سے حاصل کر چکے تھے، اور اب انہیں اُس طاقت کے استعمال کے لیے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے

قصاص کا بہانہ بھی مل گیا تھا، اُن کا اصل ہدف حصولِ اقتدار تھا اور بہانہ قصاص عثمان رضی اللہ عنہ تھا، جیسا کہ سیدنا علی، سیدنا عمار بن یاسر اور دوسرے کئی اکابر رضی اللہ عنہم نے تصریح فرمائی ہے، بلکہ یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ خود چاہتے تھے کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ قتل کر دیے جائیں، جیسا کہ عنقریب باحوالہ گھر کی گواہی آرہی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ طلقاء لوگ کسی بھی منصب کے لیے اہل نہیں تھے، اسی لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے خلافت سنبھالتے ہی اُن کی معزولی کا حکم کر دیا تھا۔ بعض متاخرین ہند کا اُنہیں خلافت کا اہل لکھنا سیدنا عمر، سیدنا علی، ام المومنین سیدہ عائشہ، سیدنا ابن عباس، سیدنا عبدالرحمان بن عثمان اشعری اور سیدنا صعصعہ بن صوحان رضی اللہ عنہ کی تصریحات کے خلاف ہونے کی وجہ سے لائق التفات نہیں۔

اُمتِ مسلمہ کی تقسیم کا سببِ اوّل

یہی وجہ ہے کہ جن علماء حق نے شخصیات کے تصور سے بالاتر ہو کر مسلمانوں کے عروج و زوال پر تحقیق کی ہے تو انہوں نے اُمتِ مسلمہ کی وحدت کے پارہ پارہ ہونے کا واحد سبب ہی اسی نااہلی کو قرار دیا ہے۔ کاش! سیدنا عمر رضی اللہ عنہ پر جو حقیقت اُن کی زندگی کے آخری ایام میں عیاں ہوئی تھی وہ اُن پر پہلے عیاں ہو جاتی تو وہ طلقاء کو منصب دیتے اور نہ ہی اُنہیں منصب پر قائم رکھتے۔ کاش! سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فہم، فہمِ داودی کی بجائے بروقت فہمِ سلیمانی کی طرح کام کرتی اور اُن سے بعض طلقاء کی نااہلی اور جھل نہ رہتی تو وہ طلقاء کو منصب نہ سونپتے، لیکن اللہ تعالیٰ ﴿فَعَالٌ لِّمَا يُؤْمِرُ﴾ ہے، وہی ہوتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ ہائے افسوس! فہمِ صدیقی فہمِ داودی کی طرح بروقت حقیقت کو نہ پاسکی اور نہ ہی اُس وقت کوئی فہمِ سلیمانی آڑے آئی تو وہ کچھ ہو گیا جس کا ہونا مقدر تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ سہو ابھی سہی مگر جب کوئی نااہل منصب پر پہنچ جائے تو کبھی نہ کبھی اُس کی نااہلی ضرور رنگ لاتی ہے اور کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی کو اُس کا خمیازہ ضرور بھگتنا پڑتا ہے۔ سو چونکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ زود فہمی اور قرآن دانی میں سب پر فائق تھے اور انہوں نے اپنی باری میں بعض نااہل طلقاء کو اُس وقت معزول کیا جب وہ طاقت اختیار کر چکے تھے تو وہ پھر گئے اور قصاص کا بہانہ بنا کر بغاوت پر اتر آئے۔

نا اہل کو منصب سوچنے کا نتیجہ

مملکت اسلامیہ پاکستان کے حالات میں ہی غور کر کے جائزہ لیجئے! بعض جرنیلوں نے بعض نا اہلوں کے لیے اقتدار کی راہ ہموار کی اور اُسی ہمواری راہ کی بدولت وقتاً فوقتاً وہ دو تین دہائیاں اقتدار پر براجمان رہے تو ملک کھوکھلا ہونا شروع ہو گیا، پھر وہ اقتدار وراثت میں تبدیل ہونے لگا تو بعض دانا یا بنا امت نے متنبہ کیا کہ ”سیاست نہیں، ریاست بچاؤ!“ اور فرمایا کہ اگر یہ نا اہل لوگ رہ گئے تو ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔ خود ہی سوچئے! پاکستان کے اُن نا اہل لوگوں کے بچے سے ملک چھڑانا کتنا مشکل ہو گیا؟ آخر نبی کریم ﷺ نے یونہی تو نہیں فرمایا تھا:

إِذَا وَبِسَدِّ الْأُمُورِ إِلَى غَيْرِ أَهْلِهَا فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ.

”جب معاملہ نالائق کو سوپ دیا جائے تو قیامت کا انتظار کرو۔“

(بخاری ص ۱۶ حدیث ۵۹)

بعض طلقاء کو اقتدار کیا ملا کہ اُمت قیامت تک کے لیے عذاب میں مبتلا ہو گئی۔ یزید بن ابی سفیان نے اپنے بھائی معاویہ کو اقتدار سوپ دیا، معاویہ کو اہل فہم حضرات نے ہٹانا چاہا تو وہ لڑنے مرنے پر تیار ہو گیا، پھر معاویہ نے وہ اقتدار اپنے بیٹے یزید کو سوپ دیا، اُس خبیث کو اہل حق نے ہٹانا چاہا تو وہ بھی لڑنے مرنے پر تیار ہو گیا، حتیٰ کہ خانوادہ نبوی کو تہ تیغ کر دیا اور بیت اللہ شریف اور مسجد نبوی تک کو نہ بخشا۔ بیچنے امت کئی فرقوں میں تقسیم ہو گئی۔ تقریباً چودہ سو سال گزر چکے ہیں مگر امت اُس نا اہلی کی محوست سے نہیں نکل سکی، اور یقیناً سیدنا امام مہدی علیہ السلام کی تشریف آوری تک اس محوست و مصیبت سے نجات ملنا ممکن نہیں۔ یہاں پہنچ کر پھر یہ حقیقت عیاں ہو گئی کہ بعض متاخرین ہند کا طلقاء کو لائق خلافت سمجھنا قرآن و سنت اور تصریحات اسلاف امت کے خلاف ہے۔

کیا معاویہ کو اختیار (پسند) کیا گیا تھا؟

بعض متاخرین ہند نے کہیں تو یہ لکھا:

”امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگر خلافت کے اہل نہ ہوتے (تو) امام مجتبیٰ ہرگز

انہیں تفویض نہ فرماتے۔“

جیسا کہ پہلے بھی یہ جملہ نقل ہو چکا ہے، اور کہیں سوالیہ انداز میں یوں لکھا:

”اگر مدت خلافت ختم ہو چکی تھی اور آپ بادشاہت منظور نہیں فرماتے تو صحابہ حجاز میں

کوئی اور قابلیتِ نظم و نسق دین نہ رکھتا تھا جو انہیں کو اختیار کیا؟“

(فتاویٰ رضویہ ج ۲۹ ص ۳۷۸)

ان دو مقامات پر بعض متاخرین ہند کا لفظ ”تفویض“ اور لفظ ”اختیار“ استعمال کرنا درست نہیں ہے،

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے معاویہ کو اقتدار تفویض نہیں کیا تھا بلکہ مجبوراً دست بردار ہوئے تھے، اور اسی طرح

انہوں نے معاویہ کو اختیار بھی نہیں کیا تھا۔ لفظ اختیار کا معنی ہے:

”جن لینا اور انتخاب کرنا۔“

(مصباح اللغات للبلیاوی ص ۲۲۵)

کسی چیز کا چناؤ اور انتخاب مختلف چیزوں میں سے ہوتا ہے، امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے متعدد صحابہ اور

تابعین کرام علیہم السلام میں سے معاویہ کو نہ تو چنا تھا اور نہ ہی اُسے منتخب کیا تھا لیکن تعجب ہے کہ اعلیٰ حضرت ایسے

زیرک انسان بھی امام حسن علیہ السلام کی مجبوری کو چناؤ اور انتخاب تصور کر بیٹھے اور یہاں تک لکھ دیا:

”صحابہ حجاز میں کوئی اور قابلیتِ نظم و نسق دین نہ رکھتا تھا جو انہی کو اختیار کیا؟“

میں کہتا ہوں: یقیناً اُس وقت حجاز مقدس وغیرہ مقامات پر جلیل القدر صحابہ کرام علیہم السلام حیات تھے، مثلاً

نبی کریم ﷺ کے ماموں سیدنا سعد بن ابی وقاص، سیدنا عمر کے چچا زاد سیدنا سعید بن زید (دونوں سابقین

اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں) ترجمان القرآن اور حبر الامہ سیدنا ابن عباس، پیکر زہد و رعب ابن عمر، میزبانِ

رسول سیدنا ابوالیوب انصاری، خادم رسول سیدنا انس، بے باک اور حق گو صحابی عبدالرحمان بن ابی بکر، وغنائین

(دو بھاری علموں) کے امین حضرت ابو ہریرہ وغیرہم علیہم السلام موجود تھے، لیکن ان میں سے کسی کو بھی بادشاہ بنانے

سے فتنہ ختم نہ ہوتا، کیونکہ جو شخص امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں مسلح لشکر لے کر آیا تھا، اُس کا منشا یہ نہیں تھا

کہ امام حسن کی جگہ کسی دوسرے شخص کو منتخب کیا جائے بلکہ وہ خود ہی کو مکمل اقتدار پر دیکھنا چاہتا تھا، اس لیے امام پاک نے تحفظِ مسلمین کی خاطر مجبوراً اقتدار اُس کو دے دیا۔

اقتدار کے لیے معاویہ کی تیاریاں اور کوششیں

معاویہ بن ابی سفیان مدتوں سے اقتدار کے لیے پرتول رہے تھے حتیٰ کہ ایسے آثار بھی ملتے ہیں کہ وہ شیخینِ کریمین رضی اللہ عنہما کے وقت سے اقتدار کی تیاریوں میں تھے۔ چنانچہ امام نعیم بن حماد لکھتے ہیں:

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سِيرِينَ قَالَ: وَاللَّهِ إِنِّي لَأَرَاهُ كَانَ يَصْنَعُ لَهَا - يَعْنِي مُعَاوِيَةَ - عَلَى عَهْدِ أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا - يَنْعِي لِلْخِلَافَةِ.

”محمد بن سیرین رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں: اللہ کی قسم! میں سمجھتا ہوں کہ معاویہ سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے دور میں خلافت کے لیے تیاری کرتے تھے۔“

(کتاب الفتن ص ۱۲۸)

اس بات کا خدشہ خلیفہ ثانی سیدنا عمر بن خطاب رحمہ اللہ کو بھی تھا، چنانچہ وہ فرماتے تھے:

يَا أَصْحَابَ رَسُولِ اللَّهِ اتَّصَحُّوا ، فَإِنَّكُمْ إِن لَّا تَفْعَلُوا غَلَبَكُمْ عَلَيْهَا يَعْنِي الْخِلَافَةَ ، مِثْلُ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ وَمُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِي سُفْيَانَ .

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیو! باہم اتحاد رکھو، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو خلافت کے معاملہ میں عمرو بن العاص اور معاویہ بن ابوسفیان تم پر غالب آجائیں گے۔“

(کتاب الفتن ص ۱۲۸)

اگر کسی شخص کو امام نعیم بن حماد کی روایت میں تردد ہو تو ہم اُسے درج ذیل عبارت میں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ محدث ابو یوسف یعقوب بن سفیان فسوی حضرت عثمان بن عفان رحمہ اللہ کے رضاعی بھائی اور مصر کے گورنر عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے حالات میں لکھتے ہیں:

حَدَّثَنِي حَرْمَلَةُ قَالَ: أَخْبَرَنَا ابْنُ وَهَبٍ عَنِ ابْنِ لُهِيعَةَ عَنْ يَزِيدَ بْنِ أَبِي حَبِيبٍ قَالَ: أَقَامَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ سَعْدٍ بِعَسْقلَانَ ، بَعْدَ قَتْلِ عُثْمَانَ ، وَكَمَرَةٍ

أَنْ يَكُونَ مَعَ مُعَاوِيَةَ ، وَقَالَ : لَمْ أَكُنْ لِأَجْمَاعٍ رَجُلًا قَدْ عَرَفْتُهُ ، إِنَّهُ كَانَ يَهْوِي قَتْلَ عُثْمَانَ ، فَكَانَ بِهَا حَتَّى مَاتَ .

”مجھے حرمہ نے بیان کیا، انہوں نے کہا: ہمیں ابن وہب نے از ابن لہیعہ از یزید بن ابی حبیب روایت کیا کہ عبداللہ بن سعد بن ابی مروح، سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد عسقلان میں رہنے لگا اور معاویہ کے ساتھ رہنا پسند نہ کیا اور کہا: میں اُس شخص کے ساتھ نہیں رہوں گا جس کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کا خواہاں تھا، پھر وہ عسقلان میں ہی وفات پا گیا۔“

(المعرفة والتاريخ للفسوي ج ۱ ص ۱۰۲، وط: ج ۱ ص ۲۵۴؛ تاریخ دمشق ج ۲۹ ص ۴۲؛ سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۳۵)

اس سند میں پانچ راوی ہیں: ان میں سے ہر ایک کے متعلق علماء جرح و تعدیل کے اقوال کا خلاصہ ذہن میں رکھئے تاکہ کوئی بدویانت شخص ان میں سے کسی کے بارے میں فقط جرح لقل کر کے اس اثر (قول صحابی) پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش نہ کرے۔ تعجب کی بات ہے کہ آج کل بعض ایسے لوگ مجھ عاجز کی کتب میں درج شدہ احادیث پر جرح کے شوق میں ہیں جن کی اپنی دینی دکان داری کی چمک دمک ہی موضوع روایات اور تھوٹے خوابوں پر موقوف ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے:

سورج میں لگے دھبہ، فطرت کے کرشمے ہیں
بت ہم کو کہیں کافر، اللہ کی مرضی ہے

بہر حال درج بالا روایت کے پہلے راوی یہ ہیں:

۱۔ حرمہ بن یحییٰ ابو حفص نجیبی مصری، حافظ نے ان کے متعلق لکھا ہے: ”صدوق“ (سچا ہے)۔

(تقریب التہذیب ص ۲۲۹)

۲۔ عبداللہ بن وہب بن مسلم القرشی المصري، حافظ ان کے متعلق لکھتے ہیں:

الْفَقِيْهُ ، يَقُوْلُ حَالِظًا عَابِدًا .

”یہ فقیہ، ثقہ، حافظ اور عابد تھے۔“

(تقریب التہذیب ص ۵۵۶)

۳۔ عبد اللہ بن لہیعہ: حافظ ان کے متعلق لکھتے ہیں:

”عبد اللہ بن لہیعہ بن عقبہ حضرمی ابو عبد الرحمن مصری، یہ قاضی اور صدوق ہیں۔
ساتویں طبقہ سے ہیں، یہ اپنی کتابوں کے محل جانے کے بعد غلط کا شکار ہو گئے تھے۔
ان سے ابن المبارک اور ابن وہب جو روایت کریں وہ دوسرے راویوں کی بنسبت
زیادہ بہتر ہوتی ہے۔ ان کا وصال ۷۷ھ میں ہوا تھا۔“

(تقریب التہذیب ص ۵۳۸)

ذہن نشین رہے کہ مذکورہ قول ان سے ابن وہب نے روایت کیا ہے۔

وکتور بشار عماد معروف اور شیخ شعیب الارزوطی حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ سے قدرے اختلاف

کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بَلْ ضَعِيفٌ يُعْتَبَرُ بِهِ ، وَحَدِيثُهُ صَحِيحٌ إِذَا رَوَى عَنْهُ الْعَبَادِلَةُ : ابْنُ
الْمُبَارَكِ ، وَابْنُ وَهْبٍ ، وَابْنُ يَزِيدَ الْمُقْرِي ، وَابْنُ مُسْلِمَةَ الْقَعْنَبِيِّ ،
فَإِنَّهُمْ كَانُوا يَتَّبِعُونَ أَصُولَهُ فَيَكْتُبُونَ مِنْهَا .

”بلکہ ضعیف ہے تاہم اس پر اعتبار کیا جاتا ہے، اور جب اس سے عبادلہ (چار
عبد اللہ نامی حضرات) روایت کریں تو اس کی حدیث صحیح ہے: عبد اللہ ابن المبارک،
عبد اللہ بن وہب، عبد اللہ بن یزید مقری اور عبد اللہ بن مسلمہ قعنبی۔ یہ حضرات ان کی
کتب کو کھنگالنے کے بعد ان سے لکھا کرتے تھے۔“

(تحریر تقریب التہذیب ج ۲ ص ۲۵۸)

اور یاد رہے کہ درج بالا اثر عبد اللہ بن وہب سے روایت کیا گیا ہے۔

۴۔ یزید بن ابی حبیب مصری: حافظ ان کے متعلق لکھتے ہیں:

بَقَّةٌ فُقِيَّةٌ وَكَانَ يُرْسِلُ ، مِنْ الْخَامِسَةِ .

”ثقفہ ہیں، فقیہہ ہیں اور ارسال کرتے تھے، پانچویں طبقہ سے ہیں۔“

(تقریب التہذیب ص ۱۰۷۳)

۵۔ پانچویں راوی خود ”المعرفة والتاريخ“ کے مصنف ہیں، یعنی محدث یعقوب بن سفیان القسوی۔

حافظ رحمۃ اللہ علیہ ان کے متعلق لکھتے ہیں:

بَقَّةٌ حَافِظٌ .

”ثقفہ حافظ تھے۔“

(تقریب التہذیب ص ۱۰۸۸)

چونکہ اس روایت کے تمام راوی ثقہ یا صدوق ہیں اسی لیے حافظ ذہبی جیسے نقاد محدث نے بھی ایسی حساس ترین روایت پر کوئی تنقید نہیں کی۔ ہاں اگر کوئی شخص یزید بن ابی حبیب مصری کے مرسل ہونے کے حوالہ سے معترض ہو تو اسے یاد رکھنا چاہیے کہ ثقہ راوی کی مرسل روایت قبول کی جاتی ہے، خصوصاً احناف کے نزدیک اس مسئلہ میں بہت وسعت پائی جاتی ہے۔

نزاکتِ حالات اور امامِ پاک کی دست برداری

امام محمد بن سیرین، فاروقی اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور عبد اللہ بن سعد کے اقوال کو ملا کر ذرا غور فرمائیے کہ ابنِ صخر کو اقتدار کتنا محبوب تھا اور وہ کب سے اس کے لیے کوششیں کر رہے تھے؟ کیا امام حسن مجتبیٰ رحمۃ اللہ علیہ ایسی مدبر ہستی پر اُن کی یہ ہوس غفنی رہ سکتی تھی؟ کیا انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ جو شخص اتنے عرصہ سے اقتدار کے لیے پاپڑ بیل رہا ہے وہ اپنے سوا کسی اور شخص کے منتخب کرنے پر راضی ہوگا؟ یقیناً امامِ پاک رحمۃ اللہ علیہ ایسے امور سے بے خبر نہیں تھے اسی لیے انہوں نے حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے شخصِ جاہلین کے اہل اسلام کے تحفظ کی خاطر مستقبل کی مملکت کو اُن پر چھوڑنا گوارا کر لیا۔ اس کے باوجود بھی اگر کوئی شخص امامِ پاک کی مجبوری سے اہلیتِ معاویہ ثابت کرنے پر بضد ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ امامِ پاک کے نزدیک درج بالا تمام صحابہ کرام رحمۃ اللہ علیہم معاویہ کے مقابلہ میں ظلم و ستم دین کے حوالہ سے نا اہل تھے۔ سیدنا امام حسن مجتبیٰ رحمۃ اللہ علیہ ایسے فہیم و مدبر کے بارے

میں ایسا تصور کرنا بھی کتاب و سنت اور نبوی تربیت کے منافی ہے۔

بعض اکابر کی تضاد بیانی

مذکورہ بالا سطور میں تو بعض علماء ہند نے امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی اضطراری دست برداری کو تقویٰ و اختیار سے تعبیر کیا لیکن اُن کے کلام کے بعض جملوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ دست برداری مجبوری کی بنا پر تھی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

”بیشک امام مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلافت سپرد فرمائی، اور اس سے صلح و بندش جنگ مقصود تھی۔“

(فتاویٰ رضویہ ج ۲۹ ص ۳۳۷)

حقیقت بھی یہی ہے اور حق بھی یہی ہے کہ امام پاک کے مد نظر معاویہ کی اہلیت نہیں تھی بلکہ اُن کے مد نظر فقط خونِ مسلمین کا تحفظ تھا۔ چنانچہ علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ بخاری کی حدیث کی تشریح سے حاصل شدہ فوائد کے بیان میں لکھتے ہیں:

وَمَنْقَبَةُ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ لِأَنَّهُ تَرَكَ الْخِلَافَةَ لَا لِغِلَّةٍ وَلَا لِلدُّلَةِ وَلَا لِغِلَّةٍ
بَلْ لِحَقِّ دِمَاءِ الْمُسْلِمِينَ.

”اور اس میں سیدنا امام حسن بن علی علیہ السلام کی فضیلت ہے، اس لیے کہ انہوں نے خلافت کو کسی کمزوری، ذلت اور عددی قلت کے بغیر محض خونِ مسلمین کی خاطر چھوڑ دیا۔“

(عمدة القاري ج ۲۴ ص ۳۰۹)

علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

فَقَدْ تَرَكَ الْحَسَنُ الْمُلْكَ وَرَعَا وَرَغْبَةً فِيمَا عِنْدَ اللَّهِ ، وَلَمْ يَكُنْ
ذَلِكَ لِغِلَّةٍ وَلَا لِغِلَّةٍ وَلَا لِلدُّلَةِ بَلْ صَالَحَ مُعَاوِيَةَ رِعَايَةً لِلدِّينِ وَتَسْكِينًا
لِلْفِتْنَةِ وَحَقَّنَ دِمَاءَ الْمُسْلِمِينَ.

”پس امام حسن علیہ السلام نے ملک کو تقویٰ اور عند اللہ اجر کی امید میں ترک کر دیا، اُن

کا ترک کرنا کسی کمزوری، قلت اور ذلت کے بغیر تھا بلکہ انہوں نے معاویہ کے ساتھ صلح رعایت دین، فتنہ کو دبانے اور مسلمانوں کے خون کی حفاظت کے لیے کی تھی۔

(ارشاد الساری ج ۱ ص ۵۶)

چند محدثین کرام کا تکلف

متعدد شارحین نے اس حدیث سے ایک اور فائدہ مستنبط کرنے کی بھی کوشش کی ہے، اور وہ یہ ہے:

وَفِي الْحَدِيثِ أَيْضًا وَدَلَالَةٌ عَلَى رَأْفَةِ مُعَاوِيَةَ بِالرَّعِيَّةِ وَشَفَقَتِهِ عَلَى الْمُسْلِمِينَ.

”نیز اس حدیث میں رعایا پر معاویہ کی رافت اور مسلمانوں پر ان کی شفقت کی بھی دلیل ہے۔“

(ارشاد الساری ج ۱ ص ۵۶؛ فتح الباری ج ۱۶ ص ۵۳۵؛ الإذاعة لما كان وما يكون بين يدي الساعة للفقوجي ص ۷۴)

نواب سید صدیق حسن قنوجی نے بھی بلاسوچے سمجھے اسی طرح لکھ دیا ہے۔

شارحین کا یہ استنباط سراسر مردود و باطل ہے، اس لیے کہ معاویہ کو اگر اقتدار نہ ملتا تو انہوں نے آرام سے نہیں بیٹھنا تھا، اسی لیے تو سیدنا علی ؑ نے فرمایا تھا کہ اگر معاویہ کی امارت کو ناپسند کیا گیا تو اندرائن کی طرح گردنیں کٹ کٹ کر گریں گی۔ شارحین جس حدیث کی تشریح فرما رہے ہیں، خود اس حدیث کے یہ الفاظ ”لَعَلَّ اللَّهَ أَنْ يُصْلِحَ بِهِ“ بھی ان کے مستنبط شدہ دلیل کے منافی ہیں۔ اس حدیث میں اگر معاویہ کی بھی فضیلت ہوتی تو نبی کریم ﷺ ”لَعَلَّ اللَّهَ أَنْ يُصْلِحَ بِهِمَا“ فرماتے۔ اگر معاویہ بھی مسلمانوں پر مشفق و مہربان تھے اور سیدنا امام حسن مجتبیٰ ؑ بھی رعایا پر مشفق و مہربان تھے تو پھر مسلمانوں کے خون کی پامالی کا خدشہ کس کی طرف سے تھا؟ اگر سیدنا امام حسن ؑ اقتدار سے دست بردار نہ ہوتے تو کیا معاویہ اپنے مسلح لشکر کو لے کر چپ چاپ واپس چلے جاتے؟ کیا وہ کسی ظالم کے چنگل سے امت کی جان چھڑانے آئے تھے کہ وہ رعایا کے حق میں مشفق و رؤوف ہو گئے؟ کیا انہیں امت کا غم کھائے جا رہا تھا کہ جگر گوشہ

مصطفیٰ ﷺ کے مقابل لشکر لے کر آگئے تھے؟ امام حسن علیہ السلام کے مطابق وہ محض اقتدار کی خاطر آئے تھے اور امام پاک نے انہیں اُن کا مطلوب دے کر امت پر شفقت فرمائی تھی۔ چنانچہ علامہ ابن بطل لکھتے ہیں:

وَقَالَ الْحَسَنُ: اتَّقِ اللَّهَ يَا مُعَاوِيَةَ اَعْلَىٰ أُمَّةٍ مُّحَمَّدٍ، لَا تَفِيضُهُمْ
بِالسَّيْفِ عَلَىٰ طَلَبِ الدُّنْيَا وَغُرُورِ قَائِمَةٍ زَائِلَةٍ، فَسَلَّمَ الْحَسَنُ الْأَمْرَ إِلَىٰ
مُعَاوِيَةَ.

”امام حسن علیہ السلام نے فرمایا: معاویہ! امت محمد ﷺ کے معاملہ میں خدا کا خوف
کرا! انہیں دنیا طلبی اور فانی وزائل ہو جانے والے غرور کی خاطر فتنہ کر، پھر امام حسن
نے امر خلافت معاویہ کے سپرد کر دیا۔“

(شرح ابن بطل علی البخاری ج ۸ ص ۹۷)

دنیا طلبی، جگر گوشہ مصطفیٰ ﷺ کے مقابلہ میں لشکر کشی اور پھر رعایا پر شفقت، بھلا ان باتوں کا آپس
میں کوئی تعلق بھی ہے؟

یہاں میں ایک مرتبہ پھر اُس حدیث میں غور و فکر کرنے کی دعوت دوں گا جس میں اُن دو خواتین کا
ذکر ہے جن میں سے ایک کے بچے کو بھینٹ لیا کھا گیا تھا تو دوسرے بچے پر دونوں جھگڑنے لگی تھیں اور مقدمہ
حضرت داود علیہ السلام کے پاس لے کر گئی تھیں، انہوں نے دونوں کے دلائل سننے کے بعد بڑی کے حق میں
فیصلہ دے دیا تھا جبکہ درحقیقت بچہ چھوٹی عورت کا تھا۔ جب وہ دونوں حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے سے
گذریں اور انہوں نے اُن سے فیصلہ کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہونے پر فرمایا کہ چھری لے آؤ تاکہ
ہم اس بچے کے دو ٹکڑے کر دیں، آدھا تیرا اور آدھا بڑی عورت کا۔ اس پر بڑی عورت تو خاموش رہی لیکن
چھوٹی چلا اٹھی اور اُس نے عرض کیا: نہیں، اس کے دو ٹکڑے مت فرمائیے، میں اپنا حصہ بھی اپنی مد مقابل
عورت کو دیتی ہوں۔ (بخاری) بتائیے! بچے کے حق میں سراپا شفقت و رافت بڑی عورت ہوئی یا چھوٹی؟
ظاہر ہے کہ چھوٹی عورت سراپا شفقت و رافت تھی، اسی طرح صلح امام حسن علیہ السلام میں امت کے حق میں سراپا
شفقت و رافت وہ شخص نہیں تھا جس کی عمر بڑی تھی بلکہ وہ اہل جنت کا سردار تھا جس کی عمر تو اپنے مخالف سے

چھوٹی تھی مگر اُس کی قربانی اور عزت بڑی تھی۔

افسوس ہے کہ ہمارے شارحین کرام بات بنے یا نہ بنے مستبعد شدہ فوائد کے نام پر کچھ نہ کچھ لکھ ہی دیتے ہیں۔

اقتدار چھوڑنے کی وجہ خود امام پاک کی قربانی

امام طبرانی، امام بیہقی اور حنفی ابن حجر عسقلانی سند کے ساتھ لکھتے ہیں کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے خلافت سے دست برداری کے بعد دلی تقریر میں ارشاد فرمایا:

وَإِنْ هَذَا الْأَمْرَ الَّذِي اخْتَلَفْتُ فِيهِ أَنَا وَمُعَاوِيَةُ إِمَّا كَانَ حَقًّا تَرَكْتُهُ
لِمُعَاوِيَةَ إِذَا دَعَا صَلاَحَ هَذِهِ الْأُمَّةِ أَوْ يَكُونُ حَقًّا كَانَ لِأَمْرِي بِأَحَقِّ بِهِ مِنِّي
فَفَعَلْتُ ذَلِكَ ﴿وَإِنْ أُذِرِّي لَعَلَّهُ لِنَسَةِ لَكُمْ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ﴾ (فِي دَلَائِلِ
النُّبُوَّةِ) ثُمَّ اسْتَغْفَرَ وَنَزَلَ.

”یہ معاملہ جس میں میں نے اور معاویہ نے اختلاف کیا ہے، یہ میرا حق ہے تو میں نے اصلاح امت کی خاطر معاویہ کے لیے چھوڑ دیا، یا یہ کسی اور شخص کا حق ہے جو مجھ سے زیادہ مستحق ہے تب بھی میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ ﴿اور میں کیا جانوں شاید وہ تمہاری جانچ ہو اور ایک وقت تک سامانِ حیات﴾ پھر استغفار پڑھا اور نیچے اتر آئے۔“

(أخبار الحسن للطبرانی ص ۳۹، ۴۰؛ حدیث ۳۵؛ دلائل النبوة ج ۶ ص ۴۴۴؛ مرآة الزمان ج ۷

ص ۱۰، فتح الباری ج ۱۶ ص ۵۲۹؛ موسوعة الحافظ ابن حجر العسقلانی ج ۶ ص ۳۳۶)

سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے استغفار کیوں کیا؟ اس لیے کہ انہیں بعض طلقاء کو ملک سونپنا پڑا جو کہ جائز نہیں تھا مگر مجبوری کے عالم میں بعض ممنوعات بھی جائز ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ تاتہی شاء اللہ پانی پنی رہے اللہ علیہ اسی مسئلہ میں گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الضَّرُورَاتُ تَبِيحُ الْمَحْذُورَاتِ انْعِقَادِ اجْمَاعِ بِرِ خِلَافَتِ

معاویہ۔ برائے دفع فتنہ شدہ است۔

”ضرورتیں ممنوعات کو جائز بنا دیتی ہیں، اور معاویہ کی خلافت پر اجماع کا انعقاد فتنے کو دفع کرنے کے لیے تھا۔“

(السيف المسلول ص ۲۰۷)

سو چونکہ یہ عمل اُن کے اعلیٰ و ارفع مقام کے خلاف بھی تھا اور پھر انہیں کرنا بھی پڑ گیا تھا، اسی لیے انہوں نے اس پر بارگاہِ الہی میں استغفار کیا۔ امام پاک کے اس اضطراری عمل کو دلیل بنانا کہ بعض طلقاء اُن کے نزدیک پسندیدہ تھے محض عدم تدبیر پر ہی مبنی نہیں بلکہ سراسر عقل کے خلاف ہے۔ آئیے! خود امام پاک علیہ السلام سے ہی پوچھ لیتے ہیں کہ اُن کے نزدیک مقام معاویہ کیا تھا؟ معاہدہ لکھے جانے کے بعد جب امام پاک دستبردار ہو کر عازمِ مدینہ ہوئے تو معاویہ بن ابی سفیان کو خیال آیا کہ انہیں خوارج کے خلاف جنگ کے لیے بھیجا جائے، لیکن امام پاک علیہ السلام نے انہیں فرمایا: میرے نزدیک خوارج کی بجائے تمہارے خلاف جنگ کرنا زیادہ بہتر ہے۔ چنانچہ امام ابوالعباس المہر دیکھتے ہیں:

ثُمَّ خَرَجَ الْحَسَنُ يُرِيدُ الْمَدِينَةَ فَوَجَّهَ إِلَيْهِ مُعَاوِيَةُ وَقَدْ تَجَاوَزَ فِي طَرِيقِهِ
يَسْأَلُهُ أَنْ يَكُونَ الْمُتَوَلَّى لِمُخَارَبَتِهِمْ ، فَقَالَ الْحَسَنُ : وَاللَّهِ لَقَدْ كَفَفْتُ
عَنْكَ لِحَقْنِ دِمَاءِ الْمُسْلِمِينَ ، وَمَا أَحْسِبُ ذَلِكَ يَسْعُنِي ، أَلَا لَأَبْلُ
عَنْكَ قَوْمًا ، أَنْتَ وَاللَّهِ أَوْلَى بِالْقِتَالِ مِنْهُمْ .

”پھر امام حسن علیہ السلام عازمِ مدینہ ہوئے تو معاویہ اُن کے پیچھے گئے جبکہ امام پاک کافی راستہ طے کر چکے تھے، انہوں نے امام پاک سے درخواست کی کہ وہ خوارج کے خلاف جنگ کے سپہ سالار بنیں تو امام حسن علیہ السلام نے فرمایا: خدا کی قسم! میں نے تو تجھ سے بھی فقط خونِ مسلمین کے تحفظ کی خاطر ہاتھ روکا ہے، میں اس کام کو مناسب نہیں سمجھتا، کیا میں تیرے دفاع میں ایک قوم کو قتل کروں؟ اللہ کی قسم! اُن کی بہ نسبت تجھ سے جنگ کرنا زیادہ بہتر ہے۔“

(الکامل فی اللغة والأدب ص ۵۷۷، وط: ج ۳ ص ۷۰)

اس عبارت میں بار بار غور فرمائیے کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے معاویہ کو کیا فرمایا اور کیوں فرمایا کہ خوارج کی بجائے تجھ سے جنگ کرنا بہتر ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ کسی سے مجبوراً صلح کرنا اور بات ہوتی ہے اور اُس شخص کا پسندیدہ ہونا اور بات ہوتی ہے۔ اس عبارت میں یہ لفظ انتہائی قابل توجہ ہے: ”أَفَأَقْبَلُ عَنْكَ قَوْمًا“ (کیا میں تیرے دفاع میں ایک قوم کو قتل کروں؟) معلوم ہوا کہ اُس وقت خوارج کے خلاف جنگ کرنا امام پاک علیہ السلام کے نزدیک اسلامی جہاد نہیں رہا تھا بلکہ وہ فقط دفاع معاویہ بن چکا تھا، حالانکہ صحیح احادیث کی رو سے جب خوارج مولانا علی علیہ السلام کے مد مقابل تھے تو پھر انہیں نہ تیغ کرنا واجب تھا اور آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر میں انہیں پاتا تو قوم عادی کی طرح قتل کر دیتا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ معاویہ اور خوارج دونوں اہل قبلہ تھے مگر امام پاک کے نزدیک خوارج معاویہ سے اتنے زیادہ برے نہیں تھے کہ اُن سے معاویہ کی خاطر جنگ کی جاتی، البتہ اگر اسلامی دفاع اور مسلمانوں کا اجتماعی مفاد وابستہ ہوتا تو اور بات ہوتی۔

امام پاک کے سامنے دو مصیبتیں تھیں

مصیبت چھوٹی ہو یا بڑی، مصیبت ہی ہوتی ہے اور مصیبت بہر حال پسندیدہ نہیں ہوتی، لیکن قاعدہ یہ ہے کہ فرد یا قوم کے سامنے جب ایسی صورت آجائے کہ اُن کا بیک وقت دونوں مصیبتوں سے بچنا مشکل ہو تو عقل و دانش کو کام میں لاتے ہوئے بڑی مصیبت سے جان چھڑائی جاتی ہے اور چھوٹی مصیبت کو بادلِ ناخواستہ برداشت کیا جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ محمد بن ابراہیم ابن الوزیری مانی لکھتے ہیں:

وَلَمْ يَزَلِ الْعُقَلَاءُ يَذْفَعُونَ الْمَضْرُوءَ الْعَظْمَى بِمَا ذُوْنَهَا.

”ہمیشہ سے اہل دانش بڑی مصیبت کو اُس سے چھوٹی سے ٹالتے آئے ہیں۔“

(العواصم والقواصم لابن الوزیری ج ۸ ص ۱۷۶)

گزشتہ سطور میں جو دو عورتوں کا واقعہ نقل کیا گیا ہے ذرا اُس میں غور فرمائیں کہ چھوٹی عورت جو بچے کی حقیقی ماں تھی وہ کیوں بڑی عورت کے حق میں اپنے بچے سے دست بردار ہونے کو تیار ہو گئی تھی؟ اس لیے کہ سیدنا سلیمان علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ چھری لاؤ تاکہ میں اس بچے کے دو حصے کر دوں۔ اب چھوٹی خاتون

کے سامنے دو مصیبتیں تھیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنا بچہ دوسری عورت کو دے دے۔ دوسری یہ کہ وہ اپنے بچے کے کٹ جانے اور اُس کے دو ٹکڑے ہو جانے کے لیے تیار ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں مصیبتوں میں سے جو مصیبت چھوٹی تھی اُس عورت نے اُسے قبول کر لیا اور اپنا لختِ جگر بڑی عورت کو تفویض کرنے پر آمادہ ہو گئی۔

سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے سامنے بھی دو مصیبتیں تھیں۔ ایک یہ کہ وہ ایک ظالم اور نا اہل شخص کے حق میں دست بردار ہوں جو کہ جائز نہیں تھا۔ دوسری یہ کہ دست بردار نہ ہوں اور جنگ کے لیے تیار ہوں، سو چونکہ پہلی مصیبت دوسری مصیبت کے مقابلہ میں چھوٹی تھی اس لیے امام پاک نے پہلی مصیبت کو بدلہ خواستہ برداشت کر لیا اور اپنے حق سے دست بردار ہو گئے۔

بعینہ یہی صورتِ حال مذکورہ بالا حدیث میں بیان فرمائی گئی ہے۔ چھوٹی عورت جو بچے کی حقیقی ماں تھی اُس کے سامنے بھی دو مصیبتیں تھیں: ایک یہ کہ وہ اپنا لختِ جگر بڑی عورت کے سپرد کر دے، دوسری یہ کہ وہ اپنے لختِ جگر کے دو ٹکڑے کر دینے پر تیار ہو جائے۔ سو چونکہ ان میں سے پہلی مصیبت دوسری مصیبت کے مقابلہ میں چھوٹی تھی اسی لیے وہ اپنا لختِ جگر بڑی عورت کو دینے پر تیار ہو گئی تھی۔

یہاں اپنی عقلی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے بتائیے کہ اگر کوئی شخص اس سے یہ نکتہ پیدا کرنے کی کوشش کرے کہ چھوٹی عورت اپنا لختِ جگر بڑی عورت کو تفویض کرنے پر اس لیے تیار ہو گئی تھی کہ اُس کے نزدیک بڑی عورت اہل اور پسندیدہ تھی تو کیا ایسی نکتہ آفرینی کو عقل مندی کہا جاسکتا ہے؟

امام پاک کو صلح پسند تھی یا معاویہ؟

آپ جان چکے ہیں کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے تحفظِ خونِ مسلمین کی خاطر معاویہ کو اقتدار سپرد کیا اور اُن کے ساتھ صلح کی لیکن اُن کے ساتھ جنگ کرنا خوارج کے ساتھ جنگ کرنے سے بھی زیادہ بہتر سمجھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اُن کے نزدیک خونِ مسلمین کی حفاظت کی خاطر صلح تو پسند تھی مگر انہوں نے جس شخص کے ساتھ صلح کی تھی وہ اُن کے نزدیک پسندیدہ نہیں تھا۔ بعض علماء نے اس صلح کو معاویہ کی صلاحیت و اہلیت کی دلیل سمجھ لیا ہے۔ چنانچہ بعض متاخرین علماء ہند لکھتے ہیں:

”بیشک امام مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلافت سپرد فرمائی، اور اس سے صلح و بندش جنگ مقصود تھی اور یہ صلح و تفویض خلافت اللہ و رسول کی پسند سے ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ (وآلہ) وسلم نے امام حسن کو گود میں لے کر فرمایا تھا: ان ابنی هذا سيد ولعل الله ان يصلح به بين فتيين عظيمين من المسلمين (میرا یہ بیٹا سید ہے میں امید کرتا ہوں کہ اللہ اس کے سبب سے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرا دے گا) امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگر خلافت کے اہل نہ ہوتے (تو) امام مجتبیٰ ہرگز انہیں تفویض نہ فرماتے، نہ اللہ و رسول اسے جائز رکھتے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔“

(فتاویٰ رضویہ ج ۲۹ ص ۳۳۷)

اگر اس اقتباس کی پہلی ساڑھے پانچ سطور کو دیکھا جائے تو صلح کا پسند ہونا ظاہر ہوتا ہے، لیکن بعد والی دو سطور کو ملا کر پڑھا جائے تو پھر معلوم ہوتا ہے کہ صاحب فتاویٰ رضویہ اس صلح سے صلح کی فضیلت نہیں بلکہ معاویہ کی صلاحیت و اہلیت مراد لے رہے ہیں، اور علامہ امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی سمجھا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات حدیث ”إِنْ أَنْبِئُ هَذَا سَيِّدًا“ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وَبِهِ ظَهَرَ أَنَّ الطُّغْنَ عَلَى الْأَمِيرِ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ طَعَنَ عَلَى الْإِمَامِ الْمُجْتَبَى ، بَلْ عَلَى بَحْدِهِ الْكَرِيمِ صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، بَلْ عَلَى رَبِّهِ ﷺ .

”امیر معاویہ پر طعن کرنے والا حقیقتہً حضرت امام حسن مجتبیٰ بلکہ حضور سید عالم صلی

اللہ تعالیٰ علیہ (وآلہ) وسلم بلکہ حضرت عزت جل و علا پر طعن کرتا ہے۔“

(المعتمد المستند شرح المعتقد المتقد ص ۲۴۲ حاشیہ نمبر ۳۱۹؛ ترجمہ: بہار شریعت ج ۱)

(الف ص ۲۵۹)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ ان دونوں حضرات نے بھی اور علماء حنفیہ و متاخرین میں سے جس

نے بھی اس صلح سے اہلیت و صلاحیت معاویہ کی دلیل اخذ کی ہے، سب غلط فہمی کا شکار ہیں۔ اس لیے کہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ سیدنا عمر، سیدنا علی، ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ، سیدنا ابن عباس، سیدنا عمار بن یاسر، سیدنا عبدالرحمان بن عثمان اشعری اور سیدنا صعصعہ بن صوحان رضی اللہ عنہ، طلقاء کو خلافت کے لیے اہل نہیں سمجھتے تھے۔ خود سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ بھی معاویہ کو اہل نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے صلح کے بعد معاویہ کو واشگاف الفاظ میں فرمادیا تھا کہ تیرے خلاف جنگ کرنا خوارج کے خلاف جنگ کرنے سے بہتر ہے مگر میں خون مسلمین کی خاطر پیچھے ہٹ گیا ہوں، حتیٰ کہ امام پاک نے شرائط صلح طے کر لینے کے بعد جو خطاب فرمایا تھا اُس میں بھی انہوں نے جہاں صلح کی غرض و غایت بیان فرمائی تھی وہیں تعریضاً معاویہ کو فتنہ بھی قرار دیا تھا۔ چنانچہ عمرو بن العاص نے جب معاویہ کو مشورہ دیا کہ وہ اس معاہدہ کے بعد امام حسن سے تقریر کرائیں، اور اس مشورہ سے اُس کی غرض یہ تھی کہ امام پاک پبلک کے سامنے رُسوا ہو جائیں، کیونکہ اُس کا گمان تھا کہ امام پاک پبلک کے سامنے اظہار خیال کی قدرت نہیں رکھتے، لیکن اُس کی یہ چال اُن کے لیے ہی مصیبت بن گئی تھی۔ بہر حال جب امام پاک نے تقریر فرمائی تو اُن کے خطاب کے بعض جملوں سے ابن صحر آگ بگولا ہو گئے تھے اور امام پاک کی فصاحت و بلاغت سے بھرپور فی البدیہہ تقریر سے ابن العاص بھی رُسوا ہوئے تھے۔ چنانچہ ابن عسا کر لکھتے ہیں کہ امام پاک نے خطاب کیا تو اُس میں حمد و ثناء کے بعد فرمایا:

أَيُّهَا النَّاسُ فَإِنَّ اللَّهَ ﷻ هَذَا كُمْ بِأَوَّلِنَا وَخَفَنَ دِمَاءَكُمْ بِآخِرِنَا، وَإِنَّ
لِهَذَا الْأَمْرِ مُدَّةً، وَإِنَّ الدُّنْيَا دُورٌ، وَإِنَّ اللَّهَ قَالَ لِنَبِيِّهِ ﷺ: ﴿وَإِنْ أَدْرِي
أَقْرَبُ أَمْ بَعِيدُ مَا تُوعَدُونَ، إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا
تَكْتُمُونَ، وَإِنْ أَدْرِي لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَكُمْ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ جُيُنَ﴾ فَلَمَّا قَالَهَا أَجْلَسَهُ
مُعَاوِيَةُ، ثُمَّ خَطَبَ مُعَاوِيَةُ ثَمَّ النَّاسَ، فَلَمْ يَزَلْ صَرَّ مَأْ عَلَىٰ عَمْرٍو بْنِ
الْعَاصِ، وَقَالَ: هَذَا مِنْ رَأْيِكَ!

”لوگو! اللہ ﷻ نے ہمارے اولین کے طفیل تمہیں ہدایت دی اور ہمارے آخرین

کے طفیل تمہارے خون کو محفوظ کیا، یہ معاہدہ ایک مدت کے لیے ہے اور دنیا قرار پکڑنے

کی چیز نہیں، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو فرمایا ہے: (اور میں نہیں سمجھتا کہ قریب ہے یا بعید جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو بات تم بلند آواز سے کہتے ہو اور جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو، اور میں کیا جانوں (اس ڈھیل سے) شاید تمہارا امتحان لینا اور ایک وقت تک تمہیں لطف اندوز کرنا مطلوب ہو) جب امام حسن رضی اللہ عنہ نے یہ بات فرمائی تو معاویہ نے انہیں بٹھا دیا، پھر معاویہ نے لوگوں کو خطبہ دیا، پھر وہ مسلسل عمرو بن العاص کو کوستے رہے اور کہتے رہے: یہ ہے تمہاری رائے!۔

(تاریخ دمشق ج ۱۳ ص ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷)

دوسری روایت میں ہے:

”امام حسن رضی اللہ عنہ نے ﴿لَعَلَّه فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ﴾ آیت پڑھتے ہوئے اپنے ہاتھ سے معاویہ کی طرف اشارہ کیا تو معاویہ غضب ناک ہوا، پھر معاویہ نے اُن کے بعد ایک خطبہ دیا جس میں اُس پر موعوبیت نمایاں تھی، پھر منبر سے اتر کر امام حسن رضی اللہ عنہ سے کہنے لگا: ﴿فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ﴾ (تمہارے لیے فتنہ اور سامان) سے تم نے کیا ارادہ کیا تھا؟ امام پاک رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس سے میں نے وہی ارادہ کیا جو اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہے۔“

(سیر اعلام النبلاء للذهبی ج ۳ ص ۲۷۱، ۲۷۲؛ أسد الغابۃ ج ۲ ص ۲۱؛ تاریخ دمشق ج ۱۳ ص

۲۷۵، ۲۷۷؛ البداية والنهاية ج ۸ ص ۴۸)

اس تقریر میں امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ نے آیات کی تلاوت فرما کر جو تعریض فرمائی، اُس میں غور فرمائیے اور خصوصاً اُس منظر کو سامنے لائیے جو انہوں نے ﴿لَعَلَّه فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ﴾ کی تلاوت کے وقت اپنے ہاتھوں سے معاویہ کی طرف اشارہ فرمایا، حتیٰ کہ وہ غضب ناک ہو گیا اور مزید تقریر سے روکنے پر مجبور ہو گیا، اور عمرو بن العاص کو کونسا شروع کر دیا۔ بتلائیے! کیا ایسے ماحول و منظر سے معاویہ کی صلاحیت و اہلیت عیاں ہو رہی ہے؟

در اصل ہم اکابر قاصر رہ گئی، ورنہ اہلیت معاویہ پر طعن سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام پر طعن نہیں بلکہ امام پاک کے اقدام صلح پر طعن امام پاک پر طعن ہے اور امام پر طعن رسول اللہ ﷺ پر طعن ہے اور رسول اللہ ﷺ پر طعن کیا تھا، کیوں کہا تھا؟ فقط اس لیے کہ ان کی توجہ معاویہ کی عدم اہلیت پر مرکوز تھی جبکہ امام پاک علیہ السلام کی توجہ خونِ مسلمین کے تحفظ پر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ امام پاک پر جس کسی نے بھی طعن کیا تھا کسی پر بھی امام پاک ناراض نہیں ہوئے تھے بلکہ اُسے سمجھایا تھا کہ ہم نے یہ صلح معاویہ کی خاطر نہیں کی بلکہ خونِ اہل اسلام کے تحفظ کی خاطر کی ہے۔ چنانچہ سفیان بن اللیل بیان کرتے ہیں: امام حسن بن علی علیہ السلام جب کوفہ سے مدینہ تشریف لائے تو میں نے انہیں کہا:

يَا مُدِلُّ الْمُؤْمِنِينَ! فَكَانَ مِمَّا اخْتَجَّ عَلَيَّ أَنْ قَالَ: سَمِعْتُ عَلِيًّا عَلَيْهِ السَّلَامُ يَقُولُ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: لَا تَذْهَبِ اللَّيَالِي وَالْأَيَّامُ حَتَّى يَجْتَمِعَ أَمْرُ هَذِهِ الْأُمَّةِ عَلَى رَجُلٍ وَاسِعَ الشَّرْمِ، ضَخْمُ الْبَلْعَمِ، يَأْكُلُ وَلَا يَشْبَعُ، وَهَرَّ مُعَاوِيَةُ، فَعَلِمْتُ أَنَّ أَمْرَ اللَّهِ تَعَالَى وَاقِعٌ، وَخِيفْتُ أَنْ تَجْرِيَ بَيْنِي وَبَيْنَهُ الدِّعَاءُ.

”اے مودین المؤمنین! اس پر انہوں نے مجھے دلائل دینا شروع فرمائے، یہاں تک کہ فرمایا: میں نے سیدنا علی علیہ السلام کو فرماتے ہوئے سنا، انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: یہ شبِ دروز ختم نہیں ہوں گے حتیٰ کہ اس امت کا معاملہ ایک ایسے شخص پر جمع ہوگا جو کھلی ناک والا اور وسیع حلق والا ہوگا، جو کھائے گا اور اُس کا پیٹ نہیں بھرے گا، اور وہ معاویہ ہے۔ سو میں نے جان لیا کہ اللہ تعالیٰ کا امر پورا ہونے والا ہے اور میں نے خوف کیا کہ میرے اور اُس کے درمیان خون جاری ہو۔“

۴۳۰ الإشاعة لأشراط الساعة للبرزنجي ص ۵۷

امام نعیم بن حماد کی روایت میں وَاسِعَ الشُّرْمِ کے الفاظ ہیں الشُّرْمِ ناک کے معنی میں بھی آتا ہے، اور حافظ ابن کثیر کے ہاں وَاسِعَ الشُّرْمِ کے الفاظ ہیں اور اس کا معنی ہے: چوڑی سرین [Hips] والا۔ یہی الفاظ زیادہ قرین قیاس ہیں، کیونکہ معاویہ کے حلیہ میں اُن کی ناک کا زیادہ بڑا اور بھدا ہونا نہیں ملتا، البتہ اُن کی سرین کا بڑا ہونا حتیٰ کہ اُن کا اپنی والدہ کے مشابہ ہونا بھی ملتا ہے، اور زیادہ کھانے اور میر نہ ہونے کا ذکر بھی ملتا ہے، اور یہ بات بھی ملتی ہے کہ اُن کا جسم اس قدر بھاری ہو گیا تھا کہ وہ کھڑے ہو کر خطبہ دینے سے قاصر ہو گئے تھے، لہذا ”وَاسِعَ الشُّرْمِ“ کے الفاظ ہی زیادہ صحیح ہیں۔ علامہ محمد بن رسول برزنجی کی تحقیق بھی یہی ہے۔

(الإشاعة لأشراط الساعة ص ۵۷)

یہ تو قحی ایک لفظی توضیح، اصل مقصود اس روایت سے یہ سمجھنا ہے کہ معترض نے اپنے اعتراض میں جس بات کو ہدف تنقید بنایا ہے وہ معاویہ کو اقتدار سپرد کرنا ہے، جیسا کہ امام پاک کے جواب سے عیاں ہے۔ غور کیجئے! امام پاک نے اپنے دلائل میں حدیث نبوی پیش فرما کر اسی بات کو واضح کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ ایک نہ ایک دن معاویہ کے بادشاہ ہونے کا ذکر احادیث میں آچکا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ معترض کو عمل صلح پر نہیں بلکہ معاویہ کو ملک سوئے پر اعتراض تھا۔ اسی لیے امام پاک نے اُس کے اعتراض کو مسترد نہیں کیا بلکہ اُس کے سامنے معاویہ کو ملک سوئے کی وجوہ بیان کیں اور اُس کو مطمئن فرمایا۔ اس سوال و جواب سے یہ حقیقت آشکارا ہو گئی کہ معاویہ پر طعن امام حسن علیہ السلام پر طعن نہیں ہے، البتہ صلح پر طعن امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام پر طعن ہے۔

کیا اقتدار ملنا پسندیدگی کی دلیل ہے؟

اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جو یہ لکھا ہے:

”امیر معاویہ پر طعن کرنے والا حقیقتہً حضرت امام حسن مجتبیٰ بلکہ حضور سید عالم صلی

اللہ تعالیٰ علیہ (وآلہ وسلم بلکہ حضرت عزت جل و علا پر طعن کرتا ہے۔“

اگر اس سے اُن کی مراد معاویہ کو اقتدار ملنا ہے تو بلاشبہ اگر کسی شخص کو اقتدار ملے اور وہ کتاب و سنت کے مطابق عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کرے تو یقیناً یہ بہت بڑی نعمت ہے، حتیٰ کہ بعض احادیث کے مطابق عدل و انصاف کے ساتھ ایک دن کی حکومت ستر سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ لیکن یہ فضیلت اُس شخص کے لیے نہیں جو جبر و زور سے حکومت حاصل کرے بلکہ یہ فضیلت فقط اُس شخص کے لیے ہے جو اہل ہو اور اُس کو لوگ بلا جبر و اکراہ اپنی مرضی سے منتخب کریں، ورنہ دنیا میں اقتدار تو ہر مسلم و غیر مسلم اور اہل و نااہل کو مل جاتا ہے، تاہم مجھے اس پر زیادہ کلام کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اس سلسلہ میں ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا وہ تبصرہ ہی کافی ہے جو ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔

”هَذَنَّةٌ عَلَى دَخْنٍ“ نبوی پیش گوئی

بعض لوگوں نے جو صلح امام حسن مجتبیٰ (علیہ السلام) کو معاویہ کی اہلیت و صلاحیت کی دلیل سمجھ لیا ہے، اُس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اُن کی توجہ بعض احادیث نبویہ کی طرف نہیں گئی۔ صحیح احادیث مبارکہ میں آیا ہے کہ ایک صلح ہوگی مگر اس کے باوجود صلح کرنے والوں کے دلوں سے میل و کدورت نہیں جائے گی۔ چنانچہ صحیحین میں حضرت حذیفہ بن یمان (رضی اللہ عنہ) سے ایک طویل حدیث میں ہے کہ اُنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کیا:

يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّا كُنَّا فِي جَاهِلِيَّةٍ وَشَرٍّ لَفَجَاءَنَا اللَّهُ بِهَذَا الْخَيْرِ، فَهَلْ بَعْدَ هَذَا الْخَيْرِ مِنْ شَرٍّ؟ قَالَ: نَعَمْ، قُلْتُ: وَهَلْ بَعْدَ ذَلِكَ الشَّرِّ مِنْ خَيْرٍ؟ قَالَ: نَعَمْ وَلِيهِ دَخْنٌ، قُلْتُ: وَمَا دَخْنُهُ؟ قَالَ: قَوْمٌ يَهْذُونَ بِغَيْرِ هَدْيٍ، تَعْرِفُ مِنْهُمْ وَتُنْكَرُ.

”یا رسول اللہ! ہم جاہلیت اور شر میں تھے، پس اللہ تعالیٰ ہمارے پاس اس خیر کو لے آیا۔ کیا اس خیر کے بعد بھی کوئی شر ہوگا؟ فرمایا ہاں۔ میں نے عرض کیا: کیا اُس شر کے بعد خیر ہوگی؟ فرمایا: ہاں اور اُس میں دھواں ہوگا۔ میں نے عرض کیا: وہ دھواں کیا ہوگا؟ فرمایا: وہ میری ہدایت کے بغیر چلیں گے، تمہیں اُن کے پسندیدہ اور ناپسندیدہ

دونوں امور کا سامنا کرنا ہوگا۔

(بخاری: کتاب المناقب، باب علامات النبوة فی الإسلام ص ۴۹۰ حدیث ۳۶۰۶ صبح
مسلم: کتاب الإمارة، باب الأمر بمرء الجماعة عند ظهور الفتن، وتحذیر الدعاة إلى الکفر،
ص ۸۹۶ حدیث ۱۸۴۷)

اس حدیث میں دو مرتبہ خیر کا اور دو مرتبہ شر کا ذکر آیا ہے۔ شارحین حضرات کے مطابق پہلی خیر سے
مراد وہ خیر ہے جو نبی کریم ﷺ لائے اور دوسری خیر سے مراد امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی صلح ہے، اور پہلی دُشمنی
ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا کہ اُس میں دُخسن (کدورت) ہوگی۔ اس لفظ کی معنوی تشریح میں
محدثین کرام لکھتے ہیں:

”اس کا معنی ہے دھواں، یعنی اُس صلح میں خالص خیر نہیں ہوگی بلکہ اُس میں کچھ کانٹے
اور کدورتیں ہوگی جیسا کہ آگ میں دھواں۔ ابن فارس نے کہا ہے: ”دُخسن“ سے
ناپسندیدہ معاملات مراد ہیں۔ صاحب العین فرماتے ہیں: ”دُخسن“ سے مراد کینہ
ہے۔ امام ابویسید فرماتے ہیں: اس لفظ کا معنی ایک اور حدیث میں آچکا ہے کہ ”قوم
کے دل اپنی شفافیت کے لحاظ سے پہلی حالت پر نہیں رہیں گے۔ جامع الاصول
میں ہے: اس سے دل کا فساد یعنی کھوٹ مراد ہے۔ نووی نے کہا: ”دُخسن“ سے مراد
ہے دل ایک دھڑکنے کے لیے صاف نہیں رہیں گے اور اُس شفافیت کی طرف نہیں
پلٹیں گے جس پر وہ پہلے ہوں گے۔“

(عمدة القاری ج ۱۶ ص ۱۱۹۴ فتح الباری ج ۱۶ ص ۲۸۵)

اس اقتباس میں جس حدیث کی طرف امام ابویسید نے اشارہ فرمایا ہے، وہ یہ ہے:

هَذَلْتُ عَلَى دُخْنٍ، وَخَضَاعَةٌ عَلَى أَقْدَاءٍ لَيْسَ بِهَا أَوْ قَبِيحٌ، قُلْتُ:
يَا رَسُولَ اللَّهِ! الْهَذَلُ عَلَى الدُّخْنِ مَا هِيَ؟ قَالَ: لَا تَرْجِعْ لِلزُّبَانِ الْقَوَامِ
عَلَى اللَّبَنِ كَمَا كَانَتْ عَلَيْهِ.

”ناگواری کے باوجود صلح ہوئی، اور ایسا اتحاد ہو گا جس میں کہ ورت باقی ہوگی۔
میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! الفلذنة علی الذخن کیا ہے؟ فرمایا تو پہلے جس
حالت پر تھی ان کے دل اس حالت کی طرف نہیں لوٹیں گے۔“

(مسلم ابی داؤد: کتاب النفس والسلاح، باب ذکر النفس ودلائلہا، ج ۴ ص ۲۸۸، ۲۸۹)

حدیث ۱۲۴۶ مسند احمد (شاگرد) ج ۱۶ ص ۵۷۸ حدیث ۲۳۱۷۵

ذخسن کا معنی آپ جان چکے ہیں، اب ذرا ”الفلذنة“ کا معنی بھی جان لیجئے۔ مولانا عبدالغنی
بلیاوی لکھتے ہیں:

الفلذنة مصالحة، آرام سکون جمع فلذن اور الفلذون سکون، صلح۔“

(مصباح اللغات للبلیاوی ص ۹۸۳)

اس لغوی تشریح سے ”الفلذنة علی الذخن“ کا مکمل مفہوم واضح ہو گیا کہ اس سے ایسی صلح مراد
ہے جو دوس میں ناگواری کے ساتھ ہوگی۔ چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ان دونوں لغتوں
کی لغوی توضیح کے بعد لکھتے ہیں:

وحاصلہ اذہ نکون صلح منع خلع و بیعت و نفاق۔

”خلاصہ یہ ہے کہ حاکم، خیانت اور نفاق کے ساتھ صلح ہوگی۔“

(لمعات التلخیص ج ۸ ص ۶۰۶)

صلح دو مخصوص یا دو پارٹیوں کے درمیان میں ہوتی ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس حدیث میں
صلح کے باوجود جس کدورت اور کبیدگی کا ذکر ہے اس سے کس کے دل کی کبیدگی مراد ہے، اور اس میں جس
خلاف خیانت اور نفاق کا ذکر ہے وہ کس کے دل میں تھا؟ یہ کوئی ایسا معاملہ نہیں جس کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے، ہم اس
کی وضاحت آئندہ طور پر کرتے ہیں۔

عام الجماعۃ کی حقیقت

نامی لوگ بغیر جانتے ہیں کہ ان کے ممدون کو جب امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے اقتدار پر دکر دیا تو وہ

سال عام الجماعة کہلایا، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس میں اُن کے مدوح کی کوئی خوبی نہیں، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے پہلے ہی اس اجتماع کو ”جَمَاعَةٌ عَلَى أَقْدَاءِ“ (کدورتوں پر جماعت) فرمایا تھا۔ یہ نبوی پیش گوئی اس کدورتوں بھرے اجتماع پر کیسے صادق آئی؟ آئیے! اس کی حقانیت تاریخ سے اور تاریخ کی حقانیت اسی حدیث سے سمجھئے۔ امام ابن جریر طبری اور امام ابن اثیر جزری رحمۃ اللہ علیہما لکھتے ہیں کہ جب سیدنا امام حسن مجتبیٰ (علیہ السلام) نے بادلِ نخواستہ معاویہ کے ساتھ صلح کر لی تو سیدنا قیس بن سعد رضی اللہ عنہما کو فرمایا کہ وہ معاویہ کی طاعت میں داخل ہو جائیں۔ انہوں نے لوگوں میں کھڑے ہو کر فرمایا:

أَيُّهَا النَّاسُ اخْتَارُوا الدُّخُولَ فِي طَاعَةِ إِمَامٍ ضَلَالَةٍ، أَوِ الْقِتَالَ مَعَ غَيْرِ إِمَامٍ؟ فَقَالَ بَعْضُهُمْ: بَلَى نَخْتَارُ أَنْ نَدْخُلَ فِي طَاعَةِ إِمَامٍ ضَلَالَةٍ.
 ”لوگو! امام ضلالت کی طاعت میں داخل ہونا چاہتے ہو یا بغیر امام کے جنگ کرنا چاہتے ہو؟ بعض لوگوں نے کہا: بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ ہم امام ضلالت کی طاعت میں داخل ہو جائیں۔“

(تاریخ الطبری ج ۵ ص ۱۶۰، الکامل فی التاریخ ج ۳ ص ۷)

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جیسی وہ ناگوار بیعت تھی ایسا ہی وہ سال عام الجماعة تھا۔ یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ کتب تاریخ کی بات ہے، اس لیے اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس پر ہم عرض کرتے ہیں کہ جب اس کی پیش گوئی حدیث پاک میں آگئی تھی تو پھر اُس کا پورا ہو کر کتب تاریخ میں مذکور ہونا حدیث پاک کی صحت کی دلیل بن گئی اور ساتھ ہی اس سے تاریخ کی بھی توثیق ہو گئی۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ جب کوئی نبوی پیش گوئی مستقبل میں من و عن واقع ہو جائے تو اُس کا شمار دلائل نبوت میں ہوتا ہے۔

ضلالت و کدورت پر جماعت

یاد رکھنا چاہیے کہ ۴۰ھ میں امام حسن مجتبیٰ (علیہ السلام) کی صلح کے بعد جس آدمی کو صحابی رسول سیدنا قیس بن سعد رضی اللہ عنہما اور اُن کے لشکر کے لوگ امام ضلالت کہہ رہے ہیں اُسی آدمی کی بیعت کو کم و بیش دو برس قبل سیدنا جابر بن عبد اللہ اور ام المومنین سیدہ ام سلمہ (علیہما السلام) نے بھی بیعتِ ضلالت قرار دیا تھا۔ چنانچہ متعدد علماء

کرام لکھتے ہیں:

”معاویہ نے [یکے از طلقاء] بسر بن ابی ارطاة کو شام سے ایک لشکر کے ساتھ روانہ کیا تو وہ لشکر کو لے کر چل پڑا حتیٰ کہ مدینہ منورہ پہنچا، اُس وقت وہاں کے گورنر رسول اللہ ﷺ کے صحابی سیدنا ابویوب انصاری ؓ تھے تو وہ وہاں سے سیدنا علی ؓ کی طرف کوفہ بھاگ گئے۔ پھر بسر بن ابی ارطاة منبر نبوی پر چڑھ گیا اور انصار کو لٹکار کر کہنے لگا: یادینار، یا ذرتیق، یا نجار! میں نے اس مقام پر سخی شیخ یعنی عثمان (ؓ) سے عہد کیا تھا۔ اے اہل مدینہ! اگر مجھ سے امیر المومنین نے عہد نہ لیا ہوتا تو میں تمہارے ہر بالغ شخص کو قتل کر دیتا۔ اہل مدینہ نے اُس کے ہاتھ پر معاویہ کی بیعت کی، اور اُس نے بنو سلمہ کی طرف پیغام بھیجا اور کہا: خدا کی قسم! میرے ہاں تمہارے لیے کوئی امان نہیں اور نہ ہی تمہاری بیعت قبول ہے جب تک کہ تم صحابی رسول جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کو بیعت کے لیے پیش نہ کر دو۔ پس سیدنا جابر ؓ خفیہ طور پر ام المومنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہما کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا:

يَا اُمَّةَ اِنِّي خَشِيتُ عَلَىٰ دِينِي وَهَلِيهِ بَيْعَةٌ ضَلَالَةٌ.

”امی! میں اپنے دین پر خدشہ محسوس کرتا ہوں، کیونکہ یہ گمراہی کی بیعت ہے۔“

اماں پاک نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ آپ بیعت کر لیں، میں نے اپنے بیٹے عمر بن ابی سلمہ کو بھی کہا ہے کہ وہ بھی بیعت کر لے۔ پس سیدنا جابر ؓ نکلے اور بسر بن ابی ارطاة کے ہاتھ پر معاویہ کی بیعت کر لی۔ اس کے بعد بسر نے مدینہ منورہ کے بہت سے گھروں کو سمار کر دیا۔ پھر اُس نے مکہ مکرمہ کا رخ کیا وہاں ابوموسیٰ اشعری ؓ گورنر تھے تو وہ روپوش ہو گئے۔ بسر کو یہ بات پہنچی تو اُس نے کہا: میں ابوموسیٰ کو اذیت نہیں دے سکتا، میں اُن کا حق اور فضیلت جانتا ہوں۔ پھر اُس نے یمن کا رخ کیا اور وہاں اُس وقت عبید اللہ بن عباس بن عبد المطلب سیدنا علی ؓ کے گورنر تھے، انہیں جب

بسر بن ابی ارطاة کے آنے کی اطلاع ملی تو وہ سیدنا علیؑ کی طرف چلے گئے، اور اپنا نائب عبد اللہ بن المدان مرادی کو مقرر کر گئے۔ عبید اللہ بن عباس کے عائشہ بنت عبد اللہ بن عبد المدان سے دو بچے تھے، جو تمام بچوں سے زیادہ خوبصورت، پسندیدہ اور انتہائی صاف اور چمک دار تھے۔ بسر نے اُن دونوں بچوں کو اُن کی ماں کے سامنے ذبح کر دیا تو وہ بی بی دیوانی ہو گئی۔“

(تاریخ دمشق ج ۱۰ ص ۱۵۲، ۱۵۳؛ تہذیب الکمال ج ۴ ص ۶۵؛ تاریخ الرسل والملوک والأئمہ ج ۵ ص ۱۳۹؛ الکامل فی تاریخ ج ۲ ص ۷۳۲؛ أسد الغابہ ج ۱ ص ۳۷۴، ۳۷۵؛ مرآة الزمان ج ۶ ص ۴۰۷؛ البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۶۸۲، ۶۸۳؛ تاریخ الإسلام للذہبی ج ۵ ص ۳۶۹؛ تہذیب التہذیب ملخصاً ج ۱ ص ۴۰۹؛ الإصابہ (إشارة ومثبتاً) ج ۱ ص ۴۲۲)

امام بخاری نے بیعت معاویہ کے بارے میں ام المومنین سیدہ ام سلمہ اور سیدنا جابر بن عبد اللہؓ کے مکالمہ میں ام المومنین رضی اللہ عنہا کا یہ جملہ نقل کیا ہے:

أَنَا أَعْلَمُ أَنَّهَا بَيْعَةُ ضَلَالَةٍ.

”میں بھی جانتی ہوں کہ یہ گمراہی کی بیعت ہے۔“

(التاریخ الصغير للبخاري ج ۱ ص ۱۴۱)

اس سے قبل ۳۶ھ میں اُس عظیم صحابی نے بھی گروہ معاویہ کو ضلالت پر قرار دیا تھا جن کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے ضمانت دی تھی کہ وہ شیطان سے محفوظ ہیں، یعنی سیدنا عمار بن یاسرؓ ایک طویل حدیث میں ہے کہ انہوں نے صفین کے میدان میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

أَنَّهُمْ عَلَى الضَّلَالَةِ.

”وہ لوگ گمراہی پر ہیں۔“

(مسند أحمد ج ۴ ص ۳۱۹ و ط: ج ۶ ص ۴۰۵ حدیث ۱۹۰۹؛ صحیح ابن حبان ج ۱۵ ص

۵۵۶، ۵۵۵ حدیث ۷۰۸۰)

شیخ احمد شاکر نے کہا ہے: اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

مسند احمد، بتحقیق احمد شاکر ج ۱۴ ص ۲۹۳ حدیث ۱۸۷۸۶

”شیخ شعیب الارؤوط نے لکھا ہے: اس کے رجال ثقہ ہیں اور شیخین کے رجال

ہیں، ماسوا عبد اللہ بن سلمہ کے، وہ سنن اربعہ کا راوی ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں: امید

ہے کہ اُس میں کوئی حرج نہیں۔ امام ابن حبان، محدث عجل اور یعقوب بن شیبہ نے

اُس کی توثیق فرمائی ہے۔“

(تعلیقات: الإحسان فی تقریب صحیح ابن حبان ج ۱۵ ص ۵۵۶)

خلیفہ اور سلطان میں فرق، از فاضل بریلی

غور فرمائیے! جو آدمی خلیفہ راشد کے معزول کرنے پر اُن کے مد مقابل آگیا اور پھر اُسی خلیفہ راشد کی حیات میں اور اُن کے ہی دور خلافت میں بزور تلوار اپنی بیعت لیتا رہا، حالانکہ وہ جس خلیفہ کی طاعت سے منحرف تھا اُس خلیفہ راشد کے بارے میں زبان نبوی ﷺ سے ثابت ہے کہ حق ہر حال میں اُسی کے ساتھ ہوگا بلکہ اُن کے حق میں یوں انوکھی دعا بھی منقول ہے کہ ”یا اللہ! جدھر وہ جائے حق کو ادھر کر دے“ سو اگر اُس خلیفہ راشد کے منکر کو سیدنا عمار بن یاسر، اُم المؤمنین سیدہ اُم سلمہ، سیدنا جابر بن عبد اللہ، سیدنا قیس بن سعد اور اُن کے رفقاء ھجھ، امام مظلالت نہ کہتے تو اور کیا کہتے؟ دراصل شرعی اصول یہ ہے کہ بیک وقت روئے زمین پر فقط ایک ہی خلیفہ ہو سکتا ہے، اور دوسرے لوگ اُسی کے تقرر سے اُس کے گورنر اور نائب وغیرہ ہوتے ہیں اور اُس کے عزل سے اُن کا معزول ہونا واجب ہوتا ہے۔ بخلاف خلیفہ کے کہ اُس کو بلا عذر شرعی معزول نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ فاضل بریلی لکھتے ہیں:

”کوئی سلطان اپنے انعقاد و سلطنت میں دوسرے سلطان کے اذن کا محتاج نہیں مگر ہر

سلطان اذن خلیفہ کا محتاج ہے کہ بے اُس کے اُس کی حکومت شرعی و مرضی (پسندیدہ)

شرع نہیں ہو سکتی۔“

موصوف اِس سے اگلے فقرہ میں لکھتے ہیں:

”خليفة بلا وجه شرعي کسی بڑے سے بڑے سلطان کے معزول کیے معزول نہیں ہو سکتا، بخلاف سلطان کے کہ خليفة کا صرف زبان سے کہہ دینا: میں نے تجھے معزول کیا اس کے عزل کو پس ہے۔“

(فتاویٰ رضویہ ج ۱۴ ص ۱۸۶)

فاضل بریلی اس سے ایک صفحہ قبل لکھتے ہیں:

”خليفة حکمرانی و جہانبانی میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ (وآلہ) وسلم کا نائب مطلق، تمام امت پر ولایت عامہ والا ہے، شرح عقائد نسلی میں ہے:

(خلافتهم) أي ليابتهم عن الرسول في إقامة الدين بحيث يجب على كافة الأمم الاتباع.

اُن کی خلافت، یعنی دین کی اقامت میں رسول اللہ ﷺ کی نیابت کا مقام یہ ہے کہ تمام امت پر اس کی اتباع واجب ہے۔

خود سرکفار کا اُسے نہ ماننا شرعاً اُس کے استحقاقِ ولایت عامہ میں قائل نہیں، جس طرح اُن کا خود نبی کو نہ ماننا، یونہی روئے زمین کے مسلمانوں میں جو اُسے نہ مانے گا اُس کی خلافت میں خلاف نہ آئے گا یہ خود ہی باغی قرار پائے گا۔“

(فتاویٰ رضویہ ج ۱۴ ص ۱۸۵)

فاضل بریلی کے پہلے دو پیرا گراف سے واضح ہے کہ خليفة جس شخص کو معزول کر دے تو اُس کا منصب پر براجمان رہنا شریعت کے خلاف ہے، اور شریعت کی خلاف ورزی یقیناً ضلالت ہے۔

تیسرے پیرا گراف میں ہے کہ خليفة کی اطاعت پوری امت پر واجب ہے اور جو شخص اُس کو خليفة نہ مانے تو وہ باغی ہے، اور ظاہر ہے کہ بغاوت ہدایت نہیں ضلالت ہوتی ہے ﴿حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أُمُورِ اللَّهِ﴾ (یہاں تک کہ باغی حکم الہی کی طرف پلٹ آئے)۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بعض طلقاء بنیادی طور پر بھی خلافت کے لیے موزوں نہیں تھے، لیکن چونکہ وہ سابقہ ادوار میں گورنر بنا دیے گئے تھے اور تقریباً دو ہائیوں تک ایک ہی

مقام پر گورنر رہنے کی وجہ سے طاقت ور ہو گئے تھے، اس لیے جب انہیں سیدنا علیؑ نے معزول کر دیا تو وہ اسی طاقت کے زور پر بغاوت پر اتر آئے، حالانکہ اُن پر خلیفہ برحق کی اطاعت واجب تھی، اور انہیں خلیفہ کا صرف زبان سے کہہ دینا: ”میں نے تجھے معزول کیا“ اُن کے عزل کے لیے کافی تھا، لیکن چونکہ وہ معزول نہ ہوئے، لہذا باغی قرار پائے، اور بغاوت ایسا کبیرہ گناہ ہے کہ چاروں فقہی مذاہب کے علماء کے نزدیک اُس کے مرتکب کی فقط تکفیر جائز نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ خلافت مرتضوی سے قبل کے ادوار میں بعض طلقاء کا گورنر ہونا ناجائز تھا، سیدنا علیؑ کے معزول کرنے کے بعد اُن کا معزول ہونا واجب تھا اور بعد منصب پر باقی رہنا شوافع کی اصطلاح کے مطابق حرام اور احناف کے مطابق مکروہ تحریمی تھا، لیکن چونکہ وہ منصب پر براجمان رہے اس لیے اُن کی یہ ضد شرع شریف میں ضلالت ٹھہری، لہذا خود بتلائے کہ جب بنیادی ضلالت پر ہو تو باقی ڈھانچہ ہدایت پر کیونکر ہو سکتا ہے؟ لہذا یہ جس نے بھی کہا ہے حق کہا ہے۔

خشت اول چون نہد معمار کج

نا بریامی دود دیوار کج

”یعنی کاری کر جب پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھے تو ٹریا تک پوری دیوار ہی ٹیڑھی جاتی ہے۔“

”أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ“ کے مؤیدین سے سوال

کیا ”أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ“ کے مؤیدین کے نزدیک صحابی رسول سیدنا عمار بن یاسر، صحابی رسول سیدنا جابر بن عبد اللہ، صحابیہ اور زوجہ رسول اُم المؤمنین سیدہ اُم سلمہ اور صحابی نبی سیدنا قیس بن سعدؓ کا قول بھی باعث ہدایت ہے یا نہیں، یا اُن کے نزدیک ”أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ“ کے مصداق فقط طلقاء ہی ہیں؟ ان سب صحابہ کرامؓ نے معاویہ کو ضلالت اور بطلان پر گامزن کہا ہے، لہذا ”أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ“ کے مؤیدین کے نزدیک قابل اتباع یہ صحابہ کرامؓ ہیں یا معاویہ؟ یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ امام حسنؓ بھی معاویہ کو باغی اور خوارج سے زیادہ برا سمجھتے تھے اور وہ جانتے تھے کہ جس طاقت کے بل بوتے پر معاویہ نے اُن کے بابا سے بغاوت کی تھی اسی طاقت کے بل بوتے پر وہ اُن کے مقابلہ میں آیا ہے، اسی

لیے انہوں نے بامر مجبوری صلح فرمائی تھی، لہذا اُن کے صلح کر لینے کے باوجود سیدنا قیس بن سعد ؓ کا معاویہ کو امام منلالت کہنا حق تھا، اور اُن کے اُس قول میں سیدنا امام حسن مجتبیٰ ؓ کی مخالفت نہیں تھی۔ امام پاک دراصل مکمل طور پر اپنے بابا کے موقف پر تھے اور اُن کے بابا کریم ؓ کا موقف یہ تھا کہ وہ معاویہ کو کسی قسم کی جنگ اور اُس کے انکارِ طاعت سے پہلے ہی اُس کو گمراہ کن اور کتاب و سنت سے روگرداں سمجھتے تھے، جیسا کہ چند سطور بعد اُن کی تصریح آرہی ہے۔

یہاں ”أَصْحَابِي كَالنَّجُومِ“ کے مؤیدین سے دوسرا سوال یہ ہے کہ جب وہ اس موضوع روایت کا اطلاق طلقاء پر بھی کرتے ہیں تو پھر وہ خلافتِ راشدہ کے قیام کا مطالبہ کیوں کرتے ہیں، طلقاء کی ملوکیت کے طرزِ حکومت کا مطالبہ کیوں نہیں کرتے؟

لیکن یہاں یہ پہلو قابلِ لحاظ ہے کہ خلافتِ راشدہ کے قیام کا خوبصورت مطالبہ اکثر وہ مسلمان کرتے ہیں جن سے اقتدار دور ہو، ورنہ خلافتِ راشدہ کا قیام خالہ جی کا گھر نہیں، یہی وجہ ہے کہ دنیا میں کسی بھی مسلم ملک میں خلافتِ راشدہ کے طرز پر کوئی حکومت نہیں، حتیٰ کہ حجاز مقدس میں ملوکیت کا دور دورہ ہے۔ چنانچہ وہاں آزادی اظہارِ رائے پر مکمل طور پر پابندی ہے، اگر وہاں کوئی حق گوئی کی کوشش کرے تو اُسے سیدنا حجر بن عدی ؓ کی طرح تہ تیغ کر دیا جاتا ہے۔ وہاں عملاً خلافتِ راشدہ نہیں بلکہ طلقاء کی ملوکیت کا طوطی بولتا ہے اور اسی کو ہی وہ اسلامی حکومت سمجھتے اور پور کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تین چار دہائیوں تک ہندوپاک وغیرہ میں مخصوص مکاتبِ فکر پر سرمایہ خرچ کرتے رہے اور اُن سے بظاہر محبتِ صحابہ کرام ؓ کا خوبصورت نعرہ لگوا کر بیاطن بعض طلیق ملوک کو اسلام کا ہیر و ثابت کرانے کی کوشش کراتے رہے، تاکہ وہ دنیا کو باور کر سکیں کہ اُن کی یہ حکومت بھی دراصل ”أَصْحَابِي كَالنَّجُومِ“ پر ہی عمل ہے۔

اب شاید حجاز مقدس کے حکمران ہندوپاک کے اُن مکاتبِ فکر سے مایوس ہو گئے ہیں، کیونکہ اب انہوں نے اپنی فیاضی کا کچھ رُخ اُن مکاتبِ فکر کی طرف بھی کر دیا ہے جن کا شمار یا رسول اللہ کہنے والوں میں ہوتا ہے۔ اگر عقل مند لوگ ”بے خطا بے گناہ.....“ کے نعرے اور عمامہ باندھنے کی پابندی اور خاص رنگ کی پابندی اٹھانے میں غور و فکر کریں تو اُن پر پس پردہ حقائق آشکار ہوتے چلے جائیں گے۔ افسوس کہ

یا رسول اللہ کہنے والے لوگ اُن نجدیوں کے دام فریب میں آ گئے جن کے ہاں علی، غلام علی، حسن، غلام حسن، حسین، غلام حسین، غلام فاطمہ، کنیز فاطمہ اور عباس و غلام عباس وغیرہ نام رکھنا معیوب ہے اور معاویہ نام رکھنا پسندیدہ ہے۔ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَجْعَلُكَ لِي فُحُوْرِهِمْ وَنَعُوْذُ بِكَ مِنْ شُرُوْرِهِمْ۔

میں بعض مُضِلِّیْنَ کو معاون نہیں بنا سکتا، علیؑ

واضح رہے کہ معاویہ پر سود کے معاملہ میں سیدنا عبادہ بن الصامت اور سیدنا ابوالدرداء رضی اللہ عنہما کا برہم ہونا، اُس کے سامنے اُس کی حرمت پر حدیث نبویؐ پیش کرنا اور اُس کا حدیث پر اپنی رائے کو ترجیح دینا۔ پھر سیدنا عبادہ بن الصامتؓ کا شراب فروشی کے معاملہ میں اُس کی مزاحمت کرنا وغیرہ امور سیدنا علیؑ کی خلافت سے پہلے کے معاملات ہیں، ایسے تمام امور کا ارتکاب سیدنا عمر بن الخطاب اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہما کے دور میں ہوا تھا۔ بعض احادیث صحیحہ سے اشارہ اور کنایہ معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا عمرؓ اس قسم کے معاملات سے کافی پریشان تھے اور وہ کوئی اہم قدم اٹھانا چاہتے تھے اور اپنے آخری حج میں مکہ المکرمہ میں ہی اُس کے بارے میں کوئی اہم اعلان بھی کرنا چاہتے تھے مگر حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ لوگوں کے اتنے بڑے ہجوم میں ایسا اعلان نہ کریں، کہیں ایسا نہ ہو کہ شور و شرابہ کی وجہ سے لوگ اُن کی بات کا غلط مطلب نکال لیں، مناسب ہے کہ ایسا اعلان مدینہ منورہ میں کیا جائے، لیکن افسوس کہ باقاعدہ اس قسم کے اہم اعلان سے قبل ہی مدینہ منورہ پہنچنے پر انہیں شہید کر دیا گیا تھا۔ انہیں جس شخص نے بلا وجہ قتل کیا تھا وہ مغیرہ بن شعبہ ثقفی کا غلام تھا اور نبی کریم ﷺ نے پہلے ہی فرما دیا تھا:

اَلْمُهَاجِرُوْنَ وَالْاَنْصَارُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ لِّى الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ،
وَالطُّلُقَاءُ مِنْ قُرْبٰى ، وَالْعَتَقَاءُ مِنْ ثَقِیْفٍ ، بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ لِّى
الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ۔

”مہاجرین و انصار دنیا اور آخرت میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور قریش کے طلقاء اور ثقیف کے عتقاء دنیا اور آخرت میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔“

(مسند احمد ج ۴ ص ۳۶۴ و ط: ج ۶ ص ۱۳۵ حدیث ۱۹۴۲۷؛ صحیح ابن حبان ج ۱۶ ص

۲۵۰ حدیث ۷۲۶۰؛ المستدرک ج ۴ ص ۸۰؛ المعجم الكبير ج ۲ ص ۳۱۳، ۳۱۴ حدیث

۲۳۱۰، ۲۳۱۱ و ص ۳۴۳ حدیث ۲۴۳۸؛ مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۱۵

یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ مغیرہ بن شعبہ ثقفی کے غلام نے کس کی انگلیت پر یہ قدم اٹھایا ہوگا، البتہ یہ بات محتاج وضاحت نہیں کہ مغیرہ بن شعبہ ثقفی نے قریش کے طلحہ معاویہ سے بعد میں فوائد حاصل کیے تھے اور اُس کی حکومت میں تادم حیات گورزرہے تھے۔ خیر یہ اندازے اور قیاس ہیں، ان کا کوئی نقلی ثبوت نہیں ہے، اگر نقلی ثبوت مانکا جائے تو اُسے پیش کرنے میں یوں ہی ناکامی رہے گی جس طرح شہید مرتضیٰ بھٹو اور شہید بے نظیر بھٹو کے قاتلین کے بارے میں ناکامی کا سامنا ہے۔

ہمارا حسن ظن یہ ہے کہ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ بھی بعض طلقاء کے مذکورہ بالا اعمال سیئہ کی وجہ سے دل برداشتہ تھے اور وہ کوئی قدم اٹھانا چاہتے تھے مگر انہیں بھی راستہ سے ہٹا دیا گیا۔ اگر پوچھا جائے کہ یہ کام کس نے کیا اور کیسے کیا؟ تو اس کی واضح تفصیل کسی کے پاس نہیں ہے، البتہ اس سلسلے میں معاویہ بن ابی سفیان کے بعض معاصرین (عبداللہ بن سعد بن ابی سرح) کا مافی الضمیر نقل ہو کر ہم تک پہنچا ہے، اُس میں اگر کوئی غور کرنا چاہے تو وہ گذشتہ صفحات میں لکھا جا چکا ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بارے میں تو فقط قتل کی خواہش کا ذکر ملتا ہے، خود سوچئے کہ جس خلیفہ نے خود معاویہ بن ابی سفیان کی معزولی کا حکم سنایا تھا وہ اُس کے نزدیک کتنا مبغوض ہوگا؟ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اُسے معزول کر دیا تھا اور اس لیے معزول کیا تھا کہ وہ اُسے ”ضال“ (گمراہ) ہی نہیں بلکہ ”مُضِلّ“ (گمراہ کن) بھی سمجھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جو گورزرہونے کی حیثیت سے سودا و شراب فروشی کو جائز سمجھے تو وہ محض گمراہ نہیں ہوتا بلکہ گمراہ کن بھی ہوتا ہے۔ شاید بعض لوگوں کو یہ الفاظ ادھر پرے محسوس ہو رہے ہوں تو آئیے خود مولیٰ علی رضی اللہ عنہ سے ہی سن لیجئے۔ امام ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے اور لوگوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تو مغیرہ بن شعبہ نے اُن کے پاس آ کر عرض کیا: امیر المومنین! آپ کے لیے میرے پاس ایک نصیحت (خیر خواہی) ہے۔ انہوں نے فرمایا: وہ کیا ہے؟ کہا: اگر آپ

چاہتے ہیں کہ آپ کا معاملہ مضبوط ہو جائے تو پھر آپ طلحہ بن عبید اللہ (ؓ) کو کوفہ کا اور زبیر بن العوام (ؓ) کو بصرہ کا گورنر مقرر کر دیں اور معاویہ کو اُس کے منصب پر شام میں برقرار رہنے دیں حتیٰ کہ اُس پر آپ کی اطاعت لازم ہو جائے، پھر جب آپ کی خلافت مضبوط ہو جائے تو آپ جو چاہیں گے کیجئے گا۔ سیدنا علی (ؓ) نے فرمایا: طلحہ اور زبیر کے بارے میں تو میں عنقریب سوچوں گا، باقی رہا معاویہ تو اَللّٰہُ اَعْلَمُ کی قسم! اللہ تعالیٰ مجھے نہ تو اُس کو گورنر بنانے کی راہ دکھارہا ہے اور نہ ہی معاون بنانے کی جب تک کہ وہ اپنی موجودہ حالت پر قائم رہے، لیکن میں اُس کو اُس امر میں شمولیت کی دعوت دوں گا جس میں دوسرے مسلمان شامل ہوئے ہیں، پھر اگر اُس نے انکار کیا تو اُس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ (کتاب الہی) کے سپرد کروں گا۔ مغیرہ کی نصیحت جب قبول نہ کی گئی تو وہ غضبناک حالت میں نکل کر چلا گیا۔ پھر دوسرے دن آکر کہنے لگا: امیر المومنین! میں نے جو کل آپ سے گزارش کی تھی، بعد میں میں نے اُس میں غور و فکر کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ آپ کو خیر کی توفیق دی گئی ہے، لہذا آپ حق کو طلب فرمائیں، یہ کہہ کر باہر چلا گیا۔ جب وہ باہر نکل رہا تھا تو سیدنا امام حسن (ؓ) سے اُس کا آنا سامنا ہوا۔ اُنہوں نے اپنے بابا سے دریافت کیا: آپ کو اس بھیگے نے کیا کہا ہے؟ فرمایا: کل اس نے میرے پاس آکر یوں کہا تھا اور آج یہ کہا ہے۔ اُنہوں نے عرض کیا: بخدا! کل اُس نے آپ کے ساتھ خیر خواہی کی اور آج اُس نے مکر کیا ہے۔ اس پر سیدنا علی (ؓ) نے امام حسن (ؓ) کو فرمایا:

إِنْ أَقْرَضْتُ مُعَاوِيَةَ عَلَى مَا فِي يَدِهِ كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّينَ عَضُدًا.

”اگر میں معاویہ کو اُس کی موجودہ حالت و اختیار پر قائم رکھوں تو میں گمراہ کن کو معاون بنانے والا ٹھہروں گا۔“

(الاستيعاب في معرفة الأصحاب ج ۲ ص ۲۶۰، في ترجمة مغيرة بن شعبه)

علامہ سبط ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ نے مغیرہ بن شعبہ کے اس مشورہ کا تذکرہ تفصیلاً کیا ہے، انہوں نے ایک بات یہ بھی لکھی ہے کہ مغیرہ نے مولانا علیؑ کو کہا: آپ ابن عامر، معاویہ اور حضرت عثمانؓ کے دوسرے عمال کو ان کے مناصب پر برقرار رہنے دیں یہاں تک کہ سب لوگ آپ کی بیعت کر لیں، پھر بعد میں انہیں معزول کر دینا۔ یہ الفاظ بھی منقول ہیں کہ آپ انہیں ایک مہینہ برقرار رہنے دیں تاکہ آپ کا معاملہ مضبوط ہو جائے پھر ہمیشہ کے لیے معزول کر دینا۔ سیدنا ابن عباسؓ کو مغیرہ بن شعبہ کے اس آنے جانے کے متعلق معلوم ہوا تو انہوں نے مولانا علیؑ کو عرض کیا: پہلے روز مغیرہ نے آپ کو خیر خواہانہ مشورہ دیا ہے اور دوسرے دن اُس نے آپ کو دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے۔ سیدنا علیؑ نے فرمایا: وہ کیسے؟ انہوں نے عرض کیا:

لَآ اَنْبِيْ اُمَّيَّةَ وَمَعَاوِيَةَ اَصْحَابَ دُنْيَا ، فَمَتَى اُنْقِيَتْهُمْ لَمْ يَبَالُوْا مَنْ
وَلِيَّ بِهَذَا الْاَمْرِ ، وَمَتَى عَزَلْتَهُمْ اَخَذُوْا هَذَا الْاَمْرَ بِغَيْرِ شُوْرِيْ ، وَقَالُوْا
قَتَلَ صَاحِبُنَا ، وَالْبُوْا عَلَيْنَا .

”اس لیے کہ بنو امیہ اور معاویہ دنیا دار لوگ ہیں، سو جب آپ انہیں برقرار رکھیں گے تو انہیں کوئی پروا نہیں ہوگی کہ خلیفہ کون ہے اور جو نبی آپ انہیں معزول کریں گے تو وہ اس امر کو شوریٰ کے بغیر لے لیں گے اور کہیں گے اس نے ہمارے صاحب کو قتل کیا ہے اور آپ کے خلاف جمع ہو جائیں گے۔“

اس پر سیدنا علیؑ نے فرمایا:

اَمَّا مَا ذَكَرْتُ مِنْ اِقْرَارِهِمْ ، فَمَا اَشْكُ اَنَّهُ خَيْرٌ لِّيْ عَاجِلِ الدُّنْيَا وَ
صَلَاحِهَا ، وَاَمَّا اَلِيْدِيْ يَلْزَمُنِيْ مِنَ الْحَقِّ وَالْمَعْرِفَةِ بِهِمْ فَلَا يَجِلُّ لِيْ اَنْ
اُبْقِيَ مِنْهُمْ وَاحِدًا سَاعَةً مِنْ نَّهَارٍ .

”آپ نے جو انہیں مقرر رکھنے کا کہا ہے تو مجھے کوئی شک نہیں کہ فی الحال اس میں دنیوی فائدہ اور اُس کی درستی مضمر ہے، لیکن مجھ پر جو حق لازم ہے اور جو ان لوگوں

کی حقیقت عیاں ہے تو میرے لیے حلال نہیں کہ میں اُن میں سے کسی کو دین کے ایک گھنڈے کے لیے بھی مقرر رکھوں۔“

(مرآة الزمان ملخصاً ج ۶ ص ۵۶، ۵۷)

خدا جانے کہ مولیٰ علیؑ اُن لوگوں کی اصلیت سے کتنا آشنا ہوں گے کہ انہیں ساعتِ یوم کے لیے بھی اُن کے منصب پر قائم رکھنا حلال نہیں سمجھتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ سیدنا علیؑ کی معرفت، اُن کا علمی رسوخ، مخصوص فہم، فراست، بصیرت اور دُرُجس سے طہارت کی قوت اُن کے پاؤں کی ایسی زنجیر تھی جو انہیں دنیوی مصلحتوں کی طرف جانے سے روکتی تھی، حتیٰ کہ وہ بل بھر کے لیے بھی دین پر دنیوی فوائد کو ترجیح دینے کے روادار نہیں تھے، اسی لیے وہ گونا گوں مشکلات کا شکار رہے۔ شاید درج ذیل جملہ جو کہ حقیقت پر مبنی ہے، علامہ سید ابوالحسن علی ندوی کی کسی کتاب میں میرے سامنے آیا تھا کہ:

”سیدنا علیؑ پر جو شدید مشکلات آئیں وہ اُن کی عبقریت کی زکات تھی۔“

خلاصہ یہ ہے کہ سیدنا علیؑ ویسے بھی بنو امیہ کے طلقاء کی فطرت سے آگاہ تھے اور سیدنا عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کے دور میں بھی معاویہ سے جو کتاب و سنت کی خلاف ورزی ہوتی رہی اُس سے بھی باخبر تھے، اس لیے انہوں نے شروع ہی سے معاویہ کو گورنری کی سیٹ پر قائم رکھنا جائز نہ سمجھا۔ اگر وہ قائم رکھتے تو قصاص وغیرہ کی کوئی تحریک چلتی اور نہ ہی سیدنا علیؑ کو حضرت عثمانؓ کا قاتل یا قاتلین کا سہولت کار اور پشت پناہ کہا جاتا، اور نہ ہی معاویہ حضرت عثمانؓ کا وارث و ولی بنتا اور نہ ہی سیدنا علیؑ اور اُن کے بعد حسنینؑ کو یحییٰ مصائب و مشکلات کا شکار ہوتے۔

یہاں سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ معاویہ اگر معزولی کے حکم کو قبول کر لیتا تو تب بھی وہ حضرت عثمانؓ کے قصاص کا نعرہ نہ لگاتا، کیونکہ اس قسم کے نعرے عوامی قوت کے بغیر نہیں لگائے جاسکتے اور عوامی حمایت حاصل کرنے کے لیے کسی نعرے کا ہونا ضروری ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ حضرت عثمانؓ کے قصاص کے دعویٰ سے زیادہ خوبصورت نعرہ کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ ان الفاظ کو محض میرا تخیل نہ سمجھا جائے بلکہ اس پر مذکورہ بالا عبارت کے علاوہ اُس دور کے متعدد صحابہ اور دوسرے معاصرین کے مزید اقوال و آراء بھی موجود

ہیں، جن کا باحوالہ تذکرہ ان شاء اللہ ہم اپنی کتاب ”الفتنۃ الباغیۃ“ میں کریں گے۔

مولانا بنوری کا بصیرت افروز تبصرہ

یاد رہے کہ شریعت میں بغاوت فقط اُس ہٹ دھرمی کو کہا جاتا ہے جو طاقت کی بنا پر ہو، تاہم چونکہ سیدنا علیؑ معاویہ کو پہلے سے ہی گمراہ کن سمجھتے تھے اور اسی لیے انہوں نے اُس کی معزولی کا حکم صادر فرمایا تھا تو اُس کی اصلیت کھل کر سامنے آگئی اور قیامت تک کے لیے غیر متعصب مسلمانوں پر اسلام پسند اور دنیا پسند لوگ واضح ہوئے، قرآن کی تاویل سمجھ آئی اور بغاوت وغیرہ کے مسائل و احکام وجود میں آئے۔ ہر چند کہ تاویل قرآن کی تکمیل کی اہل اسلام کو بھاری قیمت چکانا پڑ گئی تاہم اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اسلام کا اصلی چہرہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا۔ چنانچہ علامہ مولانا محمد یوسف بنوری نے اپنے الفاظ میں اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔ وہ علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیری کی کتاب ”اکفاد الملحدین“ کے تعارفی الفاظ میں لکھتے ہیں:

”مشیتِ الہی سے عہد عثمانی میں عہد فاروقی جیسا تذکرہ فقط قائم نہ رہ سکا، اس لیے مریض القلب لوگوں نے خصوصاً نام نہاد مسلمان یہودیوں نے خفیہ ریشہ دوانیاں شروع کر دیں تا آنکہ حضرت عثمان غنیؓ شہید ہو گئے اور اب چاروں طرف سے علی الاعلان فتنوں نے سراٹھایا۔ حضرت علیؓ کے عہد میں ان فتنوں کا بازار ”حرب و پیکار“ کی شکل میں گرم ہونا شروع ہو گیا اور اسلام کو شدید ترین داخلی و خارجی خطرات کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر حضرت علی المرتضیٰؓ جیسی عظیم شخصیت نہ ہوتی تو شاید اسلام ختم ہو جاتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کے علم و فراست کی برکت سے اسلام کی حفاظت فرمائی۔ جس طرح عہد صدیقی میں فتنہ ارتداد اور مانعین زکوٰۃ کا فتنہ پوری قوت کے ساتھ رونما ہوا تھا اور اللہ تعالیٰ نے حزم و عزم صدیقی کی برکت سے اسلام کی حفاظت کی تھی، ٹھیک اسی طرح فتنہ خوارج و شیعہ کی شدت کی وجہ سے خلافت علی المرتضیٰؓ میں زوالِ اسلام کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، اسلام تو بچ گیا لیکن ”جنگ جمل“ اور ”جنگ صفین“ جیسے دردناک

واقعات اور خونچکاں حوادث ضرور رونما ہوئے۔

(تعارف: اکفار الملحدين ص ۳۲)

نوٹ:

اس تفصیل میں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ سیدنا علیؑ کے کلام میں ”كُنْتُ مُقْبِلًا عَلَىٰ عَصَا“ یعنی معاویہ کو ”مقبِل“ (گمراہ کن) قرار دینے کے الفاظ سیدنا امام حسنؑ نے اپنے بابا سے خود سنے تھے، لہذا اس سے ثابت ہوا کہ معاویہ کے بارے میں اُن کا موقف بھی یہی تھا، کیونکہ اُن کا اپنے بابا کریمؑ کے بارے میں عقیدہ تھا کہ وہ چشمِ زدن کے برابر بھی کبھی شک و تذبذب کا شکار نہیں ہوئے۔ جیسا کہ آئندہ صفحات میں باحوالہ اُن کا کلام آرہا ہے۔

ہماری عقیدت کا عالم!

قارئین کرام! یہاں میں اپنی اور اپنے مکتب فکر کے لوگوں کی عقیدت کا نمونہ پیش کرنا چاہتا ہوں، تاکہ آپ جان سکیں کہ جب ہم ماننے پر آتے ہیں تو کتنا مانتے ہیں، لیکن ہماری عقیدت کو جاننے سے قبل یہ یاد رکھنا چاہیے کہ راقم الحروف باقاعدہ چشتی بھی ہے اور قادری بھی۔ ہم سنیوں کی عقیدت کا نمونہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں پیرانِ پیر سیدنا و مرشدنا غوثِ اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے اعلان ”قَدِمْتُ هَذِهِ عَلَى رَقَبَةِ كُلِّ وَلِيِّ اللَّهِ“ (میرا یہ قدم ہر ولی کی گردن پر ہے) کے بعد جو شخص اُن کے قدم کو اپنی گردن پر نہ مانے تو کہا جاتا ہے کہ اُس کی گردن پر سوراخ (خزیر) کا قدم ہے۔ یہ ہر اُس شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے جو سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو ولی تو مانے لیکن اُن کا قدم اپنی گردن پر نہ مانے، حالانکہ یہ فرمان قرآن کی آیت یا حدیث نبوی نہیں ہے مگر پھر بھی ہم غوثِ اعظمؑ کے اس فرمان کے منکر کو نہ جانے کیا کیا سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف جس ہستی کی اتباع کا قرآن و حدیث میں حکم آیا ہے، جس ہستی کو حدیث پاک میں محبوبِ خدا و مصطفیٰ ﷺ فرمایا گیا ہے، جس ہستی کے بارے میں فرمایا گیا کہ میں جس کا مولیٰ ہوں تو علی بھی اُس کا مولیٰ ہے، جو اُس کو مولانا نہ مانے تو اُس کا کوئی مولا نہیں، جس ہستی کے بارے میں دعا فرمائی گئی کہ اے

اللہ! جو اُس سے محبت کرے تو اُس سے محبت کر اور جو اُس سے دشمنی رکھے تو اُس کا دشمن بن جا، اور جس ہستی کی محبت کو ایمان اور بغض کو منافقت فرمایا گیا ہے، بعض طلقاء اُس ہستی کے قدم کو اپنی گردن پر تو کیا سمجھتے انہیں خلیفہ ہی تسلیم نہ کیا، انہیں امیر المؤمنین نہ مانا، اُن پر سب دشمن کیا اور اُن کے ساتھ جنگیں کیں، اس کے باوجود ہم اُن بعض طلقاء کو اپنا سیدنا، سردار، امیر المؤمنین، مجتہد اور اجر و ثواب سے مالا مال سمجھتے ہیں۔ ہماری عقیدت کا عالم تو دیکھئے! کیا ہم ایسی عقیدت پر داد و تحسین کے مستحق نہیں؟

صلح امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام و معاویہ

کراہت و ناگواری کے باوجود صلح سے کون سی صلح مراد ہو سکتی ہے؟ اس سلسلے میں کئی اقوال ہیں۔ اوپر آپ صحیحین کے حوالے سے ”تَحْسِنُہُنَّ“ (دو بھلائیوں) کا ذکر پڑھ چکے ہیں۔ اُن میں سے دوسری خیر کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

وَالْخَيْرُ الثَّانِي: إِجْمَاعُ النَّاسِ لَمَّا اضْطَلَحَ الْحَسَنُ وَمُعَاوِيَةُ، لَكِنْ كَانَ صَلَاحًا عَلَى ذَخْنٍ، وَجَمَاعَةً عَلَى أَقْدَاءٍ.

”اور دوسری خیر لوگوں کا وہ اجتماع ہے جو امام حسن اور معاویہ کی صلح کے وقت ہوا، لیکن وہ صلح کینہ پر تھی اور اجتماع کدورتوں پر تھا۔“

(منہاج السنۃ ج ۱ ص ۵۶۰)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں:

وَهَذِهِ عَلَى ذَخْنٍ، الصَّلْحُ الَّذِي وَقَعَ بَيْنَ مُعَاوِيَةَ وَالْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا.

”ناگواری کے باوجود صلح سے مراد وہ صلح ہے جو معاویہ اور سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے مابین واقع ہوئی۔“

(حجة الله البالغة ج ۲ ص ۵۷۹)

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

فِيهِ إِشْعَارٌ إِلَى أَنَّهُ صَلَاحٌ مُشْتَبٌ بِالْفَسَادِ ، فَيَكُونُ إِشَارَةً إِلَى
صُلْحِ الْحَسَنِ مَعَ مُعَاوِيَةَ وَتَقْرِئُضَ الْمُلْكِ إِلَيْهِ وَاسْتِقْرَارَ أَمْرِ الْإِمَارَةِ
عَلَيْهِ ، وَبِهِ يَظْهَرُ أَنَّ مُعَاوِيَةَ بِصُلْحِ الْحَسَنِ لَمْ يَصِرْ خَلِيفَةً .

”اس میں اس طرف باریک رمز ہے کہ وہ فساداً میز صلح ہوگی، سو اس میں سیدنا
امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی معاویہ کے ساتھ صلح، اُسے ملک سپرد کرنے اور امر امارت کا
اُس پر قرار پکڑنے کی طرف اشارہ ہے، اور اسی سے ظاہر ہوا کہ صلح امام حسن علیہ السلام کی وجہ
سے معاویہ خلیفہ نہیں ہو گیا تھا۔“

(مرقاۃ المفاتیح: کتاب الفتن، الفصل الثانی ج ۱۰ ص ۲۳ حدیث ۵۳۹۶)
ظاہر ہے کہ جو شخص اقتدار کا خواہاں تھا اُسے تو یہ صلح پسند تھی، لہذا اب یہ کوئی معنی نہ رہا کہ جسے یہ صلح
ناگوار تھی وہ کون تھا؟ اظہر من الشمس ہے کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو یہ صلح ناگوار تھی، لیکن انہوں نے جانین
کے اہل اسلام کی حفاظت کی خاطر ایک نا اہل اور غیر مستحق شخص سے صلح کر کے اُسے سلطنت سونپ دی،
حالانکہ اُس سے ہزار ہا درجہ بہتر لوگ موجود تھے، جیسا کہ ہم اُن میں سے چند حضرات کے اسماء درج کر چکے
ہیں۔ رہ گئی یہ بات کہ یہ صلح دھوکہ، خیانت اور نفاق پر ہوئی تو یہ بھی ظاہر ہے کہ دھوکہ، خیانت اور نفاق کی
نسبت اُس شخص کی طرف کی جاتی ہے جو موقع پر تو شرائط صلح کو قبول کر لیتا ہے لیکن بعد میں اُن شرائط کو پورا
نہیں کرتا۔ نیز یہ بھی ظاہر ہے دھوکہ، خیانت اور نفاق وغیرہ یہ سب ”رجس“ ہیں اور جن ہستیوں سے
”رجس“ کو دور رکھا گیا ہو تو اُن کی طرف دھوکہ خیانت اور نفاق کی نسبت کرنا قرآن و سنت کے انکار کے
مترادف ہے، لہذا یہ حقیقت از خود عیاں ہو گئی کہ دھوکہ، خیانت اور نفاق کی نسبت کا رُخ کس طرف ہے۔

جانین کے قلوب میں کدورت تھی

ظاہر اور بدیہی بات تو یہی ہے کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو معاویہ کی خلافت کے لیے نہ صرف یہ کہ
نا اہل سمجھتے تھے بلکہ مضر بھی سمجھتے تھے مگر انہوں نے تحفظِ اہل اسلام کی خاطر ناگواری کے باوجود اُس سے صلح
کر لی اور ملک اُسے سونپ دیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کدورت جانین کے دلوں میں موجود تھی۔ دونوں

طرف کے عوام کے دلوں میں بھی اور اُن کے سربراہوں کے دلوں میں بھی، لیکن دونوں طرف کی کدورتوں کی وجہ یکساں نہیں تھی بلکہ اُن میں زمین و آسمان سے بھی زیادہ فرق تھا۔ وہ کیسے؟ اس کی توضیح درج ذیل عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

بعض حکماء کی حکمتیں

یہاں سیدنا امام حسن مجتبیٰؑ اور معاویہ کے ایک دوسرے کو ناپسند کرنے کی وجوہات کے فرق کو بیان کرتے ہوئے، ہمیں بعض حکماء امت کی حکمت یاد آگئی ہے، لہذا ہم اُس حکمت پر بات کرتے ہوئے یہ فرق سمجھانا چاہتے ہیں۔ بعض حکماء امت سورۃ الحجر کی آیت: ﴿وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غَلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرٍّ مُّقْتَابِلَيْنَ﴾ (اور ہم نے اُن کے سینوں میں جو کچھ کہنے تھے سب کھینچ لیے، آپس میں بھائی ہیں تختوں پر روبرو بیٹھے) کے تحت لکھتے ہیں:

”یعنی جن جنتی لوگوں کے دلوں میں جو کینہ وغیرہ تھے وہ یہاں دور کر دیے جاویں گے جیسے حضرت علی و امیر معاویہ رضی اللہ عنہما وغیرہ حضرات۔“

(نور العرفان حاشیہ کنز الایمان ص ۴۲۱)

اس حکمت پر بات کرنے سے پہلے اِن حکیم الامت کی ایک اور حکمت بھی جان لیجئے۔ وہ لکھتے ہیں:

”صحابہ کرامؓ کے سینے آپس کے کہنے بغض و حسد سے بالکل پاک و صاف تھے

کیونکہ قرآن کریم اُن کے متعلق اس طرح صفائی بیان فرما رہا ہے:

وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ.

”اور وہ جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھی ہیں وہ کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں ایک

دوسرے پر رحم و کرم والے ہیں۔“

(امیر معاویہؓ ص ۲۲، ۲۳)

اِن دونوں حکمتوں میں سے کون سی حکمت صحیح ہے اور کون سی غلط؟ بہر حال اِن حکیم الامت کی ایسی

حکمتوں کی مثالیں بہت ہیں۔ مثلاً وہ اپنے حاشیہ ”نور العرفان علی کنز الایمان“ اور اپنی کتاب

”شان حبیب الرحمن من آیات القرآن“ میں کسی بھی شخص کے خال المومنین ہونے کی نفی کرتے ہیں جبکہ اپنی کتاب ”امیر معاویہؓ“ میں خال المومنین ہونے کا اثبات کرتے ہیں۔ شاید اُن کے نزدیک احوالِ زمانہ کے لحاظ سے حکمتوں کا بدلنا ضروری ہوگا، بہر حال اُن کی یہ حکمتیں ہماری عقل سے ماوراء ہیں۔ ہم پھر اُن کی اُس حکمت بھری تفسیر پر آتے ہیں جس میں اُنہوں نے اپنے بعض محبوبوں کے ساتھ ساتھ سیدنا علیؓ کے سینے میں بھی کینے کی بات کی ہے۔ ہمارے نزدیک اُن کی اس تفسیر میں نہ صرف یہ کہ سیدنا علیؓ کی بے ادبی ہے بلکہ قرآن و سنت سے روگردانی بھی ہے۔ اس لیے کہ اس میں کینے کی نسبت کرتے ہوئے سیدنا علیؓ اور معاویہؓ میں فرق نہیں کیا گیا۔ پہلے ہم اس آیت کا مصداق بیان کرتے ہیں پھر اس لغزش کی وضاحت کریں گے۔

﴿وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ﴾ کا مصداق کون؟

یہ آیت قیامت تک تمام مومنین کے لیے عام ہے، یعنی کسی بھی زمانے کے معاصر مومنین کے مابین دنیا میں کسی قسم کا کوئی کینہ ہوگا اور پھر انہیں جنت نصیب ہوئی تو وہاں اُن کے مابین کینہ باقی نہیں رہے گا، بطورِ شانِ نزول اس کو کسی طبقہ کے ساتھ مقید کرنا درست نہیں، کیونکہ اس کی شانِ نزول میں کوئی بھی روایت قیل و قال سے خالی نہیں۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کے تحت تقریباً پندرہ روایات درج کی ہیں لیکن اُن میں سے کوئی بھی اسنادی سقم سے مبرا نہیں۔ سند سے قطع نظر کرتے ہوئے فقط معنوی لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک دو روایتیں قابلِ فہم ہیں، مثلاً سیدنا علیؓ سے منقول ہے کہ اُنہوں نے فرمایا:

”اللہ کی قسم! یہ آیت ہم اہل بدر کی شان میں نازل ہوئی۔“

دوسری روایت بھی سیدنا علیؓ سے منقول ہے، جس میں اُنہوں نے اپنی آرزو کا یوں اظہار فرمایا ہے:

إِنِّي لَأَرْجُو أَنْ أَكُونَ أَنَا وَعُثْمَانُ وَالزُّبَيْرُ وَطَلْحَةُ بِمَنْ قَالَ اللَّهُ

﴿وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ﴾

”مجھے امید ہے کہ میں، عثمان، زبیر اور طلحہؓ اُن لوگوں میں سے ہوں گے جن

کے بارے میں ارشادِ الہی ہے: ﴿اور ہم نے اُن کے سینوں میں جو کچھ کینے تھے سب

کھینچ لیے۔“

(الدر المثور ج ۸ ص ۶۲۷، ۶۲۹)

جن حضرات کا نام سیدنا علیؑ کی طرف منسوب روایت میں آیا ہے چونکہ وہ حضرات دوسری متعدد احادیث کی رو سے جنتی ہیں اس لیے معنوی لحاظ سے ایسی روایات قابل فہم ہیں، لیکن ہمارے حکیم الامت صاحب نے جو تفسیر فرمائی ہے وہ اُن کی اپنی طبع زاد ہے، وہ تفسیر کسی حدیث، اثر (قول صحابی) اور معتبر مفسرین میں سے کسی نے بھی نہیں کی۔ کسی طبقہ یا فرد کو جنت نصیب ہونے پر یا اُسے بہشتی خیال کرنے پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا لیکن دنیا میں کسی کا نام لے کر اُسے جنتی قرار دینے کے لیے قرآن و سنت سے کسی دلیل کا ہونا ضروری ہے۔ ہمارے حکیم الامت صاحب نے سیدنا علیؑ کے ساتھ جن صاحب کا نام لیا ہے اُن کے لیے قرآن و سنت میں قطعاً ایسی کوئی دلیل نہیں آئی، حتیٰ کہ باقی دلائل تو کجا انہیں سورۃ الحدید کی مشہور آیت ﴿وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَى﴾ میں بھی شامل سمجھنا درست نہیں، کیونکہ یہ سورت فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی تھی، اور اس میں جن حضرات کے لیے وعدہ حسیٰ کا ذکر ہے وہ وہ ہیں جو صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیان مسلمان ہوئے، اور پھر یہ آیت ہے بھی جملہ خبریہ، لہذا اس میں وہ لوگ کیونکر شامل سمجھے جاسکتے ہیں جو فتح مکہ سے قبل کافر تھے؟

جنتی ہونا حسنِ خاتمہ پر موقوف

اللَّهُمَّ أَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِي الْأُمُورِ كُلِّهَا، یاد رکھنا چاہیے کہ صحیح احادیث سے نام زد شدہ کسی فرد کو جنتی قرار دینا الگ بات ہے اور جماعت یا طبقات کے لیے جنت کی بشارت کا ہونا الگ بات ہے۔ جب کسی فرد کو جنتی قرار دیا گیا تو اُس فرد کو جنتی ماننا لازم ہے، لیکن نام لیے بغیر کسی طبقہ یا جماعت کا ذکر کیا گیا تو پھر اُس طبقہ یا جماعت کے ہر شخص کے خاتمہ کا اعتبار ہوگا۔ قرآن مجید میں متعدد ایسی آیات ہیں جن میں طبقات اور جماعت کے لیے اجر عظیم اور جنت کی بشارت کا ذکر ہے اور عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ اُس جماعت یا طبقہ کے ہر فرد کا جنتی ہونا ضروری ہے لیکن درحقیقت یہ خیال درست نہیں۔ مثلاً آیت مبارکہ ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ (الفتح: ۱۸) کو مد نظر رکھتے ہوئے بیعت

رضوان میں شامل اکثر کو نہیں بلکہ تمام لوگوں کو جنتی تصور کیا جاتا ہے حالانکہ یہ درست نہیں بلکہ رضاء الہی کا یہ مژدہ فقط اُن لوگوں کے لیے تھا جنہوں نے عہد کو نبھایا اور اُس بیعت پر قائم رہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اِن الفاظ کے بعد ارشاد فرمایا:

فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ.

”تو اللہ نے جانا جو اُن کے دلوں میں ہے تو اُن پر اطمینان اتارا۔“

(الفصح: ۱۸)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

إِنَّمَا أُنْزِلَتِ السَّكِينَةُ عَلَى مَنْ عَلِمَ مِنْهُ الْوَفَاءُ.

”اِطمینان فقط اُن پر اتارا گیا جن سے وفا جانی گئی۔“

(الدر المستور ج ۱۳ ص ۴۸۳)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ تفسیر تفسیر قرآن بالقرآن ہے، اس لیے کہ اس سے قبل جس آیت میں اس بیعت کو بیعت الہی فرمایا گیا ہے وہاں ساتھ یہ بھی فرمایا گیا ہے:

فَمَنْ نَكَثَ فَإِنَّمَا يَنْكُثُ عَلَى نَفْسِهِ وَمَنْ أَوْفَى بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهِ اللَّهُ

فَسَيُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا.

”تو جس نے عہد توڑا اُس نے اپنے بڑے عہد کو توڑا، اور جس نے پورا کیا وہ

عہد جو اُس نے اللہ سے کیا تھا تو بہت جلد اللہ اُسے بڑا ثواب دے گا۔“

(الفصح: ۱۰)

اسی طرح بعض دوسری آیات سے بھی بلا استثناء تمام صحابہ کو جنتی ثابت کیا جاتا ہے، مثلاً بعض طلقاء

سے فیض کے متمنی حضرات لکھتے ہیں:

”سَيِّدُ الْمُرْسَلِينَ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّم کے تمام صحابہ کرام علیہم

الرضوان اِس امت میں افضل ہیں۔ اللہ ﷻ نے قرآن کریم میں صحابہ کرام علیہم

الرضوان کی فضیلت و مدح بیان فرمائی ہے، اُن کے بہترین عمل، عمدہ اخلاق اور حُسنِ ایمان کا تذکرہ فرمایا اور اُن نفوسِ قدسیہ کو دنیا ہی میں اپنی رضا کا مژدہ سنایا۔ چنانچہ اللہ ﷻ کا ارشاد ہے:

رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتِهَا
الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ. (پ ۱۱، التوبة: ۱۰۰)
ترجمہ کنز الایمان: اللہ اُن سے راضی اور وہ اللہ سے راضی اور ان کے لیے تیار کر رکھے
ہیں باغ جن کے نیچے نہریں بہیں ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں، یہی بڑی کامیابی ہے۔

(فیضانِ امیرِ معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، مکتبۃ المدینۃ کراچی، ص ۹)
مستقیسینِ طلقاء نے پوری آیت نقل نہیں کی، دراصل اس آیت میں تین طبقات کا ذکر ہے:

- ۱۔ مہاجرین
- ۲۔ انصار
- ۳۔ نیکل میں اُن دونوں کی پیروی کرنے والے
چنانچہ مکمل آیت یوں ہے:

وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ
بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتِهَا
الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ.

”اور سب سے آگے آگے سب سے پہلے پہلے ایمان لانے والے، مہاجرین
اور انصار سے اور جنہوں نے پیروی کی ان کی عمدگی سے، راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ اُن سے
اور راضی ہو گئے وہ اس سے، اور اس نے تیار کر رکھے ہیں اُن کے لیے باغات بہتی
ہیں ان کے نیچے ندیاں ہمیشہ رہیں گے ان میں ابد تک، یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔“

اس آیت میں جس تیسرے طبقہ کا ذکر ہے اُس کے لیے رضائے الہی اور جنت کو مہاجرین و انصار کی اتباع بالاحسان سے مشروط کیا گیا ہے، لہذا جو لوگ مہاجرین و انصار کے بعد طوعاً یا کرہاً اسلام لائے اور اُن کی اتباع سے محروم رہے وہ تیسرے طبقہ میں شامل نہیں۔ رہے اولین دو طبقے یعنی مہاجرین و انصار علیہ السلام، تو وہ بھی تمام کے تمام رضائے الہی اور جنت کے مستحق نہیں بلکہ فقط وہ مہاجرین و انصار مستحق ہیں جن کا خاتمہ ایمان پر ہوا، کیونکہ ﴿مِنَ الْمُہَاجِرِیْنَ وَالْأَنْصَارِ﴾ میں لفظ ”مِنَ“ تعجیضیہ ہے، لہذا معاذ اللہ اگر کوئی مہاجر یا انصاری خاتمہ بالا ایمان سے محروم رہا ہو تو وہ اس آیت کا مصداق نہیں ہوگا، اور یقیناً بعض اولین مہاجرین ایمان سے محروم ہو گئے تھے۔ مثلاً حضرت ام حبیبہ (رملہ بنت ابی سفیان) کا سابق شوہر عبید اللہ بن جحش اُن اولین مہاجرین میں سے تھا جنہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی مگر وہاں جا کر اُس نے نصرانیت اختیار کر لی تھی اور مرتد ہو گیا تھا۔ اس کے مرتد ہو جانے کا تذکرہ تقریباً ہر اُس کتاب میں موجود ہے جس میں حضرت ام حبیبہ کے ساتھ نبی کریم ﷺ کے نکاح کا ذکر موجود ہے۔ صحابہ کرام علیہ السلام کی سوانح پر مبنی کتب میں بھی اس شخص کا ذکر موجود ہے، چنانچہ مشہور و متداول کتب ”الاستیعاب، اسد الغابۃ“ اور ”الإصابة“ میں بھی حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا رملہ بنت ابی سفیان کے ترجمہ میں عبید اللہ بن جحش کے مرتد ہو جانے کا تذکرہ موجود ہے۔

معلوم ہوا کہ ان دو آیات یا کسی بھی آیت اور صحیح حدیث سے تمام کے تمام صحابہ کو جنتی قرار دینا یا تو عدم تدبیر پر مبنی ہے یا پھر بعض بغاۃ و طلقاء کو ناجائز طور پر [Secure] کرنا اور تحفظ دینا مقصود ہے۔ صحابی ہو یا غیر صحابی ہر ایک کا معاملہ ”الْأَعْمَالُ بِالْأَعْمَالِ“ یعنی انجام کے مطابق ہی ہوگا، ورنہ وہ بھی صحابہ ہی ہوں گے جنہیں حوض کوثر سے دھتکار دیا جائے گا اور وہ بھی صحابہ ہی تھے جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

فِي أَصْحَابِي اثْنَا عَشَرَ مَنَاقِبًا ، فِيهِمْ ثَمَانِيَّةٌ لَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّى يَلْجَأَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخَيْاطِ .

”میرے صحابہ میں بارہ مناقب ہیں، اُن میں سے آٹھ جنت میں داخل نہیں ہوں گے

یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے سوراخ میں داخل ہو۔

(مسلم: کتاب صفات المنافقین وأحكامهم، باب ۱، ص ۱۲۸۲، حدیث ۲۷۷۹)

یہی وجہ ہے کہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو بعض لوگوں کی نماز جنازہ پڑھانے سے منع کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ منافق ہے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ رک جاتے اور دوسرے حضرات کو فرماتے کہ اس کی نماز جنازہ پڑھا دو۔ ظاہر ہے کہ جب منافقین کی نماز جنازہ پڑھائی جاتی ہوگی تو لامحالہ انہیں جنت البقیع یا مسلمانوں کے کسی بھی قبرستان میں دفن بھی تو کیا جاتا ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ تمام کے تمام صحابہ کو یا صحابی کہے جانے والے ہر شخص کو جنتی تصور کر لینا عدم تدبر پر مبنی ہے۔ حسن ظن تو اچھی بات ہے مگر ہر صحابی کو جنتی قرار دینے والے لوگوں سے پوچھئے کہ اُن کے نزدیک وہ صحابہ بھی جنتی ہیں جن کو خلیفہ ثالث حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے قاتلین میں ذکر کیا جاتا ہے؟ نیز بسر بن ابی ارمطہ بھی صحابی تھا اور قاتلین عمار بن یاسر بھی صحابی تھے، اُن کے بارے میں کیا حکم ہے؟ سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کو قتل کرنے کے لیے جو ناپاک ہاتھ استعمال ہوئے تھے وہ ایک صحابی ہی کے ہاتھ تھے اور اُس شخص کا قاتل عمار ہونا مشکوک نہیں معلوم ہے، اُس کو ابوالغاد یہ کہا جاتا تھا۔ چنانچہ امام ابن عبد البر اور دوسرے علماء نے لکھا ہے:

”یہ صحابی تھا اور اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث بھی سنی تھی:

لَا تَوَجِّعُوا بَعْدِي كُفَّارًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ.

”میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں اڑانے لگو۔“

یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا محبت تھا اور سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کا قاتل تھا، اور

جب یہ معاویہ وغیرہ سے اندر آنے کی اجازت مانگتا تو کہتا: ”قَاتِلُ عُمَارٍ بِالْبَابِ“

(عمار کا قاتل دروازے پر حاضر ہے) جب اس سے سیدنا عمار بن یاسر کے قتل کی کیفیت

پوچھی جاتی تو وہ بلا شرم و حیا وہ کیفیت بیان کر دیتا تھا۔ اہل علم نے اس پر بڑا تعجب کیا

ہے کہ ایک طرف اُس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ بالا حدیث مروی ہے اور دوسری

طرف وہ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کا قاتل بھی ہے۔“

(الاستیعاب فی معرفة الأصحاب: کتاب الکنى، باب الغین، ج ۲ ص ۴۴۶؛ أسد الغابة ج ۶ ص

۲۳۱؛ الإصابة ج ۷ ص ۲۵۹)

سوا ابو الغادیہ الجعفی صحابی تھا مگر سالفین (عہد حسن لوگوں) میں شامل ہو کر سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کا

قاتل بن گیا، حالانکہ خود اُس کے ہی بعض سربراہوں سے یہ حدیث منقول ہے:

قَاتِلُ عَمَّارٍ وَسَائِلُهُ فِي النَّارِ.

”عمار کا قاتل اور اُس کا سامان لوٹنے والا جہنمی ہے۔“

(المستدرک: کتاب معرفة الصحابة، ذکر شهادة عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما ج ۳ ص ۳۸۷؛ سلسلة

الأحاديث الصحيحة للألبانی ج ۵ ص ۱۸؛ حديث ۲۰۰۸؛ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما رجل المحنة و

ميزان الفتنة، لأسامة بن أحمد ص ۱۸۵، ۱۸۶)

براہ راست سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کے قاتل کے بارے میں تو یہ واضح حدیث آگئی، کیا اس کے

سربراہ اور اُس کے عمل پر راضی رہنے والے کے بارے میں بھی کوئی حدیث ہے؟ اس سلسلے میں درج ذیل

حدیث سے روشنی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اہم ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

إِذَا غُمِلَتْ الْخَطِيئَةُ فِي الْأَرْضِ كَانَ مَنْ شَهِدَهَا فَكُفِّرَ هَهَا، كَانَ كَمَنْ

غَابَ عَنْهَا، وَمَنْ غَابَ عَنْهَا فَرَضِيهَا كَانَ كَمَنْ شَهِدَهَا.

”جب زمین میں کوئی گناہ کیا جائے، جو شخص وہاں موجود ہو اور وہ اُس گناہ کو

پسند نہ کرے تو وہ اُس شخص کی طرح ہے جو وہاں موجود نہ ہو، اور جو وہاں سے غائب ہو

اور اُس گناہ پر راضی ہو تو وہ اُس شخص کی طرح ہے جو وہاں موجود ہو۔“

(سنن أبی داؤد: کتاب الملاحم، باب الأمر والنهي، ج ۴ ص ۳۳۳؛ حديث ۴۳۴۵؛ ذم الکلام

للهروي ج ۲ ص ۱۵۷؛ حديث ۳۰۶؛ مجمع الزوائد ج ۷ ص ۲۹۰)

زیادہ تفصیل میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ حدیث پاک میں واضح طور پر اصول بیان فرما

دیا گیا ہے:

لَا إِقَامَ الَّذِي عَلَى النَّاسِ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ ، أَلَا لَكُمْ رَاعٍ ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ .

”پس وہ شخص جو لوگوں پر حاکم ہے وہ راعی ہے اور وہ اپنی رعایا کے متعلق جواب دہ ہوگا، سنو! تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور اُس سے اُس کی رعایا کے بارے میں باز پرس ہوگی۔“

(بخاری: کتاب الأحکام، باب ۱، ص ۹۸۶ حدیث ۷۱۳۸)

اسی لیے حدیث شریف میں سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے قتل میں فقط معاویہ کے سپاہی ابوالغادیہ کو ہی جہنمی نہیں کہا گیا بلکہ جس گردہ میں ابوالغادیہ تھا اُس پورے گردہ کو ”داعی الی النار“ فرمایا گیا ہے۔ بتائیے! نواب محمد اکبر بکٹی مرحوم کا قتل تو سپاہیوں کے ہاتھوں سے ہوا مگر اُس کی FIR اُس دور کے حاکم کے خلاف کیوں درج کرائی گئی؟ اس لیے کہ ریاستی قتل میں عقلاً اور نقلاً اصل قاتل سربراہ مملکت ہی ہوتا ہے، بنی اسرائیل کے بچوں کو فرعون کے سپاہی قتل کرتے تھے مگر اللہ عزوجلہ نے اصل قاتل فرعون کو قتل کر دیا ہے۔

رِجْس سے پاک سینے میں بھی کینہ؟

بعض حکماء امت نے پہلے تو بعض طلقاء اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ﴿عَلَى مَسْرُورٍ مُّثَقَّابِلَيْنِ﴾ (تختوں پر رو برو بیٹھے) سے استدلال کرتے ہوئے جنت میں آنے والے سمجھا دیا، پھر اُن دونوں کے سینوں میں کینے کے موجود ہونے کی بات کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مبارک سینے میں معاویہ کے لیے غل کینہ تھا، معاذ اللہ۔ یاد رکھئے! سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے سینے میں کسی انسان کے لیے ”غل“ کی بات کرنا بے ادبی ہی نہیں بلکہ قرآن و سنت کے بھی خلاف ہے۔ علامہ لغت و تفسیر نے لفظ ”غِل“ کے معانی دھوکہ، خیانت، سرقہ اور کینہ سے کیے ہیں، اور ان میں سے کوئی بھی معنی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی ذات پاک کے لیے کرنا حکمت نہیں بلکہ حماقت ہے، کیونکہ دھوکہ، خیانت، سرقہ اور کینہ وغیرہ سب سینے کی بیماریاں ہیں اور قرآن مجید ایسی تمام بیماریوں کے لیے شفاء ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَ تَكْمٌ مُوَعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ.
 ”اے لوگو! آگئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے پروردگار کی طرف سے اور شفاء
 اُن روگوں کے لیے جو سینوں میں ہیں۔“

(یونس: ۵۷)

جب قرآن سینے کے تمام روگوں کے لیے شفاء ہے تو پھر اُس ہستی کے سینے میں کسی کے لیے کینہ
 کیونکر ہو سکتا ہے جن کے لیے ارشاد ہوا کہ ”علی قرآن کے ساتھ اور قرآن علی کے ساتھ“۔ علاوہ ازیں سیدنا
 علیؑ کا شمار اہل کساء علیہم السلام میں ہوتا ہے اور اہل کساء سے رجس کو دور کر دیا گیا ہے۔ رجس
 ہر اُس بُری چیز کو کہتے ہیں جو عقلاً، شرعاً اور طبعاً تمام حیثیتوں سے بُری ہو، لہذا جو ہستی ایسی تمام حالتوں سے
 منزہ اور بہرہ اہل ہو اُن کے سینے میں کسی کے لیے کینہ کا قول کرنا کیونکر درست ہو سکتا ہے؟ محتوی لحاظ سے کینہ
 رجس (پلیدی) ہے، اور کسی سینے میں پلیدی اور طہارت دونوں کا اجتماع کیونکر ممکن ہے؟ بلکہ اہل بیت
 حضرات نے قرآن مجید سے استنباط کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اہل بیت کرام علیہم السلام فقط ظاہری نہیں
 بلکہ عین طہارت ہیں۔

کیا رجس اور طہارت کا اجتماع ممکن ہے؟

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ مشہور حدیث ”سَلَمَانٌ مِنَّا أَهْلُ الْبَيْتِ“ کی تشریح میں

لکھتے ہیں:

وَلَمَّا كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَبْدًا مَحْضًا قَدْ طَهَّرَهُ اللَّهُ وَأَهْلَ بَيْتِهِ
 تَطْهِيرًا وَأَذْهَبَ عَنْهُمْ الرِّجْسَ ، وَهُوَ كُلُّ مَا يَشِينُهُمْ ، فَإِنَّ الرِّجْسَ هُوَ
 الْقَدْرُ عِنْدَ الْعَرَبِ ، هَكَذَا حَكَى الْقُرَاءُ. قَالَ تَعَالَى: ﴿ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ
 لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ﴾ فَلَا يُضَافُ
 إِلَيْهِمْ إِلَّا مُطَهَّرٌ ، وَلَا بُدَّ لِإِنَّ الْمُضَافَ إِلَيْهِمْ هُوَ الَّذِي يَشْبَهُهُمْ ، فَمَا
 يُضَيَّفُونَ لِأَنْفُسِهِمْ إِلَّا مَنْ لَهُ حُكْمُ الطَّهَارَةِ وَالْقُدُسِ ، فَهَذِهِ شَهَادَةٌ مِنْ

النَّبِيِّ ﷺ لِسَلْمَانَ الْفَارِسِيِّ بِالطَّهَارَةِ وَالْحِفْظِ الْإِلَهِيِّ وَالْعِصْمَةِ حَيْثُ قَالَ فِيهِ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: سَلْمَانُ مِنَّا أَهْلُ الْبَيْتِ وَشَهِدَ اللَّهُ لَهُمْ بِالتَّطَهُّرِ وَذَهَابِ الرَّجَسِ عَنْهُمْ. وَإِذَا كَانَ لَا يُضَافُ إِلَيْهِمْ إِلَّا مُطَهَّرٌ مُقَدَّسٌ وَحَصَلَتْ لَهُ الْعِنَايَةُ الْإِلَهِيَّةُ بِمُجَرَّدِ الْإِضَافَةِ، فَمَا ظَنُّكَ بِأَهْلِ الْبَيْتِ فِي نُفُوسِهِمْ فَهُمْ الْمُطَهَّرُونَ بَلْ هُمْ عَيْنُ الطَّهَارَةِ.

”کیونکہ رسول اللہ ﷺ خالص عبد ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور آپ کے اہل بیت کو کامل طہارت سے نوازا اور اُن سے رجس کو دور کر دیا، اور ہر معیوب چیز رجس ہے، کیونکہ عرب کے نزدیک رجس ہر نامناسب چیز کو کہتے ہیں، جیسا کہ امام فراء نے بیان کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: (اللہ تعالیٰ تو یہی چاہتا ہے کہ تم سے دور کر دے پلیدی کو اے اہل بیت اور تمہیں پوری طرح پاک صاف کر دے) پس اہل بیت کرام علیہم السلام کی طرف فقط پاک کی ہی نسبت کی جاسکتی ہے، اور لازمی ہے کہ اُن کی طرف اُسے منسوب کیا جائے جو اُن کے مشابہ ہو، پس اہل بیت اپنی طرف نہیں منسوب کریں گے مگر اسی کو جس کے لیے طہارت و تقدیس کا حکم حاصل ہو، پس رسول اللہ ﷺ نے سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے حق میں طہارت، حفظ الہی اور عصمت کی شہادت دی، جب آپ نے فرمایا: سلمان ہم اہل بیت سے ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے اہل بیت کرام علیہم السلام کے لیے تطہیر اور ہر عیب سے منزہ ہونے کی گواہی دی ہے، اور جب اُن کی طرف فقط وہ مطہر و مقدس شخص ہی منسوب ہو سکتا ہے جس کو یہ عنایت الہی محض اسی نسبت کی وجہ سے حاصل ہوئی تو پھر اہل بیت کرام علیہم السلام کے نفوس کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے جو طاہرین ہی نہیں بلکہ عین طہارت ہیں۔“

(الفتوحات المکیة ج ۱ ص ۲۹۸؛ فضل اہل البیت للمقریزی ص ۴۴؛ فیض القدير للمناوي

ج ۴ ص ۱۰۶؛ فتاویٰ رضویہ ج ۱۵ ص ۷۳۶)

حکیم الامت جیسے حضرات کو غور کرنا چاہیے کہ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اہل بیت کرام علیہم السلام کو عین طہارت تسلیم کیا ہے، لہذا اگر کسی عقل مند مسلمان کے نزدیک رجس اور عین طہارت کا اجتماع ممکن ہو تو پھر مولا علی علیہ السلام کے مقدس و مطہر سینہ کو ”الْحُبُّ فِي اللَّهِ“ اور ”الْبُغْضُ فِي اللَّهِ“ سے معمور ہونے کے ساتھ ساتھ ذاتی کینے سے بھرپور بھی ماننا ہوگا، اور پھر سمجھنا پڑے گا کہ جب سیدنا علی علیہ السلام کے ساتھ حق ہوتا تھا تو ساتھ ساتھ کینہ بھی ہوتا تھا، جب کسی میدان میں اُن کے ساتھ قرآن ہوتا تھا تو ساتھ کینہ بھی ہوتا تھا، اور آقائے کائنات علیہ السلام نے اُن کے حق میں جو دعا فرمائی تھی:

اللَّهُمَّ اَدِرِ الْحَقَّ مَعَهُ حَيْثُ دَارَ.

”اے اللہ! جس جگہ علی جائے اُس کے ساتھ حق کو جاری رکھ۔“

(الجامع الکبیر وهو سنن الترمذی: کتاب المناقب، باب مناقب علی بن ابی طالب، ج ۶ ص ۸۰، ۷۹ حدیث ۳۷۱۴ المستدرک، کتاب معرفة الصحابة، ذکر مناقب علی بن ابی طالب علیہ السلام ج ۵ ص ۳۲۷ حدیث ۴۶۸۸، دارالتأصيل ۲۰)

اس دعائے نبوی علیہ السلام کی تاثیر میں یہ بات بھی تسلیم کرنا ہوگی کہ جب اُن کی کسی کے خلاف جنگ ہوئی تھی تو جہاں اُنہیں حق کی سمیت حاصل تھی وہاں کینہ بھی اُن کے ساتھ تھا۔

حکیم الامت ہو تو ایسا ہو جو نور و ظلمت، رجس و طہارت اور حق و کینہ کو جمع کر سکے۔ ہمارے حکیم الامت نے کمال کر دیا کہ اُنہوں نے رجس و طہارت اور حق و کینہ کو جمع کر دیا جبکہ شاہ اسماعیل شہید بیچارے سے کچھ نہ ہو سکا، وہ مذکورہ بالا احادیث کی طرح کچھ مزید احادیث جمع کر کے سیدنا علی علیہ السلام کے حق میں عصمت تک کا قول کر گئے۔ تفصیل کے لیے ہماری کتاب ”اہل کساء علیہم السلام کا مقام، حقائق و ادوہام“ کا دوسرا ایڈیشن ملاحظہ فرمائیں۔ نیز کتاب ہذا میں بھی صفحہ [۱۸۲] پر اُن کا کلام آ رہا ہے۔

مرتضیٰ علیہ السلام کے سینے میں بھی کینہ؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سیدنا علی علیہ السلام کے مبارک سینے میں معاویہ کے لیے کینہ نہیں تھا تو پھر اُنہوں نے اُس کے ساتھ جنگ کیوں کی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اُنہوں نے الْحُبُّ لِلَّهِ وَالْبُغْضُ لِلَّهِ (اللہ کی

خاطر محبت اور اللہ کی خاطر بغض) کو مد نظر رکھتے ہوئے امام البغاة سے جنگ کی تھی اور حکم الہی پر عمل کیا تھا، اور اس جنگ کی نبی کریم ﷺ پہلے ہی پیش گوئی فرما چکے تھے کہ ہم نے تنزیل قرآن کی تکمیل کے لیے جنگیں کیں اور علی تاویل قرآن پر جنگیں کریں گے۔

کیونکہ تو اپنی ذات کی خاطر ہوتا ہے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ اس قدر علو الہمۃ (بلند فکر کے حامل) تھے کہ اپنی خاطر کسی پر غضب ناک ہونا اُن کے شایان شان ہی نہیں تھا۔ خود نبی کریم ﷺ نے اُن کی اعلیٰ ظرفی اور بلندی ہمتی کا اعلان فرمایا ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل مستد ابی سعید خدری رضی اللہ عنہ میں اپنی سند کے ساتھ ایک حدیث لائے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

أَيُّهَا النَّاسُ لَا تَشْكُوا عَلِيًّا فَإِنَّ اللَّهَ إِنَّهُ لَا يَخْشَنُ فِي ذَاتِ اللَّهِ أَوْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ.

”لوگو! علی کی شکایت نہ کیا کرو، خدا کی قسم! وہ ذات الہی یا راہ الہی میں سب سے زیادہ سخت ہیں۔“

(مسند احمد ج ۱۸ ص ۳۳۷ حدیث ۱۱۸۱۷؛ فضائل الصحابة للإمام أحمد ج ۲ ص ۸۴۵ حدیث ۱۱۶۱؛ غایۃ المقصد فی زوائد المسند ج ۳ ص ۳۷۰ حدیث ۳۶۵۷؛ المستدرک: کتاب معرفة الصحابة ج ۳ ص ۱۴۵ حدیث ۴۶۵۴؛ حلیۃ الأولیاء ج ۱ ص ۶۸؛ جامع المسانید لابن الجوزی ج ۳ ص ۹۲ حدیث ۱۹۷۹؛ تقریب البغیۃ للہیثمی ج ۳ ص ۱۰۱ حدیث ۳۳۰۲؛ البدایۃ والنہایۃ ج ۷ ص ۵۷۲؛ جامع المسانید لابن کثیر ج ۱۲ ص ۴۸۸ حدیث ۸۷۰؛ المسند الجامع ج ۶ ص ۴۷۹ حدیث ۴۶۵۶؛ در السحابة للشوکانی ص ۲۲۳)

امام حاکم نے اس حدیث کو شیخین کی شرط کے مطابق صحیح کہا ہے اور امام ذہبی نے اُن کی موافقت فرمائی ہے، اور حافظ یثربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

(مجمع الزوائد ج ۹ ص ۱۲۹، ووط: ج ۱۸ ص ۲۹۶ حدیث ۱۴۷۳۶)

علامہ سندھی لکھتے ہیں:

أَيُّ أَنْ فِيهِ خَشَوْنَةٌ فِي اللَّهِ ، لَا يُرَاعِي فِيهِ أَحَدًا ، وَهَذَا لَا يُوجِبُ
الْمُسْكَاتَةَ مِنْهُ .

”یعنی سیدنا علیؑ کے دل میں اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں سختی ہے، جس میں وہ کسی کی رعایت نہیں کرتے، اور یہ چیز اُن پر اعتراض کا موجب نہیں ہو سکتی۔“

(حاشیہ مسند احمد للسندھی ج ۷ ص ۵۵ تعلیقات علی مسند احمد: للشعيب الأرناؤوط ج ۱۸ ص ۳۳۷)

زبان نبوی ﷺ کی ضمانت سے معلوم ہوا کہ حیات نبوی یا بعد از وصال نبوی ﷺ سیدنا علیؑ کا ہر ہر اقدام ذات الہی کی خاطر تھا، لہذا یہ سمجھنا کہ کسی کے بارے میں سیزہ مرتضوی میں کینہ تھا کتاب و سنت دونوں کے خلاف ہے۔

علی کے خلاف سینے بھر پورا زکینے

کتاب و سنت سے ثابت ہے کہ سیزہ مرتضوی میں تو کسی کے لیے کوئی کینہ نہیں تھا لیکن اُن کے خلاف کچھ لوگوں کے سینوں میں کینہ ضرور تھا۔ چنانچہ سیدنا علیؑ سے منقول ایک حدیث نبوی ﷺ کے دوسرے حصہ میں ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ انہیں اپنے مبارک سینے سے لگا کر رو پڑے تو انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کو کیا چیز رلاتی ہے؟ فرمایا:

ضَمَانِي فِي صَلَواتِ أَقْوَامٍ لَا يُبْذَوْنَ لَهَا لَكَ إِلَّا مِنْ بَعْدِي ، قَالَ :
قُلْتُ : يَا رَسُولَ اللَّهِ فِي سَلَامَةٍ مِنْ دِينِي؟ قَالَ : فِي سَلَامَةٍ مِنْ دِينِكَ .

”تمہارے بارے میں تو مومنوں کے سینوں میں کینے ہیں جن کو وہ میرے بعد ہی ظاہر کریں گے۔ فرماتے ہیں: میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے دین کی سلامتی میں؟ فرمایا: تمہارے دین کی سلامتی میں۔“

(مسند ابی یعلیٰ (فی مسند علی) ج ۱ ص ۴۲۶، ۴۲۷، حدیث ۵۶۵ مسند البزار ج ۲ ص ۲۹۳)

حدیث ۷۱۶؛ المناقب للمکی ص ۶۵؛ إتحاف الخیرة المہرۃ ج ۷ ص ۱۹۱ حدیث ۶۶۵۲،
وط: ج ۹ ص ۲۵۳ حدیث ۷۹۳۴؛ كشف الأستار ج ۳ ص ۱۸۳ حدیث ۲۵۲۳؛ المقصد العلی
للہیثمی ج ۲ ص ۱۸۰ حدیث ۳۱۲۱؛ مختصر زوائد البزار للعسقلانی ج ۲ ص ۳۱۳ حدیث
۱۹۲۲؛ المطالب العالیۃ ج ۱۶ ص ۱۰۱ حدیث ۳۹۳۳؛ تاریخ دمشق ج ۴۲ ص ۳۲۲، ۳۲۳؛
إزالة الخفاء ج ۴ ص ۵۰۵)

حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اس حدیث کو امام ابو یعلیٰ اور امام بزار نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں فضل بن عیرہ ہے، امام
ابن حبان نے اس کی توثیق فرمائی ہے اور دوسروں نے تضعیف، اور باقی تمام راوی ثقہ ہیں۔

(مجمع الزوائد، باب مناقب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، باب بشارتہ بالجنة ج ۹ ص ۱۱۸،

(۱۱۹)

اس حدیث کے پہلے حصہ کو امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی روایت کیا ہے اور ان کی سند میں یہ راوی
فضل بن عیرہ بھی موجود ہے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے لکھا ہے:

هَذَا حَدِيثٌ صَحِيحُ الْإِسْنَادِ وَلَمْ يُخَوَّرْ جَاهًا.

”یہ حدیث صحیح السند ہے اور بخاری و مسلم نے اس کو روایت نہیں کیا۔“

جبکہ امام ذہبی نے لکھا ہے:

”صحیح ہے۔“

(المستدرک علی الصحیحین، کتاب معرفة الصحابة، ومن مناقب أمير المؤمنين علي بن أبي

طالب رضی اللہ عنہ، ج ۳ ص ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱ حدیث ۴۶۷۲)

اس حدیث کی سند و متن کی صحت کے عملی شواہد اتنے زیادہ ہیں کہ قلب سلیم کو انکار کی مجال ہی نہیں
رہتی اور ماننا پڑتا ہے کہ زبان نبوی ﷺ سے جو الفاظ صادر ہوئے تھے وہ پورے ہو کر رہے۔ چنانچہ وہ علی جو
تمام کے تمام غزوات میں مین آف دی جہاد تھا، جواد المسلمین تھا، جو محبوب خدا و مصطفیٰ ﷺ تھا، نہ صرف

یہ کہ اُس کی خلافت سے انکار کیا گیا بلکہ مساجد کے منبروں پر اُسے سب و شتم کیا گیا۔ بغض و کینہ کی حد دیکھئے کہ جو ہستی اس قدر اسلامی تمنوں سے مالا مال تھی اُن کی عظمتوں کے اعتراف کی بجائے اُن پر لعنت کی جانے لگی۔ خود سوچئے کہ سیدنا علیؑ کے ساتھ بغض و کینہ کی اس سے بڑھ کر عملی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے؟

صحابی کا سینہ اور کینہ؟

حدیث میں ”صَغَانُنْ لِّیْ صَلَوَاتُہُمْ اَوْ اَمَامُ“ یعنی سیدنا علیؑ کے لیے قوموں کے سینوں میں کیوں کا ذکر آیا ہے، نامعلوم اس سے یہود و نصاریٰ اور مسلم و غیر مسلم کون کون سی اقوام مراد ہیں، تحقیق سے اسی پتہ چلے گا، تاہم تردید و انقض میں شہرہ آفاق مصنف شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اہل تحقیق محدثین کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

”محققین اہل حدیث نے بعد تتبع روایات دریافت کیا ہے کہ یہ حرکات شاہد نفسانی سے خالی نہ تھے، اس تہمت سے خالی نہیں کہ جناب ذوالنورین حضرت عثمانؓ کے معاملہ میں جو تعصب امویہ اور قرشیہ میں تھا اسی کی وجہ سے یہ حرکات حضرت امیر معاویہ سے وقوع میں آئے، جس کا غایت نتیجہ یہی ہے کہ وہ مرتکب کبیرہ اور باغی قرار دیے جائیں۔ وَالْفَاسِقُ لَیْسَ بِاَہْلِ اللِّغْنِ۔ ترجمہ: فاسق قابلِ لعن نہیں۔“

(فتاویٰ عزیزی کامل ص ۴۱۳)

اسی حقیقت کو بعض فضلاء دیوبند نے بھی بیان کیا ہے اور اُن کے کلام سے اُس باطل خیال کی بھی تردید ہوتی ہے جس کا اظہار ہمارے بعض حکماء امت نے سورۃ الحجرات کی آیت کی تفسیر میں کیا ہے۔ چنانچہ فاضل دیوبند علامہ سعید احمد اکبر آبادی نے معاویہ کی مولانا علیؑ کے ساتھ جنگ کو ہاشمی اور اموی رقابت کی وجہ بتایا ہے، انہوں نے اس بات کو ایک عمدہ تمہید کے ساتھ شروع کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ معاویہ دیر سے اسلام لائے تھے اس لیے انہیں اکتساب فیض نبوی کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

”مراتب ایمانی کا تفاوت: عصبیت و جاہلیت کی ہلاکت آفرینی اور اسلام میں

اس کی شدید مذمت معلوم کرنے کے بعد اب ذرا اس پر غور کیجئے کہ قطع نظر اس بحث

سے جو ائمہ محدثین نے ”الْاِيْمَانُ يَزِيْدُ وَيَنْقُصُ“ کے باب میں کی ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ ایمان جس اذعائی کیفیت کا نام ہے، اُس میں اشداد و ضعف دونوں کی استعداد ہوتی ہے۔ اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح آج کل مسلمان مسلمان سب یکساں نہیں ہوتے بلکہ مراتب ایمانی میں متفاوت ہوتے ہیں۔ اسی طرح صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی اس مرتبہ میں یکساں اور برابر کے درجہ کے نہیں تھے۔ خود اپنی ذاتی استعداد اور فطری صلاحیت، افتادِ طبع اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آنحضرت ﷺ کے شرفِ محبت کی زیادتی اور کمی کے باعث ان برگزیدہ ہستیوں میں بھی باہمی فرق و امتیاز تھا۔

تمثیلاً حضرت معاویہ کو ہی لیجئے، اُن کی شان میں کسی غیر صحابی کو گفتگو کرنے کی کیا مجال ہے، تاہم یہ حقیقت ہے کہ آپ چونکہ فتح مکہ کے بعد اپنے والد ماجد ابوسفیان کے ساتھ مسلمان ہوئے تھے، اس لیے آپ کو خلفاء اربعہ کی طرح آنحضرت ﷺ کی خدمتِ اقدس میں رہنے اور براہِ راست آفتابِ نبوت و رسالت سے کسبِ فیض کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش کے ایک معزز اور نامور خاندان سے تعلق رکھنے کے باعث آپ میں جو عمدہ صفات تھیں، مثلاً سیاسی تدبیر، استقامت و استقلال اور شہامت و شجاعت اسلام قبول کرنے کے بعد اُن پر اور جلا ہو گئی اور اُن قوتوں کا مصروفِ بدل گیا۔

تاہم بنو امیہ اور بنو ہاشم میں جو باہمی رقابت مدت سے چلی آرہی تھی، امیر معاویہؓ کو اُس سے خالی الذہن نہیں کہا جاسکتا۔ حضرت علیؓ کے مقابلہ میں اُنہوں نے جو کچھ کیا، اُس میں دوسرے عوامل و اسباب کی طرح اس رجحان کو بھی بڑا دخل ہے۔ ممکن ہے حضرت علیؓ پر بھی یہ شبہ کیا جائے لیکن یہ پھر بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت علیؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں کوئی عمل ایسا نہیں کیا جس کو خاندانی رقابت کے زیر اثر اور اسلام

کی تعلیمات یا اُس کی روح کے خلاف کہا جائے۔

(مسلمانوں کا عروج و زوال: ص ۴۵)

ہر چند کہ علامہ موصوف کے مکمل اقتباس سے ہمیں اتفاق نہیں ہے، کیونکہ اس اقتباس کے بعض جملے بعض احادیث نبویہ کے خلاف ہیں، تاہم مجموعی لحاظ سے اُن کا تجزیہ درست ہے۔ اُن کے تجزیہ سے دوسرے فوائد کے ساتھ ساتھ بعض حکماء امت کی حکمت کی قلعی بھی کھل گئی۔ وہ اس طرح کہ جب کوئی صحابی باہمی رقابت و کینہ وغیرہ سے اس قدر پاک ہوتا تھا جس قدر اُسے صحبت نبوی میسر آتی تھی تو پھر سوچئے کہ بعض حکماء امت کا بعض طلقاء کے ساتھ ساتھ سیدنا علیؑ کی طرف بھی کینہ کی نسبت کرنا کتنا بڑا ظلم ہے؟ ذرا غور تو فرمائیے کہ حکیم الامت نعیمی نے ایسی ہستی کی طرف کینے کی نسبت کر دی ہے جو صرف اعلان نبوت کے بعد والے مکمل تحیس (۲۳) برس ہی فیضانِ مصطفیٰ ﷺ سے مستفیض و مستفید نہیں ہوتی رہی بلکہ انہیں کھٹی کے وقت سے ہی آغوش نبوی میں آنے کی سعادت حاصل ہو گئی تھی، اور اُن کا ایمان و اسلام سب کچھ طوعاً تھا کرھا نہیں تھا۔ وہ بھوکے رہ کر بھی فیضانِ نبوی ﷺ کی جستجو میں رہتے تھے جبکہ بعض لوگوں کو بارگاہ نبوی میں طلب کیا گیا تو انہیں کھانا چھوڑ کر آنا گوارا نہ ہوا۔ سو یہ عاجز انتہائی کرب و اضطراب کے ساتھ یہ لکھنے پر مجبور ہے کہ ایک ہی جملہ میں بعض طلقاء اور مرتضیٰ شیر خدا کی طرف برابر کینے کی نسبت کرنا جہاں قرآن و سنت میں عدم تدریک بدترین مظاہرہ ہے وہیں بارگاہِ مرتضوی کی تنقیص و بے ادبی کی بھی بدترین مثال ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح سیدنا علیؑ اور معاویہ کی جنگ میں ایک طرف النَصِيْحَةُ لِلَّهِ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ (اللہ ﷻ، اُس کے رسول ﷺ اور مومنین کے لیے خیر خواہی) کا جذبہ کارفرما تھا اور دوسری طرف دنیا داری اور قومی تعصب تھا، اسی طرح سیدنا امام حسن مجتبیٰؑ اور معاویہ کی مصالحت میں بھی ایک طرف دینی جذبہ تھا تو دوسری طرف ذاتی مفاد تھا، اسی لیے اُس صلح کو هُدْنَةُ عَلِيٍّ دَعْنِ کہا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰؑ کے قلبِ اقدس میں بعض بغاۃ کے لیے البَغْضُ فِي اللَّهِ کا جذبہ تھا جبکہ بعض بغاۃ کے سینہ میں اُن کے خلاف خدع، کمر اور کینہ تھا، جیسا کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے اور جیسا کہ سیدنا مقدم بن معدیکربؑ کی حدیث کے متن سے ہی ظاہر ہے۔

شاہ عبدالعزیز اور حکیم الامت کے اقوال کا جائزہ

ابھی ابھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ قاطع رافضیت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور فاضل دیوبند علامہ سعید احمد اکبر آبادی نے ایک صحابی، فقیہ، مجتہد، کاتب وحی اور خال المومنین کی طرف شائبہ نفسانی، اُموی تعصب اور خاندانی رقابت کی نسبت کرنے میں کوئی تاثر نہیں کیا، حالانکہ یہ انتہائی خطرناک قول ہے، کیونکہ خاندانی رقابت یا تعصب ایک ہی چیز ہے اور اسی سے ضغن یعنی بغض اور کینہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ قول انتہائی خطرناک اس لیے ہے کہ عداوت و بغض بندے کو کفر تک پہنچا دیتے ہیں۔ چنانچہ اعلیٰ حضرتؒ لکھتے ہیں:

”حضرت علی المرتضیٰ سے جنگ کرنے والا اگر ان سے عداوت و بغض کی وجہ سے کرتا ہے تو اہل سنت کے نزدیک بالاجماع وہ کافر ہے۔“

(فتاویٰ رضویہ ج ۱۵ ص ۲۳۵)

اور حکیم الامت نعیمی نے بھی کچھ ایسا ہی لکھا ہے، پہلے انہوں نے اس حدیث کا یوں ترجمہ کیا ہے:

ذَبْ إِلَيْكُمْ دَاءَ الْأَمِّ قَبْلَكُمْ: الْحَسَدُ وَالْبَغْضَاءُ، هِيَ الْحَالِقَةُ، لَا أَقُولُ تَخْلِقُ الشَّعْرَ وَلَكِنْ تَخْلِقُ الدِّينَ.

”تم میں پھیلی امتوں کی بیماری سراپت کر گئی: حسد اور بغض، یہ مونڈ دینے والی ہے، میں نہیں کہتا کہ بال مونڈ دیتی ہے لیکن یہ تو دین کو مونڈ دیتی ہے۔“

پھر لکھا ہے:

”اس طرح کہ دین و ایمان کو جڑ سے ختم کر دیتی ہے، کبھی انسان بغض و حسد میں اسلام ہی چھوڑ دیتا ہے، شیطان بھی انہیں دو بیماریوں کا مارا ہوا ہے۔“

(مرآة شرح مشکاة ج ۶ ص ۶۱۵)

قول ابن عباس اور قول اعلیٰ حضرت میں غور

اب ذر غور فرمائیے کہ ان میں سے کس کا قول حق ہے اور کس کا باطل، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی

نے مولانا علیؒ کے ساتھ اموی جنگ کو شائبہ نفسانی اور تعصب قرار دیا، فاضل دیوبند مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اس کو خاندانی رقابت سے تعبیر کیا، اور حکیم الامت نے بھی معاویہ کے لیے کینہ کا لفظ استعمال کیا، اگرچہ انہوں نے یہی لفظ مولانا علیؒ کے لیے بھی لکھ دیا ہے۔ راقم الحروف قارئین کرام کو غور و فکر کرنے کی زحمت دیتا ہے کہ وہ فیصلہ فرمائیں کہ ان میں سے کس کا قول صحیح ہے اور کس کا غلط؟ ہمارے حکیم الامت نے تو مولانا علیؒ کی طرف بھی کینہ کی نسبت کی ہے، جبکہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے مولانا علیؒ کی طرف یہ نسبت نہیں کی اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے تو مولانا علیؒ کی طرف ایسے شبہات کی بھی نفی کی ہے جو روح اسلام کے خلاف ہوں۔

یہ عاجز بھی اس سے قبل لکھ چکا ہے کہ سیدنا علیؒ کی طرف کسی قسم کے ذاتی بغض و کینہ کی نسبت کرنا قرآن و سنت دونوں کے خلاف ہے۔ اب رہ گئی یہ بات کہ کیا قلب معاویہ میں سیدنا علیؒ کے بارے میں تعصب، خاندانی رقابت، شائبہ نفسانی اور بقول ہمارے حکیم الامت کے کینہ تھا یا نہیں؟ اس پر عرض ہے کہ دلوں کے احوال عَلَیْہِمْ بِذَاتِ الصُّدُورِ ذات ہی جانتی ہے، انسان قرائن و احوال سے ہی کسی کے بارے میں رائے دے سکتا ہے۔ سو عام لوگوں کی کیا مجال کہ وہ کسی صحابی کے بارے میں رائے زنی کریں، اس سلسلہ میں مکمل احتیاط نہ کی جائے تو انسان کی آخرت برباد ہو سکتی ہے۔ البتہ کسی صحابی کے بارے میں اس کا کوئی معاصر صحابی ہی قرائن اور گرد و پیش کے احوال کو مد نظر رکھتے ہوئے کچھ اظہار خیال کرے تو پھر معاملہ غور طلب بن جاتا ہے۔ آیا سیدنا علیؒ کے متعلق سیرۃ معاویہ میں کینہ تھا؟ اس بات کے ثبوت میں معاویہ کے ایسے معاصر کے الفاظ ملتے ہیں جن کے بارے میں جبریلؑ نے آکر اطلاع دی کہ وہ بہترین مفسر ہیں، سیدنا عمرؓ نے اُن کی شان میں فرمایا کہ وہ عمر میں فوجوان ہے اور علم و تجربہ میں بوڑھا، سیدنا علیؒ نے اُن کے حق میں فرمایا کہ وہ پردہ کے پیچھے سے غیب کو دیکھتا ہے اور خود انہوں نے اپنے بارے میں فرمایا: اگر اونٹ کے پاؤں میں باندھنے والی رسی گم ہو جائے تو میں قرآن مجید کے ذریعے تلاش کر لوں گا۔ انہوں نے اپنی بصیرت سے تاڑ لیا تھا کہ معاویہ کے قلب میں سیدنا علیؒ کے لیے بغض ہے۔ چنانچہ محدثین کرام لکھتے ہیں:

عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُبَيْرٍ قَالَ: كُنَّا عِنْدَ ابْنِ عَبَّاسٍ بِعَرَفَةَ فَقَالَ: يَا سَعِيدُ! مَا لِي لَا أَسْمَعُ النَّاسَ يَلْبُثُونَ؟ قُلْتُ: يَخَافُونَ مُعَاوِيَةَ. فَخَرَجَ ابْنُ عَبَّاسٍ مِنْ فُسْطَاطِهِ فَقَالَ: لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ، وَإِنْ رُغِمَ أَلْفُ مُعَاوِيَةَ، اللَّهُمَّ الْعَنَّهُمْ فَقَدْ تَرَكُوا السُّنَّةَ مِنْ بَعْضِ عَلِيٍِّّ ؑ.

”حضرت سعید بن جبیر ؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم عرفہ میں سیدنا ابن عباس ؓ کے ساتھ تھے تو انہوں نے پوچھا: سعید! کیا وجہ ہے کہ میں لوگوں کے تلبیہ کی آواز نہیں سن رہا؟ میں نے عرض کیا: معاویہ سے خوف کر رہے ہیں۔ پس ابن عباس ؓ اپنے خیر سے نکلے تو پڑھنے لگے: ”لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ“ اگرچہ معاویہ کی ناک رگڑی جائے، اے اللہ! ان پر لعنت فرما، انہوں نے علی ؓ سے بغض کی وجہ سے سنت کو چھوڑ دیا ہے۔“

(السنن الکبریٰ للبیہقی: کتاب الحج، باب التلبیۃ یوم عرفۃ قبلہ وبعده حتی یرمی جمرۃ العقبة، ج ۱۰ ص ۵۹ حدیث ۹۵۲۱؛ سنن النسائی، کتاب الحج ۱۹۷، التلبیۃ بعرفۃ ص ۴۶۵ حدیث ۳۰۰۶؛ صحیح سنن النسائی للألبانی ج ۲ ص ۳۴۳ حدیث ۳۰۰۶؛ صحیح ابن خزیمة، کتاب الحج، باب استحباب التلبیۃ بعرفات، وعلى الموقف، إحياء للسنة إذهب بعض الناس قد كان تركه في بعض الأزمان، ج ۲ ص ۱۳۳۴ حدیث ۲۸۳۰؛ المستدرک للحاکم ج ۱ ص ۴۶۴، وط: ج ۱ ص ۶۳۶ حدیث ۱۷۰۶؛ المہذب فی اختصار السنن الکبریٰ للدمی ج ۴ ص ۱۸۶۱)

اس صحیح حدیث میں تصریح ہے کہ معاویہ نے بغض مرتضوی کی وجہ سے ایک سنت نبوی کو ترک کر رکھا تھا اور لوگ فقط اُس کے خوف سے اُس سنت پر عمل کرنے سے قاصر تھے، یہاں اگر آپ چاہیں تو گزشتہ سطور میں مذکور اعلیٰ حضرت کے اس قول کو بھی مد نظر رکھ سکتے ہیں:

”حضرت علی المرتضیٰ سے جنگ کرنے والا اگر اُن سے عداوت و بغض کی وجہ سے کرتا

ہے تو اہل سنت کے نزدیک بالاجماع وہ کافر ہے۔“

(فتاویٰ رضویہ ج ۱۵ ص ۲۳۵)

سیدنا علیؑ کے ساتھ ابن مسعر کی جنگ اور سب دشمن تو شاید پیار سے ہو گا لیکن سیدنا ابن عباسؓ کی مذکورہ بالا حدیث کے مطابق انہوں نے سنت نبویؐ کو بغض مرتضوی کی وجہ ترک کر رکھا تھا۔ جب اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے جملہ میں اور سیدنا ابن عباسؓ کی حدیث میں لفظ ”بغض“ آ گیا ہے تو پھر اگر آپ چاہیں تو درج ذیل حدیث میں بھی لفظ بغض کو مد نظر رکھ لیں۔ سیدنا علیؑ نے فرمایا:

وَالَّذِي فَلَقَ الْحَبَّةَ وَبَرَأَ النَّسَمَةَ أَنَّهُ لَعَنَهُ النَّبِيُّ الْأَمِيُّ ﷺ إِيَّيَّ أَنْ لَا يُجَنَّبُنِي إِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَا يُبْغِضُنِي إِلَّا مُنَافِقٌ.

”اُس ذاتِ مجللہ کی قسم جس نے دانے کو چیرا اور جاندار کو پیدا فرمایا، بیشک نبی امیؐ نے قطعیت کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ مجھ (علی) سے محبت نہیں کرے گا مگر مومن اور میرے ساتھ بغض نہیں رکھے گا مگر منافق۔“

(صحیح مسلم: کتاب الایمان، باب الدلیل علی أن حب الأنصار وعلیؑ من الایمان

وعلاماتہ، وبغضہم من علامات النفاق، ص ۱۵ حدیث ۱۳۱ [۷۸])

ملت عثمانؓ یا ملت محمد ﷺ؟

یہاں شاید بعض لوگوں کے ذہن میں سوال پیدا ہو جائے کہ لوگ میدانِ عرفات میں تلبیہ ”لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ“ کہنے پر معاویہ سے کیوں خوف زدہ تھے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تلبیہ حج و عمرہ کو جمع کرنے کے لیے تھا، ایسا کرنے کو تمتع کہتے ہیں اور بعض اسلاف اس کو قرآن بھی کہہ دیتے تھے۔ واقعہ یہ ہوا کہ بعض سالوں میں حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو حج کرایا تو انہیں حج تمتع سے منع کر دیا تھا اور سیدنا علیؑ نے اُن سے اختلاف کیا تھا۔ چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سعید بن مسیبؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا:

”سیدنا علیؑ اور حضرت عثمانؓ کے مابین عسفان کے مقام پر حج تمتع کے مسئلہ

میں اختلاف پیدا ہو گیا تو سیدنا علیؓ نے فرمایا: آپ کا اس کے سوا اور کوئی ارادہ نہیں کہ آپ لوگوں کو اس عمل سے روک دیں جسے نبی کریم ﷺ نے کیا تھا، بہر حال جب سیدنا علیؓ نے یہ صورت حال دیکھی تو انہوں نے حج و عمرہ دونوں کے لیے تلبیہ کی آواز بلند فرمائی۔

(بخاری: کتاب الحج، باب التمتع والاقران والافراد بالحج... ص ۲۱۲ حدیث ۱۵۶۹)
صحیح مسلم میں ہے کہ اس موقع پر حضرت عثمان غنی نے سیدنا علی رضی اللہ عنہما سے کہا:
دَعْنَا مِنْكَ ، فَقَالَ : إِنِّي لَا أَسْتَطِيعُ أَنْ أَدْعَكَ .
”ہماری جان چھوڑیے! فرمایا: مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ میں آپ کو (اس مسئلہ میں) چھوڑ دوں۔“

(صحیح مسلم: کتاب الحج، باب جواز التمتع، ص ۵۶۱ حدیث [۱۵۹] ۱۲۲۳)
یہ حدیث اس سے زیادہ وضاحت سے بھی آئی ہے، چنانچہ مروان بن الحکم بیان کرتا ہے:
”میں نے عثمان و علی رضی اللہ عنہما کو مکہ کے درمیان پایا، حضرت عثمانؓ نے تمتع سے یعنی عمرہ و حج کو جمع کرنے سے منع کیا تھا۔ جب علی نے یہ معاملہ دیکھا تو انہوں نے ان دونوں کو جمع کر کے بہ آواز بلند تلبیہ کیا اور کہا: میں عمرہ اور حج کا اکٹھے تلبیہ کرتا ہوں۔ حضرت عثمانؓ نے انہیں کہا:

تَرَايِي أَنَّهُى النَّاسَ عَنْ شَيْءٍ وَأَنْتَ تَفْعَلُهُ ؟ فَقَالَ : مَا كُنْتُ لَا دَعُ
سُنَّةَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ لِقَوْلِ أَحَدٍ مِنَ النَّاسِ .

”آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں لوگوں کو ایک چیز سے روک رہا ہوں اور آپ اسی چیز کو کر رہے ہیں؟ فرمایا: میں ایسا نہیں ہوں کہ کسی شخص کے قول کی خاطر رسول اللہ ﷺ کی سنت کو چھوڑ دوں۔“

(مسند ابی داؤد الطیالسی ج ۱ ص ۹۴ حدیث ۹۶؛ بخاری: کتاب الحج، باب التمتع

والإقتران والافراد بالحج... ص ۲۱۱ حدیث ۱۵۶۳؛ سنن النسائي: كتاب المناسك [۴۹]
باب القرآن، ج ۵ ص ۱۶۲ حدیث ۲۷۲۱، ۲۷۲۲؛ السنن الكبرى للبيهقي ج ۹ ص ۲۸۴؛ سنن
الدارمي ج ۲ ص ۵۹ حدیث ۱۹۲۳؛ موافقة خبر الخیر للعقلاني ج ۱ ص ۲۸۸

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس اختلاف پر خاموش ہو گئے اور کوئی مزاحمت نہ فرمائی،
لیکن معاویہ بن ابی سفیان کو یہ اختلاف نہیں بھولا تھا، سو انہوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بغض کی وجہ سے اپنے
دور میں اس قدر سختی سے لوگوں کو جتماع سے منع کر دیا تھا کہ لوگ ان سے خوف زدہ ہو گئے تھے اور اس خوف
کی وجہ سے اس سنت کو ترک کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اسی لیے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: "لَقَدْ
فَرَّكُوا السُّنَّةَ مِنْ بَغْضِ عَلِيٍّ رضی اللہ عنہ" (لوگوں نے سنت کو ترک کر دیا) یہاں یہ شبہ بھی پیدا ہو
سکتا ہے کہ چونکہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ ہاشمی تھے، لہذا ممکن ہے کہ ان کی رگ ہاشمیت حرکت میں آئی ہو اور
انہوں نے بوجہ تعصب معاویہ کے بارے میں مذکورہ بالا الفاظ کہہ دیے ہوں، لیکن کتب اسلامیہ میں ایسی
صحیح تصریحات بھی موجود ہیں جو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایسے تعصب کی نفی کرتی ہیں اور معاویہ بن ابی
سفیان کے تعصب کو ثابت کرتی ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی اور دوسرے محدثین لکھتے ہیں:

قَالَ ابْنُ أَبِي عُمَرَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ، عَنْ ابْنِ طَاوُسٍ، عَنْ أَبِيهِ قَالَ: إِنَّ
مُعَاوِيَةَ قَالَ لِابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا: أَعْلَىٰ مِلَّةِ ابْنِ أَبِي طَالِبٍ أَنْتَ؟
قَالَ: لَا، وَلَا مِلَّةِ ابْنِ عَفَّانَ، قَالَ مُعَاوِيَةُ: فَعَلَىٰ أَيِّ مِلَّةٍ أَنْتَ؟ قَالَ: عَلَىٰ
مِلَّةِ مُحَمَّدٍ ﷺ.

”معاویہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: کیا آپ ابن ابی طالب کی
ملت پر ہیں؟ انہوں نے فرمایا: نہیں، اور نہ ہی میں ابن عفان کی ملت پر ہوں۔ معاویہ
نے کہا: تو آپ کس کی ملت پر ہیں؟ فرمایا: سیدنا محمد ﷺ کی ملت پر۔“

(المطالب العالیة بزوائد المسانید الثمانية، کتاب الإیمان والتوحید، باب الملة ملة محمد ﷺ)
ج ۱۲ ص ۴۲۷ حدیث ۲۹۴۰؛ المصنف لعبد الرزاق ج ۱۱ ص ۴۵۳ حدیث ۲۰۹۸۳؛ شرح

أصول اعتقاد أهل السنة لللال الكافي ج ۱ ص ۹۴ حدیث ۱۳۳؛ الإبانة عن شريعة الفرق الناجية ومجانبة الفرق المذمومة، لابن بطة حنبلي ج ۲ ص ۳۵۴ حدیث ۲۳۷، ۲۳۸؛ حلیۃ الأولیاء ج ۱ ص ۳۲۹؛ منهاج السنة النبویۃ لابن تیمیۃ ج ۱ ص ۱۷۱ و ط: ج ۲ ص ۹۶

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اس قول کے بارے میں المطالب العالیۃ کے محقق دکتور عمر ایمان ابوبکر لکھتے ہیں:

”یہ اثر (قول صحابی) صحیح ہے، اس کے راوی بخاری اور مسلم کے راوی ہیں ماسوا ابن ابی عمر کے، وہ مسلم کا راوی ہے۔“

(المطالب العالیۃ بزوائد المسانید الثمانیۃ ج ۱۲ ص ۴۲۷)

اس سے معلوم ہوا کہ معاویہ بن ابی سفیان کے ذہن میں اموی اور ہاشمی علیحدہ علیحدہ دو ملتیں تھیں اور وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اختلاف کرنے کو ہاشمی اور اموی اختلاف گردانتے تھے، پھر یہاں تک بس نہیں بلکہ موصوف ترجیح بھی ملت عثمانی کو دیتے تھے، اور اس ترجیح میں اُن کے مد نظر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت نہیں بلکہ اُن کی قرابت ہوتی تھی۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل لکھتے ہیں:

”عباد بیان کرتے ہیں کہ جب معاویہ بن ابی سفیان حج کرنے آئے تو ہم بھی اُن کے ساتھ مکہ المرمۃ آئے، انہوں نے ہمیں نماز ظہر دو رکعت پڑھائی پھر دار الندوہ کی طرف چلے گئے۔ عباد کہتے ہیں: اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب مکہ تشریف لاتے تو ظہر، عصر اور عشاء مکمل چار چار رکعت پڑھاتے، پھر جب منیٰ اور عرفات جاتے تو قصر کرتے، پھر جب حج سے فارغ ہو کر منیٰ میں قیام کرتے تو مکہ سے کوچ کرنے تک چار رکعت ہی پڑھتے۔ پس جب معاویہ نے ہمیں ظہر پڑھائی تو دو رکعت پڑھائیں۔ اس پر مردان بن الحکم اور عمر بن عثمان بن عفان اُن کی طرف بڑھے اور انہیں کہنے لگے: آپ نے اپنے چچازاد پر ایسا قبیح عیب لگایا ہے کہ ایسا کسی نے بھی نہیں لگایا۔ انہوں نے پوچھا: وہ کیا؟ وہ دونوں کہنے لگے: کیا آپ نہیں جانتے کہ وہ مکہ میں پوری نماز پڑھتے تھے؟

معاویہ نے کہا: افسوس! میں اس کے سوا اور کیا کرتا؟ میں نے رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ بھی اسی طرح نماز پڑھی ہے۔ وہ کہنے لگے: لیکن آپ کے چچا زاد نے تو پوری چار رکعت پڑھائی تھیں، آپ کا اُن کے خلاف کرنا اُن کے لیے عیب ہے۔ عباد کہتے ہیں: پھر جب معاویہ نماز عصر کے لیے نکلے تو چار رکعتیں پڑھائیں۔“

(مسند أحمد (مسند الشاميين، مسند معاوية) ج ۴ ص ۹۴؛ وط: بتحقيق أحمد شاكر ج ۱۳

ص ۱۸۳ حدیث ۱۶۸۰۰)

حافظ بیہقی نے کہا ہے: امام احمد کے راویوں کی توثیق کی گئی ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس کی سند کو حسن کہا ہے، حمزہ احمد الزین نے صحیح کہا ہے اور شیخ شعیب الارلوٹ نے حسن کہا ہے۔

(مجمع الزوائد ج ۲ ص ۱۵۶، ۱۵۷؛ فتح الباری: کتاب تقصیر الصلاة، باب بقصر إذا خرج

من موضعه، ج ۳ ص ۴۷۱؛ مسند أحمد بتحقيق أحمد الزین ج ۱۳ ص ۱۸۳؛ مسند أحمد ج

۲۸ ص ۷۱۰۷۰)

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے کہا: میں چار رکعت کیوں پڑھتے تھے؟ اس کی تاویلات و توجیہات فتح الباری وغیرہ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ مروان اور عمرو بن عثمان نے جس بات کو معاویہ کے سامنے عیب بنا کر پیش کیا وہ بات دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علم کے مطابق ہی نہیں بلکہ خود معاویہ کی معلومات کے مطابق بھی سنت نبوی ﷺ تھی اور شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کا عمل بھی اُسی پر تھا مگر معاویہ بن ابی سفیان نے خلیفہ ثالث کی وجہ سے نہیں بلکہ محض اپنے عم زاد کی وجہ سے سنت نبوی اور عمل شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کو چھوڑ دیا تھا، کیونکہ وہ خود کو ملت عثمان پر سمجھتے تھے اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کو کہتے تھے: ”أَعْلَىٰ مِلَّةِ ابْنِ أَبِي طَالِبٍ أَنْتَ؟“ (کیا آپ ابن ابی طالب کی ملت پر ہیں؟) حالانکہ اُمت مسلمہ کے لیے فقط ملتِ ابراہیمی اور ملتِ محمدی ہے، نبی کریم ﷺ کی سنت کے برعکس کسی کی سنت اور ملت کی کوئی گنجائش نہیں۔

جن لوگوں کے سینے اس قسم کی مصنوعی ملتوں اور قومی تعصب سے پاک تھے انہوں نے واضح فرما دیا

تھا کہ ملت کسی کے باپ کی نہیں بلکہ فقط سید العالمین محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے۔ چنانچہ حج تمتع کے متعلق ہی مسند احمد وغیرہ میں ہے کہ سیدنا عمرؓ نے لوگوں کو فرمایا کہ عمرہ کا کمال یہ ہے کہ اُسے حج سے الگ کیا جائے، اس سے بعض لوگوں کو گمان ہوا کہ انہوں نے حج و عمرہ کو جمع کرنے سے منع کر دیا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حج تمتع کی رخصت بیان فرمائی تو بعض لوگ کہنے لگے: آپ کے والد تو اس سے منع کرتے تھے۔ اس پر ابن عمرؓ کا ردِ عمل کیا تھا؟ ذرا غور سے پڑھئے:

أَلَمْ يَأْمُرَ اللَّهُ ﷻ أَنْ تَتَّبِعُوا سُنَّتَهُ أَمْ سُنَّةُ عُمَرَ؟ إِنْ عُمَرَ لَمْ يَقُلْ
لَكُمْ إِنَّ الْعُمْرَةَ فِي أَشْهُرِ الْحَجِّ حَرَامٌ ، وَلَكِنَّهُ قَالَ: إِنْ أَتَمَّ الْعُمْرَةَ أَنْ
تَقْرُدُوهَا مِنْ أَشْهُرِ الْحَجِّ.

”رسول اللہ ﷺ زیادہ حق رکھتے ہیں کہ اُن کی سنت کی اتباع کی جائے یا عمر کی سنت؟ سیدنا عمرؓ نے تمہیں یہ نہیں فرمایا تھا کہ عمرہ حج کے مہینوں میں حرام ہے، لیکن انہوں نے فرمایا تھا کہ پورا عمرہ یہ ہے کہ تم اُسے تہاجج کے مہینوں کے علاوہ کرو۔“

(مسند احمد، مسند عبد اللہ بن عمر، بتحقیق أحمد شاکر ج ۵ ص ۱۹۰، ۱۹۱ حدیث ۵۷۰۰ السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۵ ص ۲۱)

ایک مرتبہ بعض شامیوں نے اُن سے یہی مسئلہ پوچھا تو انہوں نے اپنے والد کے عمل کی کسی قسم کی توجیہ و توضیح کیے بغیر فرمایا: جائز ہے۔ امام ترمذی لکھتے ہیں:

فَقَالَ الشَّامِيُّ: إِنَّ أَبَاكَ قَدْ نَهَى عَنْهَا ، فَقَالَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَرَ:
أَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ أَبِي نَهَى عَنْهَا وَصَنَعَهَا رَسُولُ اللَّهِ ﷻ أَمْ أَمْرُ أَبِي يُتَّبَعُ أَمْ
أَمْرُ رَسُولِ اللَّهِ ﷻ فَقَالَ الرَّجُلُ: بَلْ أَمْرُ رَسُولِ اللَّهِ ﷻ فَقَالَ: لَقَدْ صَنَعَهَا
رَسُولُ اللَّهِ ﷻ.

”شامی شخص نے کہا: آپ کے باپ نے تو اس سے منع کیا تھا، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تمہارا کیا خیال ہے، میرے باپ نے اس سے منع کیا اور

رسول اللہ ﷺ نے اسے کیا، آیا میرے باپ کے حکم کی اتباع کی جائے یا رسول اللہ ﷺ کے حکم کی؟ اُس شخص نے کہا: بلکہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کی۔ فرمایا: تو رسول اللہ ﷺ نے حج تمتع کیا تھا۔“

(جامع الترمذی: أبواب الحج، باب ما جاء في التمتع، ج ۲ ص ۱۷۵ حدیث ۸۲۴؛ مسند أبی یعلیٰ ج ۹ ص ۳۴۱، ۳۴۲ حدیث ۵۴۵۱)

اس مقام پر السنن الکبریٰ للبیہقی میں کافی وثاقبی بیان ہے، سیدنا عمرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں منع نہیں کرتا لیکن میں چاہتا ہوں کہ لوگ بکثرت بیت اللہ شریف کی زیارت کے لیے آیا کریں اور حج کے مہینوں کے علاوہ بھی عمرہ کیا کریں۔ امین شریعت نبوی ﷺ سیدنا علیؓ نے تو ان سے باقاعدہ پوچھ ہی لیا تھا کہ انہوں نے تمتع سے منع تو نہیں کیا؟ چنانچہ امام بیہقی لکھتے ہیں:

قَالَ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍؓ لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِؓ: أَنْهَيْتَ عَنِ الْمُتَمَتِّعِ؟ قَالَ: لَا وَلَكِنِّي أُرَدِّكَ كَثْرَةَ زِيَارَةِ الْبَيْتِ، قَالَ: فَقَالَ عَلِيُّؓ: مَنْ أَفْرَدَ الْحَجَّ فَحَسُنَ وَمَنْ تَمَتَّعَ فَقَدْ أَخَذَ بِكِتَابِ اللَّهِ وَسُنَّةِ نَبِيِّهِ ﷺ. ”سیدنا علیؓ نے سیدنا عمرؓ کو فرمایا: کیا آپ نے تمتع سے روک دیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا: نہیں لیکن میں نے بیت اللہ کی زیارت کی کثرت کا ارادہ کیا ہے۔ اس پر سیدنا علیؓ نے فرمایا: جس نے حج اِفراد کیا تو اچھا کیا اور جس نے تمتع کیا تو اُس نے اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اُس کے نبی ﷺ کی سنت پر عمل کیا۔“

(السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۵ ص ۲۱ حدیث ۸۸۷۷؛ المہذب فی اختصار السنن الکبیر للذہبی ج ۴ ص ۱۷۶۲)

بھلا سنت نبوی ﷺ سے کوئی خلیفہ راشد کیسے منع کر سکتا تھا؟ کتاب وسنت کی اس تصریح پر عمل کرنے سے سب سے پہلے جس شخص نے منع کیا وہ معاویہ بن ابی سفیان ہے۔ چنانچہ سیدنا ابن عباسؓ بیان فرماتے ہیں:

تَمَتَّعَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ حَتَّى مَاتَ ، وَأَبُو بَكْرٍ حَتَّى مَاتَ ، وَعُمَرُ حَتَّى مَاتَ ، وَعُثْمَانُ حَتَّى مَاتَ ، وَكَانَ أَوَّلُ مَنْ نَهَى عَنْهَا مُعَاوِيَةُ .
 ”رسول اللہ ﷺ نے حج تمتع کیا یہاں تک کہ آپ کا وصال ہوا، اور حضرت ابو بکر نے کیا حتیٰ کہ اُن کا انتقال ہوا، اور حضرت عمر نے کیا حتیٰ کہ وہ انتقال کر گئے، اور حضرت عثمان ؓ نے کیا حتیٰ کہ اُن کی وفات ہوئی، اور پہلا شخص جس نے اس سے منع کیا وہ معاویہ ہے۔“

(مسند أحمد بتحقيق أحمد شاكر، مسند ابن عباس، ج ۳ ص ۱۹۲ حدیث ۲۶۶۴، موص ۲۷۱ حدیث ۲۸۷۹؛ جامع الترمذی: أبواب الحج، باب ما جاء في التمتع، ج ۲ ص ۱۷۴ حدیث ۸۲۲؛ المصنف لابن أبي شيبة: كتاب الأوائل، ج ۱۳ ص ۳۱ حدیث ۳۶۸۶؛ شرح معاني الآثار: كتاب مناسك الحج، باب إحرام النبي ﷺ ج ۲ ص ۱۴۱ حدیث ۳۶۶۱)

بتائیے! سیدنا ابن عباس ؓ نے معاویہ بن ابی سفیان کو اَوَّل منع کرنے والا شخص کیوں کہا؟ اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ ابن عمر نے نہ صرف یہ کہ اس عمل سے منع کیا تھا بلکہ اُس منع میں اس قدر سختی کی تھی کہ لوگ خوف زدہ ہو گئے تھے، اور سیدنا ابن عباس ؓ بھانپ گئے تھے کہ اس سختی کا سبب بغضِ علی ہے، چونکہ وہ نہ صرف یہ کہ موصوف کے مزاج سے واقف تھے بلکہ انہوں نے موصوف کی زبان سے یہ الفاظ بھی سن رکھے تھے: ”أَعْلَى مِلَّةِ ابْنِ أَبِي طَالِبٍ أَنْتَ؟“ (کیا آپ فرزندِ ابوطالب کی ملت پر ہیں؟)

کیا ملتِ معاویہ بھی تھی؟

نہ صرف یہ کہ موصوف سید نبوی ﷺ اور شیخین کے عمل پر اپنے عم زاد کے طریقے کو ترجیح دیتے تھے بلکہ جہاں دنیوی مفاد ہوتا تو اپنی رائے کو حکمِ نبوی ﷺ پر بھی ترجیح دینے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ ایسے موقع پر اگر انہیں ٹوکا جاتا اور حدیثِ نبوی ﷺ سنائی جاتی تو کہتے: میں تو اس جیسے معاملہ میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ چنانچہ ہم اپنی کتاب ”الاحادیث الموضوعة في فضائل معاوية“ میں ہادی مہدی اور سود کے عنوان کے تحت تفصیلاً لکھ چکے ہیں کہ انہیں ایک سودی معاملہ میں سیدنا عبادہ بن صامت اور سیدنا

ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے ٹوکا تو انہوں نے کہا:

مَا أَرَى بِوَحْلِ هَذَا بَأْسًا.

”میں اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔“

اس پر سیدنا ابوالدرداء رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

مَنْ يَعْلُرُنِي مِنْ مُعَاوِيَةَ؟ أَنَا أَخْبِرُهُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَيُخْبِرُنِي عَنْ رَأْيِهِ.

”معاویہ کے بارے میں مجھے کون معذور سمجھے گا؟ میں اُس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث

سناتا ہوں اور وہ مجھے اپنی رائے سناتا ہے۔“

(الموطأ للإمام مالك ج ۳ ص ۳۹۱ حدیث ۱۴۴۲؛ مسند الإمام الشافعي مع شرحه الشافعي

لابن الأثير الجزري ج ۴ ص ۹۷؛ السنن للإمام الشافعي ج ۱ ص ۳۱۸ حدیث ۲۱۸؛ الرسالة

للإمام الشافعي ص ۴۴۶ فقرہ ۱۲۲۸؛ تهذيب الكمال ج ۷ ص ۱۶۴، ۱۶۵)

سیدنا ابوالدرداء رحمۃ اللہ علیہ کے حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سنانے کا امیر شام پر کوئی اثر نہ ہوا اور جب وہ اپنی

ذاتی رائے پر ڈٹے رہے تو سیدنا ابوالدرداء رحمۃ اللہ علیہ دل برداشتہ ہو کر شام سے چلے گئے، حتیٰ کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو

معاویہ کی طرف خط لکھنا پڑا کہ وہ ذاتی رائے کو چھوڑ کر سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پلٹ آئے۔ شاید یہاں

کسی انسان کو یہ سوچھے کہ یہ معاویہ کا اجتہاد تھا، تو جاننا چاہیے کہ نص کی موجودگی میں اجتہاد نہیں ہوتا۔ چنانچہ

علامہ ابوالولید الباجی المالکی سیدنا ابوالدرداء رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ ”مَنْ يَعْلُرُنِي مِنْ مُعَاوِيَةَ، النِّخ“ کی تشریح میں

لکھتے ہیں:

إِنْكَارٌ مِنْهُ عَلَى مُعَاوِيَةَ، التَّعْلُقُ بِالرَّأْيِ يُخَالِفُ النَّصَّ، وَلَمْ يَحْمِلْ

ذَلِكَ مِنْ مُعَاوِيَةَ عَلَى التَّأْوِيلِ، وَإِنَّمَا حَمَلَهُ مِنْهُ عَلَى رَدِّ الْحَدِيثِ

بِالرَّأْيِ.

”یہ اُن کی طرف سے معاویہ پر تکبر ہے کہ اُس نے رائے سے نص کی مخالفت کی،

انہوں نے اس کو معاویہ کی تاویل پر محمول نہیں کیا، انہوں نے تو اس کو فقط رائے سے

حدیث کو مسترد کرنا سمجھا ہے۔

(المنتقى شرح موطأ ج ۶ ص ۲۳۶)

نص کے مقابلہ میں رائے کا حکم

اگر کسی زمانے میں کوئی بھی انسان نص کے مقابلے میں اپنی رائے پیش کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟ یہ جاننے کے لیے ہم آپ کو تردید روافض میں بعض مشہور ترین علماء کے ہاں لے چلتے ہیں۔ علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

مُعَارَضَةُ أَقْوَالِ الْأَنْبِيَاءِ بِآرَاءِ الرِّجَالِ وَتَقْدِيمُ ذَلِكَ عَلَيْهَا ، هُوَ مِنْ فِعْلِ الْمُكَذِّبِينَ لِلرُّسُلِ ، بَلْ هُوَ جَمَاعُ كُلِّ كُفْرٍ ، كَمَا قَالَ الشَّهْرِسْتَانِيُّ فِي أَوَّلِ كِتَابِهِ الْمَعْرُوفِ "بِالْمَلِلِ وَالنَّحْلِ" مَا مَعْنَاهُ : أَصْلُ كُلِّ شَيْءٍ هُوَ مِنْ مُعَارَضَةِ النَّصِّ بِالرَّأْيِ ، وَتَقْدِيمِ الْهَوَى عَلَى الشَّرْعِ . وَهُوَ كَمَا قَالَ : لِإِنَّ اللَّهَ أَرْسَلَ رَسُولَهُ ، وَأَتَوَلَّ كُتْبَهُ ، وَبَيَّنَّ أَنَّ الْمُتَّبِعِينَ لِمَا أُنْزِلَ هُمْ أَهْلُ الْهَدْيِ وَالْقَلَاحِ ، وَالْمُعْرِضِينَ عَنْ ذَلِكَ هُمْ أَهْلُ الشَّقَاءِ وَالضَّلَالِ ، إِلَى أَنْ قَالَ وَمَعْلُومٌ أَنَّ الْكَلَامَ الَّذِي جَاءَتْ بِهِ الرُّسُلُ عَنِ اللَّهِ نَوْعَانِ : إِمَّا إِنْشَاءً وَإِمَّا إِخْبَارًا ، وَالْإِنْشَاءُ يَتَضَمَّنُ الْأَمْرَ وَالنَّهْيَ وَالِإِبَاحَةَ ، فَأَصْلُ السَّعَادَةِ تَصْدِيقُ خَبَرِهِ ، وَطَاعَةُ أَمْرِهِ ، وَأَصْلُ الشَّقَاوَةِ مُعَارَضَةُ خَبَرِهِ وَأَمْرِهِ بِالرَّأْيِ وَالْهَوَى ، وَهَذَا مُعَارَضَةُ النَّصِّ بِالرَّأْيِ ، وَتَقْدِيمُ الْهَوَى عَلَى الشَّرْعِ .

”انبیاء کرام علیہم السلام کے ارشادات کے مقابلہ میں شخصی آراء کو لانا اور ان پر مقدم کرنا یہ رسولوں کو جھٹلانے والے لوگوں کا کام ہے بلکہ ہر لحاظ سے کفر ہے، جیسا کہ شہرستانی نے اپنی معروف کتاب ”الملل والنحل“ کے آغاز میں ذکر کیا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے: ہر شرکی جز نص کو رائے سے مسترد کرنا اور خواہش کو شرع پر مقدم کرنا ہے۔

اور ایسا ہی ہے جیسا کہ انہوں نے فرمایا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو بھیجا اور اپنی کتابوں کو اتارا تو واضح فرمادیا کہ جنہوں نے اُس کے نازل کردہ کلام کی پیروی کی وہی ہدایت و فلاح والے ہیں اور جو اُس سے روگرداں ہیں وہ شقاوت و گمراہی والے ہیں اور معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اُس کے تمام رسول جو کلام لائے اُس کی دو قسمیں ہیں: یا تو وہ کلام انشاء ہے یا خبر، اور انشاء امر، نبی اور اباحت پر مشتمل ہوتا ہے۔ پس اصل سعادت اُس کی خبر کی تصدیق میں اور اُس کے امر کی طاعت میں ہے، اور اصل بدبختی اُس کی خبر اور امر کی ذاتی رائے اور خواہش سے تقابل میں ہے۔ اسی کو رائے سے نص کا مقابلہ اور شریعت پر خواہش کی تقدیم کہتے ہیں۔“

(درأ تعارض العقل والنقل، لابن تیمیہ ج ۵ ص ۲۰۴، ۲۰۵)

قارئین کرام! یہی وہ تقدیم علی النص ہے جس کی قرآن مجید میں یوں ممانعت آئی ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِي قَوْلِهِ: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْلِبُوا بُيُوتَ يَدْيَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ قَالَ: لَا تَقُولُوا بِخِلَافِ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ.

”سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اے ایمان والو! اللہ اور اُس کے رسول سے آگے نہ بڑھو، کی تفسیر میں فرماتے ہیں: کتاب و سنت کے خلاف نہ بولو۔“

(جامع البيان ج ۲۱ ص ۳۳۵؛ تفسیر ابن ابی حاتم ج ۱۰ ص ۳۳۰؛ ذم الکلام للہروی ج

۲ ص ۱۱۶؛ حلیۃ الاولیاء ج ۱۰ ص ۳۹۸؛ الدر المنثور ج ۱۳ ص ۵۲۷)

کتاب و سنت سے محبت کرنے والے اہل اسلام سے اپیل ہے کہ وہ اس حساس مقام کو مزید سمجھنے کے لیے ہماری کتاب ”الاحادیث الموضوعۃ فی فضائل معاویہ“ کا یہی مقام ضرور دیکھیں۔ انہیں معلوم ہوگا کہ متقدمین اور طوعاً اسلام قبول کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے جب اُن کی رائے کے خلاف کوئی نص پیش کی جاتی تو وہ کس طرح اپنی رائے کو چھوڑ کر کتاب و سنت کے سامنے سرنگوں ہو جاتے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما مسلسل نویرس تک ایک فتویٰ دیتے رہے، لیکن جب اُسی مسئلہ میں اُن کی رائے کے

تلاف حدیث نبوی ﷺ آگئی تو وہ کس طرح حدیث نبوی کے سامنے بچھ گئے تھے۔ ایسی مزید مثالوں کے لیے مذکورہ بالا کتاب کا مطالعہ ضرور فرمائیے۔

نص کے مقابل ذاتی رائے شیخین کی نظر میں

یہاں یہ ناکارہ قارئین کرام کی ایمانی اور روحانی ضیافت کے لیے چند ایسے ہدایت یافتہ حضرات کی مثالیں پیش کرنا چاہتا ہے جو نص کے مقابلہ میں ذاتی رائے کو نفسانیت اور شیطانیت سمجھتے تھے؟ میراث کے مسائل میں کلالہ کا مسئلہ انتہائی پیچیدہ ہے، یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے بھی مشکل تھا۔ جب سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے واضح نص نہ ہونے کی صورت میں یوں جواب دیا:

إِنِّي سَأَقُولُ فِيهَا بِرَأْيِي ، فَإِنْ كَانَ صَوَابًا فَمِنَ اللَّهِ ، وَإِنْ كَانَ خَطَأً
فَمِنِّي وَمِنَ الشَّيْطَانِ .

”فی الحال میں اس مسئلہ میں اپنی رائے بیان کرتا ہوں، اگر درست ہوئی تو اللہ کی جانب سے ہوگی اور اگر غلط ہوئی تو میری اور شیطان کی طرف سے ہوگی۔“

(سنن الدارمی: کتاب الفرائض، باب الکلالۃ، ج ۲ ص ۶۶۲ حدیث ۲۹۷۲؛ المصنف لاہن
أبی شیبۃ: کتاب الفرائض، باب: فی الکلالۃ من ہم؟ ج ۱ ص ۵۷۹ حدیث ۴۳۲۱۳۰
موسوعة الحافظ ابن حجر العسقلانی ج ۲ ص ۶۲۰، ۶۲۱)
حضرت مسروق بیان کرتے ہیں:

”کاتب نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف سے لکھا: یہ وہ مسئلہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے عمر کو دکھایا ہے، اس پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کاتب کو ڈانٹتے ہوئے فرمایا بلکہ یوں لکھوا
هَذَا مَا رَأَى عُمَرُ ، فَإِنْ كَانَ صَوَابًا فَمِنَ اللَّهِ ، وَإِنْ كَانَ خَطَأً فَمِنَ عُمَرَ .
عمر کی رائے ہے، پس اگر درست ہے تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اور اگر خطا ہے تو عمر
کی طرف سے ہے۔“

(السنن الکبریٰ للبیہقی: کتاب أدب القاضی، باب ما یقضی بہ القاضی ویفتی بہ المفتی ج

۲۰ ص ۳۳۹-حدیث ۲۰۳۷۴؛ شرح مشکل الآثار: باب بیان مشکل ماروی عن رسول اللہ ﷺ فی القضاة من منهم فی النار ومن منهم فی الجنة، ج ۹ ص ۲۱۴ ضمن حدیث ۳۵۸۳؛ ذم الکلام لماروی ج ۲ ص ۱۰۳-حدیث ۲۵۸؛ موسوعة الحافظ ابن حجر العسقلانی ج ۲ ص ۶۲۱-حدیث ۱۲۰)

کتاب وسنت کے سامنے یہ اُن شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کا سر تسلیم خم کرنا ہے جن کے بارے میں ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ میرے بعد ان کی پیروی کرنا۔ اسی طرح ایک اور بھی عظیم ترین صحابی سے ایسا ہی ایمان افروز قول منقول ہے۔ یہ وہ ذہین و فہیم صحابی ہیں جن کے متعلق آقائے کائنات ﷺ نے پہلی ملاقات میں فرمایا تھا: یہ سیکھا سکھایا بچہ ہے۔ اُن کے سامنے ایک ایسا مسئلہ لایا گیا جس کے بارے میں انہیں کتاب وسنت کی کوئی نص (صراحت) معلوم نہیں تھی تو انہوں نے وہ مسئلہ اپنی رائے سے بتایا اور ساتھ ہی فرمادیا: میرا بتایا ہوا صحیح ہوا تو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کریم ﷺ کی جانب سے ہوگا اور اگر خطا ہوا تو میری اور شیطان کی طرف سے ہوگا، اور خدا کا فضل یہ ہوا کہ اُن کے بتائے ہوئے کی تصدیق حدیث نبوی ﷺ سے ہوئی۔ آئیے مکمل حدیث سماعت فرمائیے! محدثین کرام لکھتے ہیں:

”عقب بن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ اُن کے ہاں ایک ایسے شخص کی خبر لائی گئی جس نے شادی کی تو مباشرت اور حق مہر کی ادائیگی سے پہلے ہی اُس کا انتقال ہو گیا۔ ایک مہینہ تک یا بقول راوی کئی بار اس مسئلہ کے حل کے لیے لوگ آئے۔ بالآخر سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اب میں اس مسئلہ کے بارے میں کچھ کہتا ہوں: اُس عورت کے لیے اُسی طرح دستور کے مطابق حق مہر ہے جس طرح دوسری عورتوں کے لیے بغیر کسی کمی بیشی کے ہوتا ہے، اور اُس کا میراث میں بھی حق ہے اور اُس پر عدت بھی ہے۔

فَإِنْ يَكُ صَوَابًا فَمِنْ اللَّهِ ، وَإِنْ يَكُنْ خَطَاً فَمِنْنِي وَمِنْ الشَّيْطَانِ ،
وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ بِرِيقَانِ .

سواگر یہ درست ہے تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور اگر خطا ہے تو میری اور شیطان کی طرف سے ہے، اللہ ﷻ اور اُس کا رسول ﷺ بری ہیں۔“

اس پر کچھ اشجعی لوگ کھڑے ہوئے، جن میں ایک جراح اور دوسرے ستان تھے۔ انہوں نے عرض کیا: اے ابن مسعود! ہم گواہی دیتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بَرَقَ بِنْتِ وَاشِقْ جن کا شوہر ہلال بن مرہ اشجعی تھا، کے بارے میں اسی طرح فیصلہ کیا تھا جس طرح آپ نے کیا ہے۔ اس پر سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ انتہائی خوش ہوئے کہ اُن کا فیصلہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ کے موافق ہو گیا ہے۔“

(سنن ابی داود: کتاب النکاح، باب فیمن تزوج ولم یسم صداقا حتی مات، ج ۲ ص ۴۰۷ حدیث ۲۱۱۶؛ سنن النسائی: کتاب النکاح، باب إباحة التزویج بغیر صداق ج ۶ ص ۴۳۲ حدیث ۱۳۳۵۸؛ صحیح ابن حبان ج ۹ ص ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۰، ۴۱۱، المستدرک للحاکم ج ۲ ص ۱۸۰)

اس عظیم فقیہ صحابی کو اُن کی اعلیٰ ذہانت اور نص کے سامنے عاجزی اور متانت کی بدولت امام الانبیاء ﷺ نے انتہائی اعلیٰ و ارفع شرف سے نوازا تھا، ارشاد فرمایا تھا:

”میں نے اپنی امت کے لیے اُس بات کو پسند کر لیا جس بات کو ابن مسعود نے میری امت کے لیے پسند کر لیا۔“

(المستدرک للحاکم: کتاب معرفة الصحابة، ذکر مناقب عبد الله بن مسعود رضی اللہ عنہ ج ۳ ص ۳۵۹ حدیث ۵۳۸۸، ۵۳۸۷)

ایک طرف پندرہ، بیس سال قبل طوعاً (برضا و رغبت) ایمان لانے والے ان سابقین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال اور طرزِ عمل میں غور فرمائیے کہ جب انہیں بروقت کتاب و سنت کی کوئی تصریح نہ ملی اور انہوں نے کئی کئی ہفتے غور و خوض کے بعد کوئی مسئلہ بتایا تو ساتھ ہی وضاحت فرمادی کہ خدا نخواستہ اگر اُن کا بتایا ہوا مسئلہ خطا ثابت ہو تو وہ خطا اُن کی اور شیطان کی طرف سے ہوگی، اور دوسری طرف اکیس سال بعد کرہا اور

مجبوراً اسلام لانے والے بعض طلقاء کے قول اور طرزِ عمل میں غور فرمائیے کہ اُن کے سامنے کھلے بندوں واضح تصریح نبوی ﷺ پیش کی گئی تو انہوں نے جھٹ پٹ کہہ دیا: ”مَا أَرَى بِعِثَلٍ هَذَا بَأْسًا“ (میں تو اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا)۔ قارئین کرام بتائیں! کیا طلقاء لوگ سیدنا ابوبکر، عمر اور ابن مسعودؓ سے بڑے مجتہد تھے؟ اور کیا نص کے مقابلے میں اجتہاد کی دال گلتی ہے؟ اگر نہیں تو بولے کتاب و سنت پر اس جرأت و تقدیم کو کیا کہا جائے؟ ماوشا کیا کہہ سکتے ہیں جب خود اُن نے ایسی جرأت کو مطلقاً کتاب و سنت پر تقدیم فرمایا ہے، جیسا کہ ہم سیدنا ابن عباسؓ سے ﴿لَا تَقْعُدُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ کی تفسیر میں نقل کر چکے ہیں، اور علامہ ابن تیمیہ نے کتاب و سنت پر رائے اور خواہش کو مقدم کرنے پر جو حکم لگایا ہے وہ آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔ نیز سیدنا ابن عباسؓ نے ایسی جرأت اور خواہش کو ملت معاویہ کا نام بھی دیا تھا۔ چنانچہ علامہ ابن بطہ جلی اپنی سند کے ساتھ لکھتے ہیں:

قَالَ رَجُلٌ لَابْنِ عَبَّاسٍ: الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي جَعَلَ هَوَانًا عَلَى هَوَانِكُمْ،
لَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: الْهَوَى كُلُّهُ ضَلَالَةٌ، قَالَ: فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: قَالَ لِي
مُعَاوِيَةُ: أَعَلَى مِلَّةِ ابْنِ أَبِي طَالِبٍ أَنْتَ؟ قُلْتُ: وَلَا عَلَى مِلَّتِكَ، أَوْ
قَالَ: وَلَا عَلَى مِلَّةِ عُثْمَانَ، أَنَا عَلَى مِلَّةِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ.

”ایک شخص نے سیدنا ابن عباسؓ سے عرض کیا: اُس اللہ ﷻ کے لیے تمام تر
حمہ ہے جس نے ہماری خواہش کو آپ کی خواہش کے مطابق کر دیا ہے۔ اس پر سیدنا
ابن عباسؓ نے فرمایا: خواہش کی پیروی سراسر گمراہی ہے۔ راوی فرماتے ہیں: پھر
ابن عباسؓ نے فرمایا: مجھے معاویہ نے کہا تھا: کیا تم ابن ابی طالب کی ملت پر ہو؟
میں نے کہا تھا: نہیں، اور نہ ہی میں تیری ملت پر ہوں، یا فرمایا: اور نہ ہی میں ملت عثمان
ؓ پر ہوں، میں تو رسول اللہ ﷺ کی ملت پر ہوں۔“

(الإبانة للعکبری الحنبلي: باب ما أمر به من التمسك بالسنة والجماعة والأخذ بها وفضل

من لزمها، ج ۲ ص ۳۵۵ حدیث ۲۳۸)

اس مکمل تفصیل سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ موصوف کے سینے میں سیدنا علیؑ کے خلاف غل کینہ کیوں تھا؟ اس لیے کہ سیدنا علیؑ بھی ملت عثمانی پر نہیں بلکہ ملت محمد ﷺ پر مستقیم تھے جبکہ موصوف کے بارے میں آپ جان چکے ہیں کہ اُن کی زبان پر ملت علی اور ملت عثمان کا ذکر الگ الگ جاری ہو گیا تھا اور زبان پر بلذ جبر و اکراہ وہی کچھ جاری ہوتا ہے جو سینے سے آتا ہے۔ کُلُّ اِنَاءٍ يَنْضَحُ بِمَا فِيْهِ۔

بعض حکماء سے سوال

جن بعض نام نہاد حکماء امت نے معاویہ کے خلاف سیدنا علیؑ کے مبارک سینہ میں کینہ کی نسبت کی ہے اور سیدنا علیؑ کے خلاف معاویہ کے سینہ میں کینہ کی بات لکھی ہے، کیا وہ یہ سادہ سی وضاحت کرنا پسند فرمائیں گے کہ سینہ مرتضوی میں اگر معاویہ کے خلاف کینہ تھا تو اُس کا سبب کیا تھا اور سینہ معاویہ میں جو ذات مرتضیٰ کے خلاف کینہ تھا تو اُس کا سبب کیا تھا؟

ہمارا نظریہ ہی نہیں بلکہ ایمان ہے کہ سیدنا علیؑ کے مبارک سینہ میں کسی کے بارے میں بھی کوئی کینہ نہیں تھا، بلکہ کسی کے ساتھ اُن کی محبت اور کسی کے ساتھ اُن کا بغض محض رضائے الہی کی خاطر ہوتا تھا، اور معاویہ کے خلاف بھی اُن کا بغض اللہ ﷻ کی خاطر تھا۔ جن لوگوں نے لکھا ہے کہ معاویہ کے سینہ میں سیدنا علیؑ کے لیے کینہ تھا، کیا وہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اُس کا کینہ بھی محض اللہ ﷻ کی خاطر تھا؟

خلاصہ یہ ہے کہ صلح امام حسن و معاویہ میں جو لفظ ”هَذْنَةٌ عَلَيَّ دَخَنٍ“ (ناگواری کے باوجود صلح) آیا ہے، وہ ناگواری امام حسن مجتبیٰؑ کے قلب اقدس میں معاویہ کے خلاف دینی لحاظ سے تھی، یعنی معاویہ بن ابی سفیان دینی لحاظ سے امام پاک کو پسند نہیں تھا، باقی یہ بات کہ معاویہ کو امام پاک کیوں ناگوار تھے؟ اس کی تفصیل نیچے ملاحظہ فرمائیں۔

معاویہ کو امام پاک کیوں نا پسند تھے؟

”هَذْنَةٌ عَلَيَّ دَخَنٍ“ (ناگواری کے باوجود صلح) کی روشنی میں جب آپ جان چکے ہیں کہ امام حسن مجتبیٰؑ کو معاویہ کیوں نا پسند تھے تو یہ بھی جان لیجئے کہ معاویہ کو امام حسن مجتبیٰؑ کیوں نا پسند تھے؟

یاد رکھنا چاہیے کہ امام پاک کو دنیوی لحاظ سے ناگوار سمجھا گیا تھا، اس لیے کہ ابن ہند اقتدار کے دلدادہ تھے، انہوں نے سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی محض بقائے اقتدار کی خاطر جنگ کی تھی اور قصاص عثمان علیہ السلام کا بہانہ بنایا تھا بلکہ وہ تو یہ بھی چاہتے تھے کہ حضرت عثمان علیہ السلام قتل ہو جائیں، جیسا کہ ہم خود اُن کے رشتہ دار عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح کی گواہی نقل کر چکے ہیں۔ سیدنا علی المرتضیٰ علیہ السلام بھی معاویہ بن ابی سفیان کے بارے میں یہی فرماتے تھے اور سیدنا عمار بن یاسر علیہ السلام نے تو خود میدانِ صفین میں جو تقریر فرمائی تھی اُس میں صاف صاف فرمایا تھا کہ ان کا نعرہ قصاص محض بہانہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اُن کو اقتدار کا چمکا پڑ چکا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما نے دورانِ خطاب فرمایا:

فَخَذَعُوا أَتْبَاعَهُمْ يَقُولِيهِمْ: "إِمَامُنَا قُتِلَ مَظْلُومًا" لِيَكُونُوا بِذَلِكَ
جَبَابِرَةً مُلُوكًا، وَبِكَ مَكِيدَةً يُلْفُوا بِهَا مَا تَرَوْنَ، وَلَوْ لَا هِيَ مَا تَبِعَهُمْ
مِنَ النَّاسِ رَجُلَانِ.

”سو انہوں نے اپنے پیروکاروں کو اپنے نعرے ”إِمَامُنَا قُتِلَ مَظْلُومًا“ (ہمارا امام ظلماً مارا گیا ہے) سے دھوکہ دے رکھا ہے، تاکہ وہ اس بہانے سے جا برباد شاہ بن جائیں اور یہ ان کی چال ہے، اسی چال سے یہ یہاں پہنچے ہیں جہاں تم انہیں دیکھ رہے ہو، اگر یہ نعرہ نہ ہوتا تو لوگوں میں سے دو شخص بھی ان کی پیروی نہ کرتے۔“

(البدایة والنهاية (قطر) ج ۷ ص ۴۵۵، وط: بتحقيق عبد المحسن التركي ج ۱۰ ص ۵۲۷)

تنبیہ

خیال رہے کہ اس تاریخی روایت میں ایک راوی ابو مخنف لوط بن یحییٰ ہیں۔ محدثین اس کو غیر ثقہ، تالف، ضعیف اور اخباری کہتے ہیں لیکن تاریخ میں اس کو امام مانا گیا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر جیسا شخص لکھتا ہے:

ذَكَرَ ابْنُ جَرِيرٍ، عَنْ أَبِي مَخْنَفٍ - لُوطُ بْنُ يَحْيَى - وَهُوَ أَحَدُ أَيْمَةِ هَذَا
الشَّانِ.

”امام ابن جریر نے ابوحنیفہ لوط بن یحییٰ سے نقل کیا ہے اور وہ اس شان کے ائمہ میں سے تھے۔“

(البداية والنهاية ج ۱۰ ص ۶۴۶)

دوسرے مقام پر حافظ موصوف نے سیدنا امام عالی مقام رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کا واقعہ بیان کرنے سے قبل یوں عنوان قائم کیا ہے:

وَهَذِهِ صِفَةٌ مَقْتَلِهِ رحمۃ اللہ علیہ مَا اخُوذَ مِنْ كَلَامِ اَيُّمَةِ هَذَا الشَّانِ، لَا كَمَا يَزْعُمُهُ اَهْلُ التَّشْيِيعِ مِنَ الْكُذِبِ الصَّرِيحِ وَالْبُهْتَانِ.

”اور یہ اُن کے واقعہ شہادت کا بیان ہے جو اس شان کے ائمہ کے کلام سے

ماخوذ ہے، نہ کہ صریح بہتان بازوں اور جھوٹے اہل تشیع سے۔“

اور اس کے معابد لکھا ہے:

قَالَ أَبُو حَنِيفٍ.

”ابوحنیفہ بیان کرتے ہیں۔“

(البداية والنهاية ج ۱۱ ص ۵۲۱)

غور فرمائیے کہ پہلے کہا کہ صریح جھوٹے اور بہتان باز شیعوں سے روایت نہیں کریں گے پھر فرمایا: ”قَالَ أَبُو حَنِيفٍ“ تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حافظ ابن کثیر کے نزدیک ابوحنیفہ شیعہ اور جھوٹا نہیں ہے، لیکن دوسرے مقامات پر حافظ ابن کثیر نے انہیں شیعہ لکھا بھی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک وہ عیہہ اولیٰ میں سے ہوں گے، تاہم حافظ ابن کثیر کی یہ عادت بھی تھی کہ جہاں کوئی بات اُن کی پسند کے مطابق نہیں ہوتی تھی تو وہاں وہ سارا زور جرح پر لگاتے تھے اور تعدیل کو یکسر نظر انداز کر دیتے تھے۔ اس کی بعض مثالیں ہم نے ”شرح کتاب الأربعین فی فضائل آل البيت الطاہرین“ میں قلم بند کی ہیں، اگر آپ چاہیں تو امہات المؤمنین کے مفاضلہ کی بحث میں دیکھ سکتے ہیں۔ الغرض ابوحنیفہ سے کوئی مؤرخ و مصنف بے نیاز نہیں رہ سکتا، خواہ وہ ابن جریر ہو، ابن اثیر ہو، ابن کثیر ہو یا کوئی لکیر کا فقیر ہو۔ یہ الگ بات

ہے کہ بعض لوگ ”بیٹھا ہپ ہپ اور کڑوا تھو تھو“ والا معاملہ بھی کرتے ہیں۔

ابوحنفہ لوط بن یحییٰ کے بارے میں بعض یمنی علماء اہل سنت نے زبردست بات کہی ہے، انہوں نے فرمایا ہے کہ ابوحنفہ پر یوں بے دردی سے جرح کی گئی ہے جس طرح امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر کی گئی ہے، تو کیا ایسے اکابر محدثین کی جرح امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف آنکھیں بند کر کے قبول کر لی جائے؟ انہوں نے فرمایا: ابوحنفہ کوئی کذاب یا وضاع شخص نہیں تھا لیکن اس کا جرم یہ تھا کہ وہ محبت اہل بیت تھا۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے معاویہ و ابن العاص

جس طرح بعض طلقاء کی خواہش تھی کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ قتل ہو جائیں اور پھر ان کی یہ خواہش پوری بھی ہوئی اور انہوں نے اس سے فائدہ بھی اٹھایا، یعنی قصاص کا بہانہ بنا کر عوام کی حمایت حاصل کی۔ چنانچہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ مشہور و متواتر حدیث ”الْفِتْنَةُ الْبَاطِنِيَّةُ“ جس کو ہم پہلے بھی نقل کر چکے ہیں، کی مدلل و مفصل تشریح کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”پس اس سے ظاہر ہوا کہ وہ باطن میں باغی تھے اور ظاہر میں قصاص عثمان رضی اللہ عنہ کی آڑ لینے والے تھے۔ پس یہ حدیث ان پر طعن کرنے والی ہے اور ان کی اتباع سے روکنے والی ہے، لیکن وہی ہو کر رہا جو تقدیر میں لکھا تھا، پس ان کے ہاں جو کچھ قرآن و حدیث میں مرقوم تھا سب متروک ہو گیا۔“

(مرقاۃ شرح مشکاۃ ج ۱۰ ص ۲۰۱، وط: ج ۱۱ ص ۱۸)

اسی طرح دنیا کے دلدادہ ان کے بعض ساتھیوں کی بھی ایسی ہی خواہش تھی، وہ چاہتے تھے کہ جنگ جمل میں ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا کام بھی تمام ہو جاتا تو ان کے لیے معاملہ مزید آسان ہو جاتا۔ چنانچہ امام ابن البربر رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۲۸۵ھ لکھتے ہیں:

وَقَالَ عُمَرُو لِعَائِشَةَ رَجِمَهَا اللَّهُ : لَوِ دِدْتُ أَنَّكَ قُتِلْتَ يَوْمَ
الْجَمَلِ ، لَقَالْتُ لِمَ لَا أَبَا لَكَ ؟ قَالَ : كُنْتُ تَمُوتِينَ بِأَجْلِكَ وَتَدْعُلِينَ
الْجَنَّةَ ، وَتَجْعَلِينَ أَكْبَرَ الْعَشِيرَةِ عَلَى عَلِيٍّ .

”عمر بن العاص نے سیدہ عائشہ رحمہا اللہ سے کہا: میری بڑی خواہش تھی کہ آپ جہل کے دن قتل کر دی جاتیں۔ انہوں نے فرمایا: تیرا کوئی باپ نہ ہو، کیوں؟ اُس نے کہا: آپ تو اپنے وقت پر ہی وفات پاتیں اور جنت کو سدھار جاتیں اور ہم آپ کی شہادت کو علی بن ابی طالب کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا بڑا بہانہ بنا لیتے۔“

(الکامل فی اللغة والأدب ج ۱ ص ۳۲۹)

قتل وقصاص سے مطلوب تک رسائی

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں ساتھیوں کی ایسی خواہش کیوں تھی؟ اس کی حکمت تو خود عمرو بن العاص کے الفاظ میں ہی آگئی ہے تاہم یہاں اس پہلو پر مزید روشنی ڈالنا بھی مناسب ہے۔ کتاب و سنت سے ثابت ہے کہ حصول مطلب کی خاطر دوسرے انسان کا قتل اتنا ہی قدیم ہے جتنا انسان خود قدیم ہے۔ کبھی کسی قتل سے انسان کو اُس کا مطلوب فوراً مل جاتا ہے کہ جو نبی مد مقابل قتل ہو جاتا ہے تو اُس کا منصب، جگہ یا اُس کی چیز قاتل کو مل جاتی ہے بشرطیکہ قاتل قتل کو چھپانے میں کامیاب رہے اور فوری طور پر اُس کا قتل کرنا یا قتل کرانا ظاہر نہ ہو تو اُسے قتل کرنے کا فائدہ مل جاتا ہے، جیسا کہ قاتلین یوسف علیہ السلام کو وقتی فائدہ حاصل ہوا تھا۔ یاد رہے کہ وہ انہیں کنوئیں میں پھینک کر اپنے طور پر اُن کا کام تمام کر چکے تھے، اسی لیے تو انہوں نے کہا تھا کہ انہیں بھیر یا کھا گیا ہے۔

کبھی جنسی لذت کے حصول کی خاطر بھی قتل ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے کہ انسان کا پہلا قتل

عورت کی وجہ سے ہوا۔ (المائدہ: ۲۷، ۳۰)

کبھی کسی قتل سے مقصد فوراً ہاتھ نہیں آتا مگر قاتل حصول اقتدار یا بقائے اقتدار کی خاطر جن لوگوں کو اپنے لیے خطرہ محسوس کرتا ہے انہیں قتل کرتا یا کراتا چلا جاتا ہے، جیسا کہ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر فرعون کے بارے میں مذکور ہے۔ ہمارے ملک میں بھی بعض اشخاص نے ایک ہی خاندان کے کئی افراد کو یکے بعد دیگرے قتل کر کر اپنے لیے اقتدار کا راستہ صاف کیا اور بالآخر اپنے مطلوب کو پالیا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک اینکر نے مشہور قانون دان احمد رضا قصوری صاحب سے دریافت کیا: قصوری

صاحب! آپ کیا سمجھتے ہیں کہ فلاں انسان کا قاتل کون ہے؟ انہوں نے کہا: قاتل کی تین وجوہ ہوتی ہیں: زن، زراور زمین۔ قتل کے بعد غور کرو کہ مقتول کی چیز پر کون قابض ہے؟ پھر کہا: یہاں زراور زمین نہیں بلکہ اقتدار ہے، لہذا مقتول کی بدولت جو اقتدار کو پہنچا قاتل کا گھر ابھی اُسی کی طرف جائے گا۔

قصوری صاحب نے پتے کی بات کی ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ جب کسی عزیز کا قاتل زراور زمین کی خاطر ہو تو اکثر قاتل ہی مدعی بن جاتا ہے، جیسا کہ سورۃ البقرۃ میں مذکور ہے کہ قاتل ہی مدعی بن گیا تھا۔ کچھ ایسی ہی صورت سیدنا عثمان ؓ کے قتل پر ہوئی کہ جو لوگ چاہتے تھے کہ حضرت عثمان ؓ قتل ہو جائیں وہی مدعی اور طالبین قصاص بن گئے تھے، جیسا کہ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح، سیدنا عمار بن یاسر اور ملا علی قاری رحمہم اللہ کے اقوال آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

وہی قاتل وہی نوحہ خواں

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے جس بندے نے قتل کیا یا کرایا ہوتا ہے داویلا اور نوحہ بھی وہی زیادہ کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے کہ برادر ابن یوسف ؑ نے عمداً اپنے بھائی کو موت کے گھاٹ اتارنے کی خاطر کنویں میں ڈال دیا اور شام کو روتے ہوئے آئے اور اپنے بابا کو کہا: اُسے بھیڑیا کھا گیا ہے، حالانکہ یہ سراسر جھوٹ تھا۔ ارشادِ الہی ہے:

وَجَاءَ وَآبَاؤُهُمْ عِشَاءً يَتَسَوَّوْنَ. قَالُوا يَا أَبَانَا إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا

يُوسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ وَمَا أَنتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِينَ.

”اور وہ آئے اپنے بابا کے پاس عشاء کے وقت گریہ ڈاری کرتے ہوئے۔ (آکر)

کہا: باوا جی! ہم ڈرا گئے کہ دوڑ لگائیں اور ہم چھوڑ گئے یوسف کو اپنے سامان کے پاس

تو کھا گیا اُس کو بھیڑیا، اور آپ نہیں مانتے ہمارے بات اگرچہ ہم سچے ہیں۔“

(یوسف: ۱۶، ۱۷)

غور کیجئے کہ خود ہی قاتل اور خود ہی گریہ کنوں کی اس سے زیادہ جی مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟ اور یہ بھی سوچئے کہ کتابِ محکم میں اللہ ﷻ نے ایسے واقعات آخر کیوں بیان فرمائے؟ فقط اس لیے کہ اگر امت

مسئلہ میں بھی کبھی کوئی ایسی سازش کی جائے تو اُمت کے دانا لوگ اُس سازش کو قرآن مجید کی روشنی میں فوراً سمجھ جائیں، یہی وجہ ہے کہ اس سورت کی آخری آیت میں احمقوں کے لیے نہیں بلکہ فقط عقل مندوں کے لیے فرمایا گیا ہے:

لَقَدْ كَانَ لِنَبِيِّكَ فَصِيحَةٌ عِبْرَةٌ لِأُولَى الْأَلْبَابِ.
 ”بے شک اُن کی خبروں سے عقل مندوں کی آنکھیں کھلتی ہیں۔“

(یوسف الطویل: ۱۱۱)

فی الجملہ یہ کہ جن لوگوں نے خلیفہ ثالث علیہ السلام کی شہادت کے بعد اُن کی خون آلود قمیص اٹھا کر رونا دھونا شروع کر دیا تھا وہ اسی طرح جھوٹے تھے جس طرح سیدنا یوسف الطویل کو اپنے ہاتھوں سے کنویں میں پھینک کر خون آلود قمیص اٹھا کر رونے والے برادرانِ یوسف جھوٹے تھے۔ فرق یہ ہے کہ حضرت عثمان علیہ السلام کے قتل کے خواہاں اُن کے چچا زاد تھے اور سیدنا یوسف الطویل کے قاتلین اُن کے باپ زاد تھے۔ اندازہ تو کیجئے کہ جو لوگ اپنے ہاتھوں سے کنویں میں پھینک کر اُن کا کام تمام کر کے آئے تھے وہی خون آلود قمیص دکھا کر کہتے تھے کہ قاتل ہم نہیں بلکہ بھیڑیا ہے اور اُلٹا یہ بھی کہتے تھے کہ ہم ہیں تو سچے لیکن ہمیں سچا مانا نہیں جائے گا۔ یعنی خود ہی قاتل، خود ہی گریہ کن، خود ہی مدعی اور خود ہی پیکرِ صدق و صفا۔ شاید ایسے ہی موقع کے لیے کسی دل جلے نے کہا ہے۔

وہی قاتل، وہی شاہد، وہی مصنف ٹھہرے

اقرباء میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر؟

امام حسن کے لیے بعض سینوں کے کینے کی تصریح

مذکور الصدر تصریحات کی روشنی میں معلوم ہوا کہ چونکہ اہل بیت کرام علیہم السلام کی بے پناہ مقبولیت کی وجہ سے اُن لوگوں میں مقابلہ کی سکت نہیں تھی اس لیے اُنہوں نے ایسے حربے استعمال کر کے عوام کی ہمدردی حاصل کی۔ پھر اسی طرح وہ مولانا علی علیہ السلام کے بعد امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی مقبولیت سے بھی خوف زدہ تھے، اور یہی بات اُن کی قلبی کدورت کا باعث تھی، حتیٰ کہ جب کڑی شرائط کے تحت صلح ہوئی تو اُن کی

کدورت مزید بڑھ گئی، اور وہ کدورت اُس وقت عیاں ہو گئی جب سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔ چنانچہ امام ابو داؤد اپنی سند کے ساتھ لکھتے ہیں:

”خالد بیان کرتے ہیں: حضرت مقدم بن معد کرب رضی اللہ عنہ، عمرو بن اسود اور اہل قسریں سے بنو اسد کا ایک شخص معاویہ کے پاس آئے۔ معاویہ نے حضرت مقدم رضی اللہ عنہ سے کہا:

أَعْلَيْتُكَ أَنَّ الْحَسَنَ بْنَ عَلِيٍّ تُوُفِّيَ؟ فَرَجَعَ الْمُقَدَّمُ، فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ: أَتَرَاهَا مُصِيبَةً؟ قَالَ لَهُ: وَلَيْمَ لَا أَرَاهَا مُصِيبَةً وَقَدْ رَضَعَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لِيُمِي حَجَّجِرَهُ، فَقَالَ: هَذَا مِنِّي وَحُسَيْنٌ مِنِّي عَلِيٍّ؟ لَقَالَ الْأَسَدِيُّ: جَمْرَةٌ أَطْفَأَهَا اللَّهُ ﷻ، قَالَ: لَقَالَ الْمُقَدَّمُ: أَمَا أَنَا، فَلَا أَبْرَحُ الْيَوْمَ حَتَّى أَغِيظَكَ وَأَسْمِعَكَ مَا تَكْرَهُ، ثُمَّ قَالَ: يَا مُعَاوِيَةُ إِنْ أَنَا صَدَقْتُ فَصَدِّقْنِي، وَإِنْ أَنَا كَذَبْتُ فَكَذِّبْنِي، قَالَ: أَفْعَلُ:

قَالَ: فَأَتَيْتُكَ بِاللَّهِ، هَلْ سَمِعْتَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَنْهَى عَنْ لُبْسِ الذَّهَبِ؟ قَالَ: نَعَمْ.

قَالَ: فَأَتَيْتُكَ بِاللَّهِ، هَلْ تَعْلَمُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى عَنْ لُبْسِ الْحَرِيرِ؟ قَالَ: نَعَمْ.

قَالَ: فَأَتَيْتُكَ بِاللَّهِ، هَلْ تَعْلَمُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى عَنْ جُلُودِ السِّبَاعِ وَالرُّكُوبِ عَلَيْهَا؟ قَالَ: نَعَمْ.

قَالَ: فَوَاللَّهِ لَقَدْ رَأَيْتُ هَذَا كُلَّهُ فِي بَيْتِكَ يَا مُعَاوِيَةُ! فَقَالَ مُعَاوِيَةُ: قَدْ عَلِمْتُ أَنِّي لَنْ أَتُجَوِّمَكَ يَا مُقَدَّمُ، قَالَ خَالِدٌ: فَأَمَرَ لَهُ مُعَاوِيَةُ بِمَا لَمْ يَأْمُرُ لِصَاحِبِيهِ، وَفَرَضَ لِابْنِهِ فِي الْمِئْتَيْنِ، فَفَرَّقَهَا الْمُقَدَّمُ عَلَى أَصْحَابِهِ، وَلَمْ يُعْطِ الْأَسَدِيُّ أَحَدًا شَيْئًا مِمَّا أَخَذَ، فَلَبَّغَ ذَلِكَ مُعَاوِيَةَ، فَقَالَ: أَمَا

الْحَقْدَامُ لَرَجُلٍ كَرِيمٍ بَسَطَ يَدَهُ ، وَأَمَّا الْأَسَدِيُّ فَرَجُلٌ حَسَنُ
الْإِمْسَاكِ لِشَيْئِهِ .

”کیا تم جانتے ہو کہ حسن بن علی وفات پا گئے؟ اس پر حضرت مقدم رحمہ اللہ نے اِنَّا
لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ کہا، اس پر کسی شخص نے انہیں کہا: کیا تم اس کو مصیبت سمجھتے
ہو؟ انہوں نے اُس کو فرمایا: میں اس بات کو کیوں نہ مصیبت سمجھوں جبکہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنی گود میں بٹھا کر فرمایا تھا: یہ مجھ سے ہے اور حسین علی سے ہے۔ اس
پر اسدی نے کہا: وہ ایک انکارہ تھا جسے اللہ تعالیٰ نے بھجوا دیا۔ خالد کہتے ہیں: اس پر
مقدم رحمہ اللہ نے معاویہ کو کہا: آج میں تم کو اُس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک کہ
تمہیں غصہ نہ دلاؤں اور وہ کچھ نہ سناؤں جو تمہیں ناگوار ہو۔ پھر فرمایا: اے معاویہ!
میں بات شروع کرتا ہوں، اگر میں سچ کہوں تو میری تصدیق کرنا اور اگر میں جھوٹ
بولوں تو میری تردید کروینا۔ معاویہ نے کہا: میں ایسا ہی کروں گا۔

حضرت مقدم رحمہ اللہ نے فرمایا: میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں: کیا تم نے رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سونا پسینے کی ممانعت سنی تھی؟ انہوں نے کہا: ہاں۔

حضرت مقدم رحمہ اللہ نے فرمایا: میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں: کیا تم جانتے ہو
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشم پہننے سے منع فرمایا؟ انہوں نے کہا: ہاں۔

حضرت مقدم رحمہ اللہ نے فرمایا: میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں: کیا تم جانتے ہو
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے درندوں کی کھال کو پہننے اور اُس پر بیٹھنے سے منع فرمایا تھا؟
انہوں نے کہا: ہاں۔

اس پر حضرت مقدم رحمہ اللہ نے فرمایا: خدا کی قسم، اے معاویہ! میں یہ سب کچھ
تمہارے گھر میں دیکھتا ہوں۔ اس پر معاویہ نے کہا: اے مقدم! مجھے معلوم ہے، آج
میں تم سے جان نہیں چھڑا سکتا۔ خالد کہتے ہیں: اس کے بعد معاویہ نے سیدنا مقدم رحمہ اللہ

کے لیے اتنے مال کا حکم دیا کہ اتنا اُن کے دوسرے ساتھیوں کے لیے نہ دیا اور اُن کے بیٹے کا وظیفہ دوسو دینار والے لوگوں کے برابر کر دیا۔ پس سیدنا مقدمؓ نے وہ سب کچھ اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا۔ خالد کہتے ہیں: اسدی کو جو ملتا تھا وہ اس نے کسی کو نہ دیا۔ یہ خبر معاویہ کو پہنچی تو اُنہوں نے کہا: مقدم ایک کریم شخص ہیں اُنہوں نے اپنے ہاتھ کھول دیے، رہا اسدی تو وہ اپنی چیز کو اچھے طریقے سے سنبھالنے والا ہے۔“

(سنن أبی داود بتحقیق الألبانی: کتاب اللباس، باب فی جلود النمرور والسباع، ص ۷۳۸ حدیث ۴۱۳۱)

حدیث مقدم بن معدیکرب کی تحقیق

اس حدیث میں چار راوی ہیں اور چاروں حمسی ہیں:

- ۱۔ عمرو بن عثمان بن سعید ابو حفص
- ۲۔ بقیہ بن ولید بن صائد ابو محمد
- ۳۔ بحیر بن سعید ابو خالد السحولی
- ۴۔ خالد بن معدان بن ابی یکر بن عبد اللہ الکلاعی۔

ان چاروں راویوں میں سے فقط ثانی الذکر راوی کمزور ہیں، ان کے بارے میں جرح و تعدیل کے دونوں اقوال ملتے ہیں اور ان کی جرح میں سب سے سخت قول ان کے مدلس ہونے کا ہے، لیکن ساتھ ہی کہا گیا ہے کہ جب یہ ثقہ اور معروف رجال سے روایت کریں تو پھر ان کی روایت کو قبول کرو۔ چنانچہ عبد اللہ بن احمد بن حنبل بیان کرتے ہیں:

سَمِعَ أَبِي عَنْ بَقِيَّةَ وَاسْمَاعِيلَ لَقَالَ: بَقِيَّةٌ أَحَبُّ إِلَيَّ، وَإِذَا حَدَّثَ عَنْ قَوْمٍ لَيْسُوا بِمَعْرُوفِينَ فَلَا تَقْبَلُوهُ.

”میرے بابا سے بقیہ بن ولید اور اسماعیل بن حیاش کے متعلق دریافت کیا گیا تو اُنہوں نے فرمایا: بقیہ مجھے زیادہ پسند ہے اور جب وہ ایسی قوم سے حدیث نقل کرے

جو معروف نہ ہو تو پھر اُسے قبول نہ کرو۔

یعقوب، ابن سعد، عیسیٰ، ابو زرہ اور ابن المبارک سے بھی ان کے بارے میں

”اسی طرح منقول ہے۔“

(تہذیب التہذیب ملخصاً ج ۱ ص ۴۴۵، ۴۴۶)

امام نسائی فرماتے ہیں:

إِذَا قَالَ: حَدَّثَنَا أَوْ أَخْبَرَنَا فَهُوَ ثِقَّةٌ.

”جب وہ ”حَدَّثَنَا“ یا ”أَخْبَرَنَا“ کہے تو وہ ثقہ ہے۔“

ابن عدی فرماتے ہیں:

وَإِذَا رَوَى عَنْ أَهْلِ الشَّامِ فَهُوَ ثَبَتٌ.

”اور جب وہ اہل شام سے روایت کرے تو ثابت ہے۔“

(تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۴۴۶)

امام حاکمی لفظ ”ثَبَتٌ“ کی توضیح میں لکھتے ہیں:

”ب کی جزم سے ”ثَبَتٌ“ کا معنی ہے: دل، زبان، کتاب اور حجت میں ثابت۔“

(فتح المغیث ج ۲ ص ۲۷۹)

قدیم محدثین کرام سے بقیہ بن ولید کے بارے میں یہ تین اصولی باتیں منقول ہیں اور ہم نے جو

حدیث لکھی ہے اُس میں یہ تینوں باتیں موجود ہیں:

۱۔ بقیہ بن ولید جن راویوں سے نقل کر رہا ہے وہ سارے کے سارے معروف ہیں۔

۲۔ اِس حدیث کو بقیہ نے ”حَدَّثَنِي“ کے الفاظ سے روایت کیا ہے، جیسا کہ مسند احمد کی سند میں یہ

الفاظ موجود ہیں۔

۳۔ امام ابن عدی نے فرمایا کہ جب یہ اہل شام سے روایت کرے تو پھر یہ ثابت القلب واللسان ہے،

اور لطف کی بات یہ ہے کہ بشمول اِس کے اِس حدیث کے تمام راوی حمصی اور شامی ہیں، اہل حمص و شام

سب تو نہیں لیکن اُن کی اکثریت بغض اہل بیت میں ملوث تھی لیکن تدریجاً وہ حکیم ذاتِ محمد ﷺ سے چاہتی ہے
جُاُ گلواریتی ہے۔

سو چونکہ یہ ساری باتیں اس حدیث کی سند میں جمع ہو گئی ہیں اسی لیے علامہ ناصر الدین البانی نے
اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ شیخ احمد شاہ کرنے کہا ہے: ”إِسْنَادُهُ صَحِيحٌ“ (اس کی سند صحیح ہے)، امام ذہبی
نے لکھا ہے: ”إِسْنَادُهُ قَوِيٌّ“ (اس کی سند قوی ہے)

بعض لوگوں سے اس کی سند کو ضعیف قرار دینے میں غلطی ہو گئی، شاید اس لیے کہ اُن کی نظر بقیہ بن
ولید کے ملس ہونے پر اور بعض اقوال کے مطابق ”تدلیس التوسیة“ میں ملوث ہونے پر ڈک گئی لیکن
اُنہوں نے یہ غور نہیں کیا کہ اس حدیث کی سند میں ایسی کوئی علت نہیں پائی جاتی۔ جن حضرات کی توجہ
بالخصوص اس حدیث کی سند پر مرکوز ہو گئی تو اُنہوں نے اس کی سند کو صحیح اور قوی مان لیا اور جن کو بقیہ بن ولید کا
لفظ ملس ہونا ہی یاد رہا تو اُنہوں نے اس کی سند کو ضعیف قرار دے دیا جو کہ زیادتی ہے۔ اعتدال و انصاف
کی بات یہ ہے کہ چونکہ یہ حدیث بقیہ بن ولید نے معروف اور ثقہ رجال سے روایت کی اور اس میں اُنہوں
نے ”خَدَّثَنِي“ کے الفاظ کی بھی صراحت کی ہے اس لیے اس حدیث کو صحیح مانا جائے جیسا کہ شیخ احمد شاہ کر اور
علامہ البانی نے صحیح مانا ہے اور علامہ ذہبی نے اس کی سند کو قوی مانا ہے، لیکن تعجب ہے کہ دورِ حاضر میں بعض
لوگوں نے اس معتدل طرزِ عمل سے ہٹ کر اس حدیث کی سند پر بہت ہی سخت جرح کر دی ہے اور تعدیل کو
یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ ایسے لوگوں سے ہماری گزارش ہے کہ وہ ایسے غیر معتدل انداز سے گریز فرمائیں
ورنہ ایسے تعنت بھرے انداز سے بدیلویت کا بالعموم اور بعض تنظیموں کا بالخصوص لکھ ہی نہیں بچے گا۔ شاید وہ
یہ تصور کرتے ہیں کہ تعدیل کو نظر انداز کر کے صرف تخریج کی چھانی لگانا فقط اُن کو آتا ہے اور کسی کو نہیں آتا؟

”أَتَرَاهَا مُصِيبَةً؟“ کا قائل کون؟

سنن ابی داؤد کے متن میں کچھ مخفی رکھنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن حقیقت پھر بھی مخفی نہیں رہ سکی۔ سنن
ابی داؤد میں ہے: ”قَالَ لَهُ رَجُلٌ أَتَرَاهَا مُصِيبَةً؟“ (کسی شخص نے کہا: کیا آپ اسے مصیبت سمجھتے ہیں؟)
پھر ایک اسدی شخص نے کہا: ”بَحْمَرَةٌ أَطْفَأَهَا اللَّهُ ﷻ“ (وہ ایک انگارہ تھا جسے اللہ ﷻ نے بجھا دیا) سوال

یہ ہے کہ اگر یہ دونوں غیر شرعی، غیر اخلاقی اور بغض بھری باتیں معاویہ کے علاوہ دوسرے دو شخصوں نے کہیں تو حضرت مقدم رحمۃ اللہ علیہ نے معاویہ کو کھری کھری سنانا کیوں شروع کر دیا؟ دراصل ان میں سے پہلی بات کے قائل خود معاویہ ہیں، جیسا کہ امام احمد، امام طبرانی، امام ابن عساکر، امام ذہبی اور شمس الحق عظیم آبادی کی نقل کردہ حدیث میں یہ تصریح موجود ہے:

لَقَالَ لَهُ مُعَاوِيَةُ : اَتَرَاَهَا مُصِيبَةً؟

”تو معاویہ نے انہیں کہا: کیا آپ اس کو مصیبت سمجھتے ہیں؟“۔

(مسند احمد (بتحقیق احمد شاکن) ج ۱۳ ص ۲۹۵ حدیث ۱۷۱۲۳، وط: (شعیب) ج ۲۸ ص ۴۲۶ حدیث ۱۷۱۸۹؛ المعجم الکبیر ج ۳ ص ۳۴ حدیث ۲۶۲۸؛ أخبار الحسن للطبرانی ص ۶۸ حدیث ۱۰۴؛ تاریخ دمشق ج ۶۰ ص ۱۸۷، ۱۸۸؛ سیر أعلام النبلاء ج ۳ ص ۱۵۸؛ عون المعبود فی مجلد واحد ص ۱۸۸۴، وط: ج ۱۱ ص ۱۸۹، ۱۹۰)

جبکہ دوسرا قول اسدی شخص نے از خود نہیں کیا بلکہ اُس سے پوچھا گیا تو اُس نے میرے محفل کی خواہش کے مطابق جواب دیا، اور میرے مجلس خود بادشاہ سلامت معاویہ ہی تھے، انہوں نے ہی اسدی سے پوچھا:

مَا تَقُولُ اَنْتَ ؟ قَالَ : جَمْرَةٌ اُطْلِفْتُ .

”تم کیا کہتے ہو؟ اُس نے کہا: ایک انگارہ تھا۔ بجھا دیا گیا۔“۔

(سیر أعلام النبلاء ج ۳ ص ۱۵۸؛ المعجم الکبیر ج ۲۰ ص ۲۶۹، حدیث ۶۳۶) البانی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے، شیخ احمد شاکن نے کہا: اس کی سند صحیح ہے اور امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: اس کی سند قوی ہے۔

شہادتِ حسن پر قلب کو اطمینان ہو گیا

امام حسن مجتبیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی زہر سے اچانک شہادت پر معاویہ کی خوشی کا تذکرہ علامہ ابن خلکان اور علامہ دبیری نے بھی کیا ہے، مؤخر الذکر کے الفاظ ہیں:

فَلَمَّا بَلَغَ مُعَاوِيَةُ مَوْتَهُ ، سَمِعَ نَكْبِيرَهُ مِنَ الْخَضَرَاءِ ، فَكَبَّرَ أَهْلُ

الشَّامِ لِذَلِكَ التَّكْبِيرِ ، فَقَالَتْ فَاجْتَنِبْتُ قَرْظَةَ لِمَعَاوِيَةَ : أَقَرَّ اللَّهُ
عَيْنَكَ ، مَا الَّذِي كَبُرَتْ لِأَجْلِهِ ؟ فَقَالَ : مَاتَ الْحَسَنُ ، فَقَالَتْ : أَعْلَى
مَوْتِ ابْنِ فَاطِمَةَ تُكَبِّرُ ؟ فَقَالَ : وَاللَّهِ مَا كَبُرَتْ شَمَاتَةَ بِمَوْتِهِ ، وَلَكِنْ
اسْتَرَاحَ قَلْبِي .

وَدَخَلَ عَلَيْهِ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا ، فَقَالَ لَهُ : يَا ابْنَ
عَبَّاسٍ أَهْلٌ تَذَرِي مَا حَدَّثَ فِي أَهْلِ بَيْتِكَ ؟ فَقَالَ : لَا أَذَرِي مَا حَدَّثَ ،
إِلَّا أَنِّي أَزَاكَ مُسْتَبْشِرًا ، وَقَدْ بَلَغَنِي تَكْبِيرُكَ ، فَقَالَ : مَاتَ الْحَسَنُ ،
فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ يَرْحَمُ اللَّهُ أَبَاهُ مُحَمَّدًا ، فَلَالًا ، وَاللَّهِ يَا مَعَاوِيَةُ لَا تَسُدُّ حُفْرَتَهُ
حُفْرَتَكَ ، وَلَا يَزِيدُ عُمرُهُ فِي عُمرِكَ ، وَلَئِنْ كُنَّا قَدْ أَصَبْنَا بِالْحَسَنِ ،
فَلَقَدْ أَصَبْنَا بِإِمَامِ الْمُتَّقِينَ وَخَاتَمِ النَّبِيِّينَ ، فَجَبَرَ اللَّهُ بِذَلِكَ الصَّدْعَةَ ،
وَسَكَّنَ بِذَلِكَ الْعَبْرَةَ ، وَكَانَ اللَّهُ الْخَلَفَ عَلَيْنَا مِنْ بَعْدِهِ .

”جب معاویہ کو ان کی وفات کی خبر پہنچی تو ایوان معاویہ سے تکبیر (اللہ اکبر) کی
آواز سنی گئی، اس پر اہل شام نے بھی تکبیر کہی تو فاختہ بنت قرقطہ نے معاویہ کو کہا: اللہ
آپ کی آنکھوں کو ٹھنڈا رکھے، آپ نے کس بات پر تکبیر کہی ہے؟ معاویہ نے کہا: حسن
مرگیا۔ اس پر فاختہ نے کہا: کیا آپ نے فرزندِ فاطمہ کی وفات پر تکبیر کہی ہے؟ معاویہ
نے کہا: میں نے ان کی موت کی خوشی میں تکبیر نہیں کہی لیکن میرے دل کو سکون حاصل
ہوا ہے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما معاویہ کے پاس تشریف لائے تو اُس نے
اُن سے کہا: اے ابن عباس! کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے اہل بیت میں کیا سانحہ رونما
ہوا؟ انہوں نے فرمایا: مجھے نہیں معلوم کہ کیا پیش آیا مگر میں آپ کو خوش دیکھ رہا ہوں
اور مجھے آپ کا تکبیر کہنا بھی پہنچ چکا ہے۔ اس پر معاویہ نے کہا: حسن مرگیا۔ سیدنا ابن

عباس ؑ نے تین بار فرمایا: اللہ تعالیٰ ابو محمد (امام حسن ؑ) پر رحمت فرمائے۔ اللہ کی قسم اے معاویہ! اُن کی قبر تمہاری قبر کی جگہ کو نہیں بھرے گی اور نہ ہی اُن کی عمر تمہاری عمر میں اضافہ کرے گی۔ اگر ہمیں شہادت حسن کی وجہ سے صدمہ پہنچا ہے تو یقیناً ہم امام المتقین خاتم النبیین ؑ کی جدائی کے صدمہ سے بھی دو چار ہو چکے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے اُس پریشانی کو زائل کیا اور آنسوؤں کو سکون دیا، اور اللہ تعالیٰ ہی اُن کے بعد ہمارا نگہبان ہے۔“

(حیاء الحیوان ج ۱ ص ۲۱۲، وفیات الأعیان ج ۲ ص ۶۶، ۶۷)

عصر حاضر کے امام النواصب کے بعض مریدین نے ”حیاء الحیوان“ میں اس جملہ کا ترجمہ یوں کیا ہے:

لَقَالَ: وَاللَّهِ مَا كَثُرَتْ خِمَاةٌ بِمَوْتِهِ، وَلَكِنْ اسْتَرَاحَ قَلْبِي.
”حضرت امیر معاویہ ؓ فرمانے لگے کہ میں نے اُن کے وفات پانے کی خوشی میں نہیں تکبیر کہی بلکہ اس بناء پر کہی ہے کہ میرے قلب کو اطمینان ہو گیا ہے۔“

(عطار الجنان فی ترجمۃ حیاء الحیوان ج ۱ ص ۲۰۸)

نواصب زمانہ سے سوال ہے کہ قرآن و سنت میں کسی مصیبت پر ترجیح (إِنَّا لِلَّهِ وَإِلَيْهِ رَاجِعُونَ) کہنے کا حکم ہے یا تکبیر (اللہ اکبر) کہنے کا؟ تکبیر خوشی پر ہوتی ہے، چنانچہ قرآن مجید میں روزوں کی تکمیل کے تذکرے میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَى مَا هَذَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ.
”تا کہ تم کفّتی پوری کر لیا کرو اور اللہ کی بڑائی بیان کیا کرو، اس پر کہ اُس نے تمہیں ہدایت دی اور تا کہ تم شکر گزاری کیا کرو۔“

(البقرة: ۱۸۵)

عیدین کے دنوں میں جو تکبیرات کہی جاتی ہیں وہ عید کی خوشی کے لوٹ آنے پر بطور شکرانہ کہی جاتی

ہیں، جبکہ اسی سورت کی آیت نمبر ۱۵۶ میں ہے کہ مصیبت پر ”إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ کہا جاتا ہے لیکن افسوس کہ جس شخص کے بارے میں یہ احادیث ”اللّٰهُمَّ عَلِمَ مُعَارِيَةَ الْكِتَابِ“ اور ”اللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ قَادِمًا مَّهْدِيًّا“ ذکر کی جاتی ہیں اُس نے عام بندے کے مرجانے پر تو کیا بعینہ شکل مصطفیٰ ﷺ کے اوچھل ہونے پر تکبیر کہنا شروع کر دیا۔ کیا اسی کو قرآن فہمی کہا جاتا ہے اور کیا اسی کا نام ہادیت و مہدیت ہے؟ پھر اس پر زیادتی یہ کہ ایک خاتون نے جب سنجیدگی کے ساتھ اس گھٹیا حرکت پر اعتراض کیا تو اُسے وہ جواب دیا جو اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ بندہ پوچھے کہ شبیہ مصطفیٰ، دل بند مرتضیٰ، جگر گوشہ زہرا سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہم السلام کی اچانک شہادت پر کہنا کہ میں خوش تو نہیں ہوا لیکن ”میرے قلب کو اطمینان ہو گیا“ کیا کسی پیارے کے اچانک شہید ہو جانے پر قلب مضطرب ہوتا ہے یا مطمئن؟ افسوس ہے کہ اُن کا قلب تو شہادت حسن مجتبیٰ پر مضطرب نہ ہوا لیکن جن کا دل مضطرب ہوا موصوف اُن پر بھی معترض ہوئے۔ حضرت مقدم بن معدی کرب ﷺ نے شہادت امام حسن کی خبر سن کر کہا ”إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ تو موصوف نے فوراً نہیں کہا: کیا تم اس کو مصیبت سمجھتے ہو؟

ذرا شان مجتہدانہ میں غور تو کیجئے کہ فاختہ بنت قرقطہ نے جب حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ”کیا آپ نے فرزندِ فاطمہ کی وفات پر تکبیر کہی؟“ تو اُسے کیسا مجتہدانہ جواب دیا۔ خود انصاف کیجئے بھلا اطمینان قلب اور خوشی میں کیا فرق ہے؟ جبکہ بعض دوسری روایات میں صراحۃً لفظ ”سُرُور“ بھی آیا ہے۔ چنانچہ علامہ سعودی لکھتے ہیں کہ امام پاک کی خیر شہادت سن کر معاویہ اتنا خوش ہوا کہ نعرہ بلند کیا تو اس پر فاختہ بنت قرقطہ نے کہا:

سُرَّكَ اللَّهُ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ مَا هَذَا الَّذِي بَلَغَكَ فَسُرَّتْ بِهِ؟

قَالَ: مَوْتُ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ.

”اے امیر المؤمنین! اللہ آپ کو سرور رکھے، یہ آپ کے پاس کیا چیز پہنچی ہے

جس نے آپ کو خوش کر دیا ہے؟“ کہا: حسن بن علی کی موت۔

خود حیاۃ الحیوان کے اگلے الفاظ میں جو سیدنا ابن عباس ؓ اور معاویہ کا مکالمہ آیا ہے اُس سے بھی ظاہر ہے کہ موصوف اتنا خوش تھے کہ اُن کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں تھے، اسی لیے تو سیدنا ابن عباس ؓ نے فرمایا ”لَا أَذْرِیْ مَا حَدَّثَ ، إِلَّا أَنِّیْ أَرَاكَ مُسْتَبْشِرًا“ (مجھے نہیں معلوم کہ کیا رونما ہوا مگر میں تمہیں خوش دیکھ رہا ہوں) یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ موصوف نے سیدنا ابن عباس ؓ کے ساتھ تعزیت نہیں کی اور نہ ہی یوں کہا کہ افسوس ہے کہ ہمارے نبی کا نواسہ شہید کر دیا گیا بلکہ کہا تو یوں کہا: ”یَمَّا بَنَى عَبَّاسُ اَهْلَ تَلْدِیْ مَا حَدَّثَ لَیْ اَهْلُ بَیْتِکَ؟“ (اے ابن عباس! کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے اہل بیت میں کیا سانحہ رونما ہوا؟) حالانکہ یوں بھی کہا جاسکتا تھا کہ ”اے ابن عباس! تم جانتے ہو کہ ہمارے نبی کے اہل بیت میں کیا سانحہ رونما ہوا؟“ اور صحیح حدیث میں آچکا ہے کہ اسدی بد بختی نے مجلسِ معاویہ میں امام پاک کو ”جَمْرَةٌ“ (انگارا) کہا تو موصوف کے ماتھے پر شکن تک نہ آئی، جبکہ یہاں موصوف شہادتِ امام حسن مجتبیٰ ؑ کو فقط سیدنا ابن عباس ؓ کے لیے سانحہ قرار دے رہے ہیں، جبکہ ایسی ہستیوں کا سانحہ ارتحال تمام مسلمانوں کا مشترک غم ہوتا ہے۔ سیدنا ابن عباس ؓ کو بھی چونکہ معاویہ سے ایسی غمخواری کی توقع نہیں تھی اسی لیے اُنہوں نے اُس کی بات کی پروا کیے بغیر فرمایا: ہاں اگر ہمیں یہ صدمہ پہنچا ہے تو ہم اس سے قبل اس سے بھی بڑے صدمہ سے دوچار ہو چکے ہیں تاہم اے معاویہ! ہمیشہ تم بھی نہیں رہو گے۔

اس عبارت میں مکمل سیاق و سباق کو مد نظر رکھتے ہوئے انصاف سے بتائیے کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ ؑ کی اچانک شہادت پر کسی کا ایسا اندازِ عمل امام پاک سے محبت کی علامت ہے یا بغض کی؟ اگر محبت کی علامت ہے تو عقلاً اور نقلاً واضح فرمائیے اور اگر بغض کی علامت ہے تو پھر درج ذیل حدیث کو ضرور مد نظر رکھئے۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ أَحَبَّ الْحَسْنَ وَالْحُسَيْنَ فَقَدْ أَحَبَّنِي ، وَمَنْ أَبْغَضَهُمَا فَقَدْ أَبْغَضَنِي .

”جس نے حسن اور حسین کو محبوب رکھا تو اُس نے مجھے محبوب رکھا اور جس نے اُن سے بغض رکھا تو اُس نے مجھ سے بغض رکھا۔“

بعض لوگ حیاۃ الحیوان وغیرہ کتب کو غیر معتبر کہہ کر اس واقعہ کو مسترد کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں لیکن انہیں یہ خیال بھی رہنا چاہیے کہ سنن ابی داؤد کی حدیث صحیح ہے اور حیاۃ الحیوان، وفیات الأعیان اور مروج الذهب وغیرہ کتب میں جو اس واقعہ کی تفصیل ہے یہ حدیث اُس کی مؤید ہے۔ نیز اگر کہا جائے کہ یہ سب روایات اس لیے قابل قبول نہیں کہ وہ صحابی تھے اور کوئی صحابی مہض اہل بیت نہیں ہو سکتا تو اس پر گزارش ہے کہ اگر ہر صحابی کہے جانے والے شخص کا محبت اہل بیت ہونا لازمی ہوتا تو نبی کریم ﷺ ہا بار اور مختلف الفاظ میں اہل بیت کرام علیہم السلام سے بعض رکھنے والے کے لیے ترہیب و تنبیہ کیوں فرماتے؟ اور ایسے شخص کو بے ایمان کیوں فرماتے؟ کیا اس قسم کی تمام احادیث نبویہ غیر صحابہ کے لیے ہیں؟

نیز موصوفہ اگر محبت اہل بیت ہی تھے تو اُس وقت روئے زمین پر وہ واحد اسلامی سربراہ تھے، کیا انہوں نے سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے زہر سے شہید کیے جانے پر کوئی از خود فوٹس لیا تھا اور جو لوگ امام حسن کی اُن کے جد کریم ﷺ کے ساتھ مدفن میں رکاوٹ بنے تھے اُن کی کوئی سرزنش کی تھی؟

بعض شارحین کا تکلف اور اُس کا بطلان

سنن ابی داؤد کے شارحین میں سے اکثر نے اس حدیث کی بلا تکلف شرح فرمائی ہے مگر بعض شارحین نے تصنع و تکلف سے بھی کام لیا ہے۔ چنانچہ بعض محکفین لکھتے ہیں:

(فَقَالَ الْمَقْدَامُ) حِينَ سَمِعَ مَا قَالُوهُ لِي ابْنِ بَنِي رَسُولِ اللَّهِ ﷺ حِينَ قِيلَ مُوَاعَاةٌ لِمُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِي سُفْيَانَ، لِمَا تَوَهَّمُوا مِنْهُ مِنَ التَّشْقِي بِقَتْلِهِ وَحَاشَى مُعَاوِيَةَ ﷺ أَنْ يَكُونَ فِي قَلْبِهِ بَغْضَاءٌ لِلْحَسَنِ أَوْ لِأَبِيهِ عَلِيٍّ ﷺ، لِأَنَّ الصَّحَابَةَ مُبْرَرُونَ مِنْ ذَلِكَ، لِشَهَادَتِهِ ﷺ لَهُمْ بِأَنَّهُمْ كَالنُّجُومِ الَّتِي يُهْتَدَى بِهَا وَيُسْتَضَاءُ بِنُورِهَا، لَا سِيَّمَا وَقَدْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لِمُعَاوِيَةَ: اللَّهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مُهْدِيًا.

”پس حضرت مقدمام ﷺ نے جب وہ بات سنی جو لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے نواسے کے بارے میں معاویہ بن ابی سفیان کی دل جوئی کے لیے کہی، کیونکہ

انہوں نے گمان کیا کہ معاویہ کو سیدنا حسن کے قتل سے خوشی ہوئی ہے، اور معاویہ اس بات سے دور تھے کہ اُن کے دل میں حسن یا اُن کے والد گرامی علیؑ کے لیے بغض ہو، بلاشبہ صحابہ اس بات سے مبرا ہیں کیونکہ اُن کے حق میں شہادت نبوی ﷺ ہے کہ وہ نجوم ہیں جن سے ہدایت اور نور حاصل کیا جاتا ہے، خصوصاً رسول اللہ ﷺ نے معاویہ کی شان میں فرمایا ہے: اے اللہ! اُسے ہادی اور مہدی بنادے۔“

(شرح سنن أبی داؤد لابن رسلان الرملي الشافعي ج ۱۶ ص ۴۲۲، ۴۲۳)

شیخ ابن رسلان شافعی کا یہ کلام چار وجوہ سے باطل ہے:

۱۔ اولاً اس لیے کہ مجلس معاویہ کے سامعین کو کوئی وہم نہیں ہوا تھا بلکہ انہوں نے خود معاویہ کی زبان سے یہ الفاظ سنے تھے ”أَتَرَاهَا مُصِيبَةً؟“ امام ابو داؤد نے عند اللفظ معاویہ کی جگہ پر لفظ ”رَجُلٌ“ لگا دیا ہے، مگر دوسرے محدثین نے واضح لکھ دیا ہے کہ اِن الفاظ کا قائل کوئی انسان نہیں بلکہ معاویہ خود تھا، جیسا کہ ہم باحوالہ لکھ چکے ہیں، لہذا مجلس معاویہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اپنے کانوں سے سننے والے حاضرین وہم کا شکار نہیں ہوئے بلکہ شیخ ابن رسلان ہی حدیث کے دوسرے مصادر کی طرف رجوع نہ کرنے کی وجہ سے وہم کا شکار ہوئے ہیں۔

۲۔ شیخ ابن رسلان کا حدیث ”أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ“ سے دلیل حاصل کرنا بھی وہم پر مبنی ہے، کیونکہ یہ حدیث موضوع ہے۔ اس عاجز نے اپنی کتاب ”شرح أسنى المطالب في مناقب علي بن أبي طالب“ میں اس حدیث کے پانچ طرق نقل کر کے اس کا موضوع ہونا ثابت کیا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کریم کے مطابق جن لوگوں کی اتباع شرط ہے وہ مہاجرین و انصار میں سے سابقون اولون ہیں اور یہی وہ حضرات ہیں جن کی اتباع اُن کے بعد والوں پر لازم ہے، جیسا کہ ہم متعدد مقامات پر لکھ چکے ہیں۔ اسی لیے وہ صحابی جن کی پسند کو آقائے کائنات ﷺ نے اپنی پسند کا درجہ دیا تھا، فرماتے تھے:

مَنْ كَانَ مُسْتَنًا فَلَيْسَتْ بِمَنْ قَدْ مَاتَ ، فَإِنَّ الْحَيَّ لَا تُؤْمِنُ عَلَيْهِ
الْفِتْنَةُ ، أُولَئِكَ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ ﷺ ، كَانُوا أَفْضَلَ هَذِهِ الْأُمَّةِ ، أَبْرَئَهَا

قُلُوبَنَا، وَأَعَمَّقَهَا عِلْمًا، وَأَقْلَلَهَا تَكْلَفًا، اخْتَارَهُمُ اللَّهُ لِصُحْبَةِ نَبِيِّهِ ﷺ، وَإِقَامَةِ دِينِهِ، فَأَعْرِفُوا لَهُمْ فَضْلَهُمْ، وَاتَّبِعُوهُمْ فِي أَلْفِهِمْ، وَتَمَسَّكُوا مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ أَخْلَاقِهِمْ وَدِينِهِمْ، فَإِنَّهُمْ كَانُوا عَلَى الْهُدَى الْمُسْتَقِيمِ.

”جو شخص سنت اپنانا چاہتا ہو تو وہ اُن لوگوں کی سنت اپنائے جو وفات پا چکے ہیں، کیونکہ زندہ لوگ فتنے سے محفوظ نہیں ہیں، وہ لوگ سیدنا محمد ﷺ کے صحابہ تھے، اس امت کے افضل حضرات تھے، قلبی طور پر پوری امت سے بڑھ کر نیک، علمی طور پر پوری امت سے زیادہ عمیق اور تکلف سے بہت دور تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نبی ﷺ کی صحبت اور اپنے دین کے قیام کے لیے منتخب فرمایا تھا، تم اُن کی فضیلت کو پیچو، اُن کے نقش قدم کی پیروی کرو اور حتی المقدور اُن کی عادات کو اپناؤ! بلاشبہ وہ ہدایت مستقیمہ پر فائز تھے۔“

(النصيحة للراعي والرعية لأبي الخير التبريزي ص ۲۰؛ حلية الأولياء ج ۱ ص ۳۰۵؛ شرح السنة ج ۱ ص ۲۱۴؛ جامع بيان العلم لابن عبد البر ج ۲ ص ۹۴۷؛ مختصر الحجة على تارك المحجة، لأبي الفتح نصر المقدسي ص ۱۵۷، ۱۵۸؛ شرح العقيدة الطحاوية لابن أبي العز الحنفی ص ۵۴۶؛ تحفة الأخیار للكنوي ص ۶۷)

خود اُم الانبیاء والمرسلین ﷺ نے متاخرین کے مقابلہ میں سابقین کو ”اصحابی“ (میرے صحابہ) فرمایا ہے، جیسا کہ صحیح مسلم میں خالد بن ولید کے مقابلہ میں سیدنا عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کو اپنا صحابی فرمایا ہے، جب خالد بن ولید جو معاویہ بن ابی سفیان سے تقریباً دو سال قبل مسلمان ہوئے تھے حضرت عبدالرحمان کے مقابلہ میں خود حضور اکرم ﷺ کے روبرو ”اصحابی“ کے خطاب سے باہر تھے تو پھر اُن سے دو سال بعد کربلاء خیرہ اسلام میں داخل ہونے والے طلقاء کیونکر اس فضیلت کے مستحق ہو سکتے ہیں؟

خلاصہ یہ ہے کہ شیخ ابن رسلان شافعی کا مطلقاً تمام صحابہ کے فضائل میں بعض طلقاء کو شامل کرنا اور پھر انہیں باعث ہدایت و نور قرار دینا قرآن و سنت اور قدیم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فہم کے سراسر خلاف ہے۔

۳۔ ثانی یہ کہ شیخ ابن رسلان شافعی نے بالخصوص شان معاویہ بن ابی سفیان میں جو حدیث ہائیں الفاظ پیش کی ہے ”اللَّهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مَهْدِيًا“ وہ روایت اور روایت دونوں لحاظ سے موضوع دباطل ہے۔ اس موضوع روایت کی مکمل و مفصل تردید کے لیے راقم الحروف کی کتاب ”الاحادیث الموضوعه فی فضائل معاویہ“ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

۴۔ رابعاً یہ کہ اگر سامعین کو وہم ہوا تھا کہ معاویہ بن ابی سفیان کے دل میں امام حسن کے بارے میں بغض ہے، اور حقیقت یہ نہیں تھی تو پھر معاویہ بن ابی سفیان نے اُس شخص کو ٹوکا کیوں نہ جس نے امام حسن مجتبیٰ (علیہ السلام) کو بھری مجلس میں ”جُمُرَة“ (انگارہ) کہا تھا؟ کیا تاریخ و حدیث کی کسی کتاب سے معاویہ کا اُس بد بخت اسدی شخص کو روکنا ٹوکنا یا ڈانٹنا ثابت کیا جاسکتا ہے؟ قطعاً نہیں، کیونکہ اُس بد بخت نے تو معاویہ کی خوشنودی کے لیے ”جُمُرَة“ (انگارہ) کے الفاظ کہے تھے، یہی وجہ ہے کہ ابن صحر اُس پر ناراض نہیں ہوئے تھے بلکہ اُنہیں اُس کو پیسے دیے تھے۔

اہل بیت سے بغض تو سلطان خوش

اسدی نے جو دربار معاویہ میں سیدنا امام حسن مجتبیٰ (علیہ السلام) کو ”جُمُرَة“ (انگارہ) کہا تو کیوں کہا؟ اس کی صحیح توجیہ اُن شارحین سے مل سکتی ہے جو اس مقام پر تکلف و تصنع سے محفوظ رہے ہوں، لہذا آئیے! شیخ ابن رسلان شافعی کی تکلف پر مبنی تشریح کے بعد اس جملہ کی بلا تکلف تشریح بھی ملاحظہ فرمائیے! علامہ ابوالحسن محمد بن عبدالحادی متوفی ۱۱۳۸ھ المعروف سندھی کبیر لکھتے ہیں:

فَقَالَ الْأَسَدِيُّ: أَيُّ طَلَبًا لِرِضَاءِ مُعَاوِيَةَ وَتَقَرُّبًا إِلَيْهِ.

”تو اسدی نے معاویہ کی خوشنودی اور قرب حاصل کرنے کے لیے امام پاک کو انگارہ کہا۔“

(فتح الودود شرح سنن أبي داود ج ۴ ص ۱۴۱، ۱۴۵)

مولانا خلیل احمد سہارنپوری لکھتے ہیں:

فَقَالَ الْأَسَدِيُّ: طَلَبًا لِرِضَاءِ مُعَاوِيَةَ وَتَقَرُّبًا إِلَيْهِ (جُمُرَة أُلْفَاَهَا اللَّهُ)

تَعَالَى، أَيُّ أَحْمَدَهَا وَأَزَالَ شَرَّ شُرُورِهَا وَفَسَنَهَا.

(17.

”امام حسن علیہ السلام کے انتقال پر معاویہ کا یہ کہنا کہ یہ مصیبت نہیں ہے، مبنی تھا اوپر تعصب کے علی اور ابی ولید علی سے، راضی ہو اللہ اپنے رسول کے اہل بیت سے اور ہمارا

حشران کے ساتھ کرے۔ آمین۔“

(سنن ابی داود مترجم ج ۳ ص ۱۹۷)

علامہ شمس الحق عظیم آبادی لکھتے ہیں:

وَالْعَجَبُ كُلُّ الْعَجَبِ مِنْ مُعَاوِيَةَ فَإِنَّهُ مَا عَرَفَ قَدْرَ أَهْلِ الْبَيْتِ
حَتَّى قَالَ مَا قَالَ ، فَإِنَّ مَوْتَ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ مِنْ أَعْظَمِ
الْمَصَائِبِ ، وَجَزَى اللَّهُ الْمَقْدَامَ وَرَضِيَ عَنْهُ فَإِنَّهُ مَا سَكَتَ عَنْ تَكْلِيمِ
الْحَقِّ حَتَّى أَظْهَرَ وَهَكَذَا شَأْنُ الْمُؤْمِنِ الْكَامِلِ الْمُخْلِصِ .

”معاویہ پر انتہائی تعجب ہے، پس وہ اہل بیت کی شان نہ پہچان سکا حتیٰ کہ اس
نے وہ کہا جو کہا۔ بیشک سیدنا حسن بن علیؑ کی وفات بڑی مصیبت ہے، اللہ تعالیٰ
حضرت مقدم علیؑ کو جزائے خیر عطا فرمائے، بلاشبہ وہ حق کے اظہار سے خاموش نہ رہ
سکے حتیٰ کہ اُسے ظاہر کر کے رہے، اور یہی کامل قلع مومن کی شان ہوتی ہے۔“

(عون المعبود فی مجلد واحد ص ۱۸۸ و ط: ج ۱۱ ص ۱۹۱)

شہادتِ حسن مجتبیٰ کو مصیبت نہ سمجھنا، اُس پر خوش ہونا اور امام پاک علیہ السلام کو انگارہ کہنے پر خاموش رہنا
یہ سب کچھ اُس کدورت کو ظاہر کر رہا ہے جس کو صحیحین میں لفظ ”ذَخْن“ سے بیان کیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ امام پاک معاویہ کو دینی لحاظ سے نا اہل اور ناپسندیدہ سمجھتے تھے جبکہ معاویہ امام پاک
کو اپنے اور اپنے خاندان کے اقتدار کے لیے مضر ہونے کی وجہ سے ناپسندیدہ سمجھتے تھے، اور یہی وہ ”ذَخْن“
ہے جو بخاری، مسلم، سنن ابی داود اور مسند احمد وغیرہ میں بیان کیا گیا ہے۔ سوجب صلح کے بعد ”ذَخْن“
(کینہ و کدورت) کا یہ عالم تھا تو پھر ہمارے بعض اکابر کا اس صلح کو معاویہ کی اہلیت و صلاحیت کی دلیل سمجھنا
کیونکر درست ہو سکتا ہے؟ ہمارا حسن ظن یہ ہے کہ ہمارے جن بعض اکابر نے صلح امام حسن علیہ السلام کو معاویہ کی
اہلیت کی دلیل تصور کر لیا ہے انہیں صحاح کی یہ احادیث متحضر نہیں ہوں گی، ورنہ اُن سے یہ تصور نہیں کیا جا
سکتا کہ وہ اُس شخص کا دفاع کریں جس نے امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو زہر سے اچانک شہید کیے جانے کو مصیبت

نہ سمجھا، جس نے اپنی مجلس میں امام حسن کو انگارہ کہنے والے بد بخت کو ٹوکا اور نہ ہی اُسے سزا دی بلکہ اُنہیں اُسے پیسے دیے۔ چونکہ ہمارے بعض اکابر فقہ، عقائد، علم کلام اور مسلسل رد و قدح میں مشغولیت کی وجہ سے تفسیر و حدیث کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے سکے تھے اسی لیے اُن کی توجہ مذکورہ بابا احادیث کی طرف نہیں گئی ہوگی۔ شاید علامہ عبدالحی بن فخر الدین حسنی لکھنوی متوفی ۱۳۳۱ھ نے اُن کی ایسی ہی مشغولیات کی وجہ سے لکھا ہوگا کہ:

قَلِيلُ الْبَضَاعَةِ فِي الْحَدِيثِ وَالْتَفْسِيرِ.
”وہ حدیث و تفسیر میں قلیل پونجی رکھتے تھے۔“

(الإعلام بمن في تاريخ الهند من الأعلام ج ۸ ص ۱۱۸۲)
ہم علامہ لکھنوی کی بات کا برا نہیں مناتے، کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ انسان جب کسی ایک طرف زیادہ منہمک ہو جاتا ہے تو دوسری طرف اُس سے رہ جاتی ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث و تفسیر پر کوئی تصنیف نہیں ہے، لہذا علامہ لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کا تمبر حقیقت پر مبنی ہے۔

حدیثِ مقدمہ کی روشنی میں چند سوالات

مذکورہ بالا حدیث میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ معاویہ بن ابی سفیان نے سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی اچانک شہادت کو مصیبت نہیں سمجھا تھا اور جس صحابی نے شہادت کی اُس خبر کو مصیبت سمجھ کر ”إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ پڑھا تھا اُس پر بھی تعجب کیا تھا اور کہا تھا کہ یہ کوئی مصیبت ہے کہ تم نے ”إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ پڑھ دیا ہے؟ اور جس بد بخت نے امام پاک کو انگارہ کہا تھا اُسے ڈانٹنے کی بجائے اُلٹا پیسے دیے تھے۔ اس پر ہم جملہ اہل اسلام سے بالعموم اور وکلاء سلطان سے بالخصوص سوال کرتے ہیں کہ معاویہ بن ابی سفیان کے ان الفاظ و انداز کا سبب کیا تھا؟ آیا یہ امام پاک سے محبت کی وجہ سے تھا یا اُن سے بغض و کینہ کی وجہ سے؟ بعض لوگوں نے اہل اسلام کی اصلاح کے لیے ایک کتاب لکھی ہے، جس کا نام اُنہوں نے ”بغض و کینہ“ رکھا ہے۔ پہلے ہم اُس کتاب سے چند اقتباسات نقل کرتے ہیں پھر سوال کریں گے کہ اہل انصاف اس سلسلے میں کیا فرماتے ہیں۔ وہ ایک مقام پر کینہ کی تعریف میں لکھتے ہیں:

”دل میں دشمنی کو روکے رکھنا اور موقع پاتے ہی اس کا اظہار کرنا کینہ کہلاتا ہے۔

(لسان العرب، ۱/۸۸۸) حجة الاسلام حضرت سیدنا امام محمد بن محمد غزالی علیہ رحمۃ اللہ الوالی نے احیاء العلوم میں کہنے کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: الْحَقُّ أَنْ يُلْزِمَ قَلْبَهُ اسْتِثْقَالَهُ وَالْبُغْضُ لَهُ وَالنِّفَارَ عَنْهُ وَأَنْ يَلْزُمَ ذَلِكَ وَيَتَّقَىٰ، یعنی: کینہ یہ ہے کہ انسان اپنے دل میں کسی کو بوجھ جانے، اُس سے دشمنی و بغض رکھے، نفرت کرے اور یہ کیفیت ہمیشہ باقی رہے۔ (احیاء العلوم، کتاب ذم الغضب والحقد والحسد، ۳/۲۲۳)۔

(بغض و کینہ، دعوتِ اسلامی، شعبہ اصلاحی کتب، ص ۵)

اس تعریف کے مکمل الفاظ خصوصاً اس جملہ ”دل میں دشمنی کو روکے رکھنا اور موقع پاتے ہی اس کا اظہار کرنا کینہ کہلاتا ہے“ میں بار بار غور فرما کر بتلائیے کہ شہادتِ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام پر زبانِ معاویہ کے ذریعے اُن کے اندر سے جو الفاظ باہر آئے تھے، آیا وہ امام پاک سے محبت کی علامت ہیں یا کینہ کی؟ دو میں سے کوئی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے، تیسری نہیں، کیونکہ بعض لوگوں کی اسی کتاب میں آگے یہ بھی لکھا ہوا ہے:

”محبت کہنے کی ضد (یعنی الٹ) ہے۔“

(بغض و کینہ، دعوتِ اسلامی، شعبہ اصلاحی کتب، ص ۴۸)

نیز اُن لوگوں کی کتاب میں یہ بھی لکھا ہوا ہے:

”کہنے سے آٹھ ہلاکت خیز چیزیں جنم لیتی ہیں: اُن میں سے ایک یہ ہے کہ کینہ پرور حسد کرے گا یعنی کسی کے غم سے شاد ہوگا اور اُس کی خوشی سے غمگین۔ دوسرا یہ کہ شامت کرے گا یعنی کسی کو کوئی مصیبت پہنچے گی تو خوشی کا اظہار کرے گا۔“

(بغض و کینہ، دعوتِ اسلامی، شعبہ اصلاحی کتب، ص ۱۴)

اگر حدیثِ مقدم بن معدی کرب علیہ السلام میں معاویہ کی زبان پر جاری شدہ الفاظ اور امام پاک کو ”جَمْرَةٌ“ (انگارہ) کہنے پر خاموش رہنا محبت کے سبب سے تھا تو عقلاً اور نقلاً ثابت کیجئے، ورنہ محبت کی ضد

کینہ ہے اور اسلامی بھائیوں نے کینے کا حکم یہ لکھا ہے:

”مسلمان سے بلا وجہ شرعی کینہ و بغض رکھنا حرام ہے۔ (فتاویٰ رضویہ ۶/ ۵۲۶) یعنی کسی نے ہم پر نہ تو ظلم کیا اور نہ ہی ہماری جان و مال وغیرہ میں کوئی حق تلفی کی پھر بھی ہم اُس کے لیے دل میں کینہ رکھیں تو یہ ناجائز و حرام اور جہنم میں لے جانے والا کام ہے۔“

(بغض و کینہ، دعوتِ اسلامی، شعبہ اصلاحی کتب، ص ۵)

نیز ان حضرات کی کتاب میں یہ حدیث نبوی ﷺ بھی مرقوم ہے:

”إِنَّ النَّفْسَ وَالْحَقْدَ فِي النَّارِ لَا يَجْتَمِعَانِ فِي قَلْبِ مُسْلِمٍ بِشَكِّ
چغل خوری اور کینہ پروری جہنم میں ہیں، یہ دونوں کسی مسلمان کے دل میں جمع نہیں ہو
سکتے۔“

(بغض و کینہ، دعوتِ اسلامی، شعبہ اصلاحی کتب، ص ۸)

یہ اور اس کے علاوہ کتاب ”بغض و کینہ“ میں نبوی تحذیرات و وعیدات پر بہت سی احادیث ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ احادیث مطلقاً ہر مسلمان کے لیے برابر ہیں یا مسلمانوں کے بعض طبقات ان سے مستثنیٰ بھی ہیں؟ اگر کوئی طبقہ مستثنیٰ ہو تو دلائل کے ساتھ واضح فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔ اگر بغض و کینہ کی یہ وعیدات مطلق ہوں یعنی کسی بھی مسلمان کے بارے میں کوئی شخص اپنے دل میں بغض و کینہ رکھے تو اُس کے لیے یہی سزا ہے تو پھر یہ بھی بتا دیجئے کہ جو شخص اہل بیت کرام علیہم السلام کے ساتھ بغض و کینہ رکھے تو اُس کے لیے کیا سزا ہوگی؟ لیجئے ایہ بھی اُن حضرات ہی کی کتاب سے پیش کیے دیتا ہوں:

”حضرت سیدنا حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمان عبرت نشان ہے: ہم سے

بغض مت رکھنا کہ رسول پاک، صاحبِ لولاک، سیاحِ افلاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لَا يُبْغِضُنَا وَلَا يَحْسُدُنَا إِلَّا ذِيْنْدَعٍ الْحَوْضِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِسَبَاطٍ مِّنْ نَّارٍ جو شخص ہم سے بغض یا حسد کرے گا، اسے قیامت کے دن حوضِ کوثر

سے آگ کے چابکوں کے ذریعے دور کیا جائے گا۔ (المعجم الاوسط، ۲/۳۳،

الحديث ۲۴۰۵)

ایک طویل حدیث پاک میں یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص بیت اللہ شریف کے ایک کونے اور مقام ابراہیم کے درمیان جائے اور نماز پڑھے اور روزے رکھے اور پھر اہل بیت کی دشمنی پر مہر جائے تو وہ جہنم میں جائے گا۔

(بغض و کینہ، دعوتِ اسلامی، شعبہ اصلاحی کتب، ص ۲۴)

فی الجملہ یہ کہ حدیث مقدم بن معدیکرب رحمہ اللہ میں شہادتِ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو معاویہ کا مصیبت نہ سمجھنا اور اُن کی مجلس میں امام پاک کو ”جُمُورَہ“ (انگاہ) کہنے پر اُن کاٹس سے مس نہ ہونا محبت کی وجہ سے تھا تو ثابت فرمائیے، اور اگر بغض و کینہ کی وجہ سے تھا تو پھر انہیں اُن تمام وعیدات و تحذیرات سے مستثنیٰ ثابت فرمائیے جو زبانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہوئیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ لوگ اس مسئلہ کو ضرور حل فرمائیں گے جن کا یہ مشہور نعرہ ہے:

”مجھے اپنی اور ساری دنیا کے لوگوں کی اصلاح کی کوشش کرنی ہے۔“

(بغض و کینہ، دعوتِ اسلامی، شعبہ اصلاحی کتب، ص ۴)

اگر اس مسئلہ کو کسی کنارے نہ لگایا گیا تو اہل اسلام نے اُس نبوی پیش گوئی کا مصداق کسی نہ کسی کو تو سمجھنا ہوگا جو ہم اس سے قبل متعدد حوالہ جات کے ساتھ نقل کر چکے ہیں کہ آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی علیہ السلام کو پہلے ہی فرما دیا تھا:

”تمہارے بارے میں قوموں کے سینوں میں کہنے ہیں جن کو وہ میرے بعد ہی

ظاہر کریں گے۔ سیدنا علی علیہ السلام فرماتے ہیں: میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے دین

کی سلامتی میں؟ فرمایا: تمہارے دین کی سلامتی میں۔“

(مسند ابی بعلیٰ (فی مسند علی) ج ۱ ص ۴۲۶، ۴۲۷، حدیث ۵۶۵)

اور اس مصداق کی تعیین میں اسلامی بھائیوں کی کتاب میں درج شدہ وہ حدیث بھی مد (مددگار)

ثابت ہوگی جو یوں ہے:

”حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی گئی کہ لوگوں میں سے کون افضل ہے؟ فرمایا: ہر سلامت دل والا، سچی زبان والا۔ لوگوں نے عرض کی: سچی زبان والے کو تو ہم جانتے ہیں، یہ سلامت دل والا کیا ہے؟ فرمایا: **هُوَ النَّقِيُّ النَّقِيُّ لَا إِمَّ فِيهِ وَلَا بَغْيَ وَلَا غِلَّ وَلَا حَسَدَ** یعنی وہ ایسا ستھرا ہے جس پر نہ گناہ ہو، نہ بغاوت، نہ کینہ اور نہ حسد۔ مسنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب الورع، ۴/۴۷۸، الحدیث (۴۲۱۶)۔“

(بغض و کینہ، دعوتِ اسلامی، شعبہ اصلاحی کتب، ص ۳۴)

کینہ و رکام صدق معین کرنے میں اہل اسلام کی مدد کی اور لفظ نے نہ بھی کی تو لفظ بغاوت سے تو وہ ضرور کسی نتیجے پر پہنچ جائیں گے۔ علاوہ ازیں بعض لوگ درج ذیل تصریحات اہل سنت سے بھی کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔ امام ابوالعباس قرطبی اور امام منادی رحمۃ اللہ علیہما حدیث الثقلین کی تشریح میں اہل بیت کرام علیہم السلام کے ساتھ محبت کی تاکید و فرضیت کو بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وَمَعَ ذَلِكَ لِقَابِلَ بَنُو أُمِّيَّةٍ عَظِيمَ هَلِةِ الْحَقُوقِ بِالْمُخَالَفَةِ وَالْعُقُوقِ ، فَسَقُّوْا مِنْ أَهْلِ الْبَيْتِ دِمَاءَهُمْ وَسَبُّوا نِسَاءَهُمْ وَأَسْرَوْا صِبَاغَهُمْ وَخَرَبُوا دِيَارَهُمْ وَجَحَدُوا شَرَفَهُمْ وَفَضَّلَهُمْ رَأْسَبَاخُوا سَبَّهُمْ وَلَعَنَهُمْ ، فَخَالَفُوا الْمُصْطَفَى صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ فِي وَصِيَّتِهِ وَقَاتَلُوهُ بِنَقِيضِ مَقْصُودِهِ وَأُمْنِيَّتِهِ ، فَوَاحَجَلَهُمْ إِذَا وَقَفُوا بَيْنَ يَدَيْهِ ، وَيَا فَضِيحَتَهُمْ يَوْمَ يُغْرَضُونَ عَلَيْهِ .

”اس فرمان کے باوجود بنو امیہ نے مقابلہ کیا، ان کے عظیم حقوق کے برعکس چلے اور نافرمانی کی۔ پس انہوں نے اہل بیت کرام علیہم السلام کا خون بہایا، ان کی خواتین اور بچوں کو قید کیا، ان کے گھروں کو برباد کیا، ان کے شرف و فضیلت کا انکار کیا اور ان

پرست و شتم اور لعنت کو مباح کیا۔ سو انہوں نے مصطفیٰ ﷺ کی وصیت کی مخالفت کی اور آپ کے مقصود اور آرزو کے خلاف کیا۔ پس وہ کس قدر خجالت کا سامنا کریں گے جب آپ ﷺ کی بارگاہ میں کھڑے کیے جائیں گے اور کتنا رسوا ہوں گے جب آقا ﷺ کے سامنے پیش کیے جائیں گے۔“

(المفہم لما اشکل من تلخیص کتاب مسلم: کتاب النبوات، باب فضائل اہل البیت ﷺ ج ۶ ص ۴۰۴؛ فیض القدیر شرح الجامع الصغیر ج ۳ ص ۱۵ حدیث ۲۶۳۱)

ناصییت کہاں سے چلی؟

مذکورہ بالا عبارت میں مذکور آٹھ مظالم و فسادات کا مرتکب ان دونوں ائمہ اہل سنت نے بنو امیہ کو ٹھہرایا ہے۔ سو جان لیجئے کہ جب گھرا کسی گاؤں اور قبیلے تک پہنچ جائے تو پھر دانا لوگ خاص گھرا کا سراغ بھی لگالیا کرتے ہیں، اور مجھے خدشہ ہے کہ اگر کوئی شخص ”فتح الباری“ کے درج ذیل مقام سے آگاہ ہو گیا تو وہ خاص گھر تک بھی پہنچ جائے گا اور اُسے معلوم ہو جائے گا کہ ناصییت کہاں سے چلی۔ حافظ رحمہ اللہ بعض متقدمین سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَوَقَعَ فِي "شرح الوجيز للرافعي" عِنْدَ ذِكْرِ الْخَوَارِجِ قَالَ: هُمْ فِرْقَةٌ مِنَ الْمُبْتَدِعَةِ خَرَجُوا عَلَى عَلِيٍّ حَتَّى اغْتَقَلُوا أَنَّهُ يَعْرِفُ قَتْلَةَ عُثْمَانَ وَيَقْدِرُ عَلَيْهِمْ وَلَا يَقْتَصُّ مِنْهُمْ لِرِضَاهُ بِقَتْلِهِ وَمَوَاطِنِهِ إِيَّاهُمْ ، وَيَعْتَقِدُونَ أَنَّ مَنْ اتَى كَبِيرَةً فَقَدْ كَفَرَ، وَاسْتَحَقَّ الْخُلُودَ فِي النَّارِ، وَيَطْعَنُونَ لِذَلِكَ إِلَى الْأُنْتَمَاءِ. انتهى.

وَلَيْسَ الْوَصْفُ الْأَوَّلُ فِي كَلَامِهِ وَصَفَ الْخَوَارِجَ الْمُبْتَدِعَةَ وَإِنَّمَا هُوَ وَصَفَ النَّوَاصِبِ أَتْبَاعَ مُعَاوِيَةَ بِصَفَيْنِ ، وَأَمَّا الْخَوَارِجُ فَمِنْ مُعْتَقِدِهِمْ تَكْفِيرُ عُثْمَانَ وَاللَّهُ قَتِيلٌ بِحَقِّهِ ، وَلَمْ يَزَالُوا مَعَ عَلِيٍّ حَتَّى رَفَعَ التَّحْكِيمَ بِصَفَيْنِ فَأَنْكَرُوا التَّحْكِيمَ وَخَرَجُوا عَلَى عَلِيٍّ وَكَفَرُوهُ.

”رافعی کی ”شرح الوجیز“ میں خوارج کے ذکر میں مذکور ہے، انہوں نے کہا: وہ ایک بدعتی فرقہ ہے جنہوں نے سیدنا علیؑ پر خروج کیا بایں وجہ کہ انہوں نے سمجھا کہ وہ حضرت عثمانؓ کے قاتلین کو جانتے ہیں، اُن پر قدرت رکھتے ہیں اور اُن سے قصاص نہیں لیتے، ان کی اُن کے قتل میں مرضی شامل ہے کیونکہ انہوں نے اُن لوگوں کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے، اور وہ خوارج یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جو شخص گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا تو وہ کافر ہو گیا اور ہمیشہ جہنم میں رہنے کا سزاوار ہو گیا، اور اس وجہ سے وہ ائمہ پر بھی طعن کرتے ہیں۔ رافعی کا کلام پورا ہو گیا۔

رافعی کے کلام میں جو پہلی علامت مذکور ہے وہ بدعتی خوارج کی نہیں، بلکہ وہ اُن نواصب کی علامت ہے جو حُجُبِ صفین میں معاویہ کے پیروکار تھے۔ باقی رہے خوارج تو اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ حضرت عثمانؓ کی تکفیر کرتے تھے اور اُن کے قتل کو جائز سمجھتے تھے، وہ مسلسل سیدنا علیؑ کے ساتھ رہے، یہاں تک کہ صفین میں حکیم واقع ہوئی تو انہوں نے حکیم کا انکار کر دیا اور سیدنا علیؑ کے خلاف خروج کیا اور اُن کی تکفیر کی۔“

(فتح الباری: کتاب التوحید، باب قراءة الفاجر والمنافق، حدیث ۷۵۶۲، ج ۱۷ ص ۶۲۶)
اس عبارت میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے متبعین معاویہ کو نواصب قرار دیا ہے، اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ ظاہر ہے کہ متبوع ناصبی نہ ہو تو متبعین ناصبی نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن کثیر نے تمام ملوک بنو امیہ کو ناصبی تسلیم کیا ہے، ماسوا عمر بن عبدالعزیز اور معاویہ بن یزید کے۔ وہ لکھتے ہیں:

وَهَكَذَا خُلَفَاءُ بَنِي أُمَيَّةَ	عَدَّتْهُمْ كَعِدَّةِ الرِّفَضِيَّةِ
وَلَكِنَّ الْمُدَّةَ كَانَتْ نَاقِصَةً	عَنْ مِائَةِ مِنَ السِّنِّ خَالِصَةً
وَكُلُّهُمْ قَدْ كَانَ نَاصِبِيًّا	إِلَّا الْإِمَامَ عُمَرَ الثَّقِيفَا
مُعَاوِيَةَ ثُمَّ ابْنَهُ يَزِيدَ	وَابْنَ ابْنِهِ مُعَاوِيَةَ السُّلَيْمِيَّ

”اور یونہی خلفاء بنی امیہ تھے، اُن کی تعداد ارفضیہ کی طرح تھی، لیکن اُن کی مدت کم تھی،

مکمل سو سال سے بھی گھٹ تھی، وہ سب کے سب ناصبی تھے ماسوا امام مرتضیٰ کے، معاویہ پھر اُس کا بیٹا یزید اور اُس کا پوتا معاویہ سچا۔“

(البدایۃ والنہایۃ بتحقیق محسن الترمذی ج ۱۷ ص ۳۷۵)

اس کلام میں یزید کے بیٹے معاویہ کو ”نَسْبِیْنِہُ“ (سچا) کہہ کر اُسے ناصبیت سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے، لیکن خیال رہے کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر سچا، پارسا، عابد و زاہد آدمی ناصبیت سے پاک ہو، ایسا ہوتا تو تمام خوارج عداوت مرتضیٰ سے پاک ہوتے۔ معاویہ بن یزید کو یہاں سدید کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اُس نے خاص معاملہ میں حق و سچ کا اظہار کیا تھا، اور وہ یہ کہ اُس نے خلافت میں اپنے دادا اور باپ کو غلط قرار دیا تھا اور اُن دونوں کے بارے میں ”فَصَارَ فِی قَبْرِہِ رَہِیْنًا بِذُنُوبِہِ“ کے الفاظ استعمال کیے تھے، جبکہ سیدنا علی اور امام حسین علیہما السلام کو برحق تسلیم کیا تھا، جیسا کہ تردید و انقضاض میں مشہور مصنف علامہ ابن حجر کی نے اپنی کتاب ”الصواعق المحرقة“ کے خاتمہ کے آخری صفحات میں صراحت بیان کیا ہے۔

(الصواعق المحرقة ص ۲۲۴، وط: ص ۶۰۱؛ حیاة الحیوان: خلافة معاویہ بن یزید، ج ۱ ص

(۲۲۲، ۲۲۱)

نیز چونکہ فاضل ناظم نے معاویہ رحمۃ اللہ علیہ بن یزید پلید کو خلفاء میں شمار کیا ہے اسی لیے انہیں سدید کہہ کر ناصبیت سے مستثنیٰ کیا ہے، ورنہ معاویہ بن یزید نے تو خلافت کو پسند ہی نہیں کیا تھا، الا یہ کہ جتنے دن وہ زندہ رہا تھا اُسے خلیفہ تصور کیا گیا تھا اور اُس کی وفات کے بعد ہی کسی اور شخص کو منتخب کیا گیا تھا۔

جس طرح مذکورہ بالا منظوم کلام میں حضرت عمر بن عبدالعزیز اور معاویہ بن یزید کے علاوہ تمام اموی خلفاء کو ناصبی کہا گیا ہے اسی طرح بعض علماء ظاہریہ نے بھی خلافت راشدہ کے بعد والے تمام اموی خلفاء کو ناصبی مانا ہے، ماسوا حضرت عمر بن عبدالعزیز اور یزید بن ولید کے۔ چنانچہ مشہور مصنف اور اموی غلام علامہ ابن حزم ظاہری اندلسی بنو عباس کی خلافت کے تذکرہ میں کہتے ہیں کہ اُن کی خلافت بھی ملک عضو تھی اور کسروی طرز پر عجمی حکومت تھی، البتہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی پر سب و شتم نہیں کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

إِلَّا أَنَّهُمْ لَمْ يُعْلِنُوا بِسَبِّ أَحَدٍ مِنَ الصَّحَابَةِ رِضْوَانُ اللَّهِ عَلَيْهِمْ،

بِخِلَافِ مَا كَانَ بَنُو اُمَيَّةَ يَسْتَعْمِلُونَ مَنْ لَعَنَ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ رَضَوَانِ
اللّٰهُ عَلَيْهِ ، وَلَعَنَ بَنِيهِ الطَّاهِرِينَ مِنْ بَنِي الزُّهْرَاءِ ، وَكُلُّهُمْ كَانَ عَلَى هَذَا
حَاشَا عُمَرَ بْنَ عَبْدِ الْعَزِيزِ وَبَزِيدَ بْنَ الْوَلِيدِ رَحِمَهُمَا اللّٰهُ تَعَالٰی ، فَإِنَّهُمَا
لَمْ يَسْتَجِيزَا ذَلِكَ .

”الایہ کہ انہوں نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم میں سے کسی پر علانیہ سب و شتم
نہیں کیا، بخلاف بنو امیہ کے، وہ گورنری انہیں بتاتے تھے جو سیدنا علی بن ابی طالب
رضوان اللہ علیہ پر لعنت کرتے تھے اور اُن کی اُس ذریت طاہرہ پر لعنت کرتے تھے جو
سیدہ فاطمہ علیہا السلام سے تھی۔ وہ سارے کے سارے اسی طریقے پر گامزن تھے ماسوا
سیدنا عمر بن عبدالعزیز اور بزید بن ولید رحمۃ اللہ علیہما کے، اُن دونوں نے اس کی اجازت
نہیں دی تھی۔“

(مسائل ابن حزم ج ۲ ص ۱۴۶، ۱۴۷)

اگر کوئی کہے کہ اس عبارت میں ابن حزم نے ناہمی تو نہیں کہا تو انہیں کہا جائے کہ جب انہوں نے
دو خلفاء کے علاوہ تمام بنو امیہ کو موٹی علی اور اُن کی اولاد طاہرہ علیہم السلام پر لعنت کرنے والا لکھا ہے تو کیا لعنت
ناصیت (عداوت اہل بیت) کی وجہ سے نہیں ہوتی تو محبت اہل بیت کی وجہ سے ہوتی ہے؟

حیۃ الحیوان کے ترجمہ میں خیانت

حیۃ الحیوان کے اس مقام پر ایک سبب عطار نے ترجمہ میں خیانت کی ہے، مثلاً انہوں نے درج
ذیل جملہ کا ترجمہ یوں کیا ہے:

فَلَمَّا جَاءَهُ الْقَلْبُ الْمَحْتَرَمُ ، وَاخْتَرَمَتْهُ اَيْدِي الْمُنُونِ ، بَقِيَ مَرْتَهَنًا بِعَمَلِهِ ،
فَرِيدًا فِي قَبْرِهِ ، وَوَجَدَ مَا قَلَمَتْ يَدَاهُ ، وَرَأَى مَا ارْتَكَبَهُ وَاعْتَدَاهُ .

”مگر جس وقت ان کے انتقال کا وقت آپہنچا تو موت نے ان کو اپنی آغوش میں لے لیا
تو وہ اپنے اعمال کے ہمراہ اس فانی دنیا سے کوچ کر گئے۔ گور میں تہا دفنائے گئے۔ جو

کچھ بھی وہ کر چکے اس کا پھل ان کو مل گیا۔“

(عطار الجنان ترجمہ حیاۃ الحيوان ج ۱ ص ۲۱۶)

دراصل معاویہ بن یزید نے نام نہاد خلافت کو ناپسندیدہ سمجھتے ہوئے جہاں خود کو اُس سے دور رکھنے کا اظہار کیا تھا وہیں اُس نے اپنے دادا معاویہ اور باپ یزید کی بھی مذمت کی تھی، اور اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے اُس نے جو الفاظ منتخب کیے اُن کا ترجمہ وہ نہیں بناتا جو سب عطار نے کیا ہے۔ صحیح ترجمہ یہ ہے:

”ہں جب اُس کے پاس حتی تقدیر آ پہنچی اور موت کے ہاتھوں نے اُسے جڑ سے اکھاڑ دیا، وہ اپنے اعمال میں گردی، قبر میں تنہا پڑا ہوا ہے، اُس نے وہ سب کچھ پا لیا جو اُس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا تھا اور اُس نے وہ دیکھ لیا جس کا اُس نے ارتکاب کیا تھا اور زیادتی کی تھی۔“

(حیاۃ الحيوان للدمیری ج ۱ ص ۲۲۲)

اہل علم کو چاہیے کہ وہ اصل عربی الفاظ کو مد نظر رکھتے ہوئے خود ہی اس مقام میں غور فرمائیں اُن پر خیانت یا عدم خیانت واضح ہو جائے گی۔ یہاں اگر ایک اور مقام کو بھی سامنے رکھ لیا جائے تو سب عطار کتنا امین ہیں سب واضح ہو جائے گا۔ اُنہوں نے ایک مقام پر درج ذیل جملہ کا ترجمہ یوں کیا ہے:

وَكَانَ مِنْ أَكْثَرِ الْمُؤَلِّينَ عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ بْنُ أَبِي بَكْرٍ.

”اور اُن ساروں سے زیادہ شیطان محمد بن ابی بکر تھے۔“

(عطار الجنان ترجمہ حیاۃ الحيوان ج ۱ ص ۱۹۵)

علماء دیوبند نے اس جملہ کا ترجمہ یوں کیا ہے:

”اِن تمام لوگوں میں سب سے زیادہ فتنہ انگیز محمد بن ابی بکر تھے۔“

(حیاۃ الحيوان ج ۱ ص ۱۸۵، ادارہ اسلامیات، انارکلی، لاہور)

یہ سب عطار لفظ ”مُولِب“ کے ترجمہ میں لفظ ”شیطان“ کہاں سے لے آیا۔ اگر ریب مرتضیٰ سیدنا محمد بن ابی بکر ؓ کو سیدنا عثمان ؓ سے مطالبہ کرنے والوں میں سب سے زیادہ سرگرم مان بھی لیا جائے تو

”انہیں شیطان کیونکر کہا جاسکتا ہے؟ جبکہ اُن کے بارے میں سب عطار چند سطور پہلے یہ بھی لکھ چکا ہے:
 ”یہ خط عثمان کی جانب سے گورنر مصر عبداللہ بن ابی سرح کے لیے ہے جب محمد
 بن ابی بکر فلاں فلاں کے ساتھ آئیں تو پھر اُن کے ہاتھ اور پیروں کو کاٹ کر بھجور کی
 شاخوں سے آویزاں کر دیا جائے۔“

(عطار الجنان ترجمۃ حیاۃ الحیوان ج ۱ ص ۱۹۵)

بتائیے! جس شخص کے بارے میں ایسا خط لکھا جائے اور اُس خط سے قبل اُس نے کسی قسم کے جرم کا
 ارتکاب بھی نہ کیا ہو، اور پھر جب وہ خط پکڑا جائے اور اُس کو وہ شخص خود اپنی آنکھوں سے پڑھ لے تو وہ بے
 قصور شخص بھرے گا نہیں تو اور کیا کرے گا؟ کیا سب عطاروں کے نزدیک مشاجرات صحابہ میں سکوت کا یہی
 مطلب ہے کہ سیدنا ابو بکر ؓ کے فرزند، ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بھائی اور سیدنا علی
 ؓ کے تربیت یافتہ کم سن صحابی کو شیطان کہا جائے؟

خلاصہ یہ ہے کہ اگر قارئین کرام حیاۃ النبی ان کے درج بالا دونوں مقامات میں غور فرمائیں گے تو اُن
 پر واضح ہو جائے گا کہ سب عطار ترجمہ کرنے میں کتنا امین ہے اور یہ بھی روشن ہو جائے گا کہ سب عطار دُم
 کن کے سامنے ہلاتے ہیں اور بھونکتے کن پر ہیں۔

صلح اور پسند میں فرق

معاویہ کی جھوٹی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہوئے بعض مقررین دو اعظمتیں کو بیان
 کرتے ہوئے سنا گیا ہے کہ اہل بیت کرام علیہم السلام کی جن کے ساتھ صلح ہے ہماری بھی اُن کے ساتھ صلح
 ہے اور اہل بیت کی جن کے ساتھ لڑائی ہے ہماری بھی اُن کے ساتھ لڑائی ہے۔ اس سے وہ امام حسن مجتبیٰ ؓ
 کی معاویہ کے ساتھ صلح اور امام حسین ؓ کی یزید کے ساتھ لڑائی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

اس پر پہلی بات تو یہ ہے کہ صلح اور پسند میں فرق ہے۔ بتلائیے! نبی کریم ﷺ نے معاہدہ نامہ لکھ کر
 مشرکین مکہ کے ساتھ محدود مدت تک کے لیے جو صلح فرمائی تھی، کیا اُس کا یہ مطلب لیا جاسکتا ہے کہ اُس
 محدود مدت میں مشرکین آپ کے پسندیدہ ہو گئے تھے؟ دو ملکوں یا دو گروپوں کے درمیان جنگ نہ کرنے پر یا

پہلے سے جاری جنگ کو روکنے پر جو معاہدہ ہوتا ہے، بتائیے اُس کو صلح نامہ کہا جاتا ہے یا محبت نامہ؟ یاد رکھنا چاہیے کہ ہمیشہ اہم معاملات کے بارے میں جو صلح نامہ اور معاہدہ لکھا جاتا ہے اُس کے بعد دلوں میں ایک دوسرے کے بارے میں محبت کے جذبات نہیں ہوتے بلکہ تحفظات اور خدشات باقی ہوتے ہیں۔ مثلاً بخاری شریف میں ہے:

صَلَحَ النَّبِيُّ ﷺ الْمُشْرِكِينَ يَوْمَ الْهُدَيْبِيَّةِ عَلَى ثَلَاثَةِ أَشْيَاءَ.

”نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ کے دن مشرکین کے ساتھ تین شرطوں پر مصالحت فرمائی۔“

(بخاری: کتاب الصلح، باب الصلح مع المشركين، ص ۳۶۱ حدیث ۲۷۰۰)

کیا اس کو یوں کہا جاسکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ کے دن مشرکین کے ساتھ تین شرطوں پر محبت فرمائی تھی؟ صلح اور پسند میں فرق نہ کرنا بہت بڑی حماقت ہے، فسادِ شخص یا فسادِ افراد کے ساتھ نزاع کی صورت بن جائے تو صلح ناگواری کے ساتھ ہوتی ہے جبکہ پسند اور انتخابِ رغبت سے ہوتا ہے، مثلاً یوں تو کہا جاتا ہے کہ آپ کو کون پسند ہے لیکن یوں نہیں کہا جاتا کہ آپ کس کے ساتھ صلح کرنا چاہیں گے؟ کیونکہ صلح تو اُسی کے ساتھ ہی کرنا ہوتی ہے جس کے ساتھ تنازع ہو، تاکہ نقصان سے بچا جاسکے، لہذا صلح اور پسند میں جو فرق ہے اُسے ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

لفظ صلح کی لغوی اور اصطلاحی تعریف

صلح اور پسند میں فرق نہ کرنے والے لوگوں کو چاہیے کہ وہ ذرا صلح کی تعریف میں بھی غور فرمائیں۔
مولانا عبدالحفیظ بلیاوی لکھتے ہیں:

”صُلِحَ (ک ف ن) صُلُوحًا وَصُلُوحًا وَصُلَاحِيَةً، درست ہونا فساد کا زائل ہونا۔“

(مصباح اللغات ص ۴۷۶)

یعنی صلح فساد کی ضد ہے، لفظ صلح کی لغوی اور اصطلاحی تعریف اکٹھے یوں کی گئی ہے:

الصُّلْحُ: بِالضَّمِّ وَتَكُونُ اللَّامُ فِي اللَّفْظَةِ اسْمًا مِنَ الْمُصَالَحَةِ خِلَافَ

الْمُخَاصَمَةِ مَا اخُذَ مِنَ الصِّلَاحِ، وَهُوَ الْإِسْتِقَامَةُ. يُقَالُ صَلَحَ الشَّيْءُ إِذَا

وَالْعَرَضُ مِنْهُ رَفْعُ النِّزَاعِ. وَفِي الشَّرِيعَةِ عَقْدٌ يَرْفَعُ النِّزَاعَ أَيْ يَكُونُ الْمَقْصُودُ
وَالْعَرَضُ مِنْهُ رَفْعُ النِّزَاعِ.

”صلح“ ص کے پیش اور ”ل“ کی جزم سے لغت میں مصالحت کا اسم ہے جو کہ
خاصیت کی ضد ہے۔ یہ صلاح سے ماخوذ ہے اور استقامت کی ایک حالت ہے۔
جب کسی چیز سے فساد اُٹھ جائے تو کہا جاتا ہے: چیز درست ہوگئی، اور شریعت میں
ایسے معاہدہ کو صلح کہتے ہیں جس سے تنازع ختم ہو جائے، یعنی اُس معاہدہ کا مقصد اور
غرض و غایت نزاع کا رفع کرنا ہوتا ہے۔

(موسوعة كشاف اصطلاحات الفنون ج ۲ ص ۱۰۹۵؛ البناء في شرح الهداية للعيني ج ۱۰
ص ۴۳؛ بہار شریعت، تخریج شدہ، ج ۲ (ب) ص ۱۱۳۲، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

کویت حکومت کے زیر اہتمام شائع ہونے والے فقہی انسائیکلو پیڈیا (الموسوعة الفقهية) میں
کتاب وسنت اور اجماع امت سے صلح کے مستحسن ہونے پر کلام کرنے کے بعد قیاس کی روشنی میں بھی بات
کی گئی ہے۔ چنانچہ اُس موسوعہ کے مرتبین علماء کی جماعت لکھتی ہے:

وَأَمَّا الْمَعْقُولُ: فَهُوَ أَنَّ الصُّلْحَ رَافِعٌ لِفَسَادٍ وَاقِعٍ، أَوْ مُتَوَقِّعٍ بَيْنَ
الْمُؤْمِنِينَ، إِذَا اكْتَفَرَ مَا يَكُونُ الصُّلْحُ عِنْدَ النِّزَاعِ، وَالنِّزَاعُ سَبَبُ
الْفَسَادِ، وَالصُّلْحُ يَهْلِكُهُ وَيَرْفَعُهُ، وَلِهَذَا كَانَ مِنْ أَجْلِ الْمُحَاسِنِ.

”عقلی طور پر صلح مؤمنین کے مابین واقع شدہ فساد یا متوقع فساد کو رفع کرنے والی
ہوتی ہے، کیونکہ صلح اکثر نزاع کے وقت ہوتی ہے اور نزاع باعثِ فساد ہوتا ہے اور صلح
اُس کو رفع دفع کر دیتی ہے، اسی لیے اس کا شمار بڑی نیکیوں میں ہوتا ہے۔“

(الموسوعة الفقهية ج ۲۷ ص ۳۲۵، ۳۲۶)

مصلح کون اور مفسد کون؟

ذرا غور فرمائیے کہ تعریف کس چیز کی کی گئی؟ صلح کی۔ صلح کی ضد کیا ہے؟ فساد۔ جب صلح کی ضد فساد

ہے تو پھر امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام اور معاویہ کے مابین جو صلح ہوئی اُس میں کھلے فساد یا چھپے ہوئے فساد کا خدشہ کس جانب سے تھا؟ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ مفسد کون تھا اور صلح کون؟ ظاہر ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ”لَعَلَّ اللّٰهَ اَنْ يُصْلِحَ بِهِ“ (یقیناً اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے صلح کرائے گا) میں ضمیر واحد جس کی شان میں استعمال فرمائی ہے وہی ہستی صلح تھی اور اُن کا مد مقابل مفسد۔

یہاں کسی کو خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ چونکہ یہ تنازع تھا، لہذا فساد کی نسبت دونوں طرف ہو سکتی ہے، لیکن یہ شیطانی خیال ہے، کیونکہ حدیث شریف میں سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی طرف صلح اور اصلاح کی نسبت کی گئی ہے، لہذا صلح کی ضد (فساد) کی نسبت فقط دوسری طرف ہی رہے گی۔ نیز سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی طرف فساد کی نسبت اس لیے بھی نہیں ہو سکتی کہ فساد ”رجس“ ہے اور ”رجس“ کو اُن سے ہمیشہ کے لیے دور کر دیا گیا ہے، پھر اُن کا مبارک نام بھی فساد کی نسبت کو قبول نہیں کرتا، کیونکہ اُن کا نام ”حَسَن“ حکیم الہی سے رکھا گیا تھا، اس لیے وہ اسم با سَمی تھے، اُن کی ذات میں جہاں ح، س اور ن سے مشتق ہونے والے تمام الفاظ ”حَسَن، اِحْسَان، حَسَنَة، مُحْسِن اور حُسْنی“ کی معنوی خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں وہیں وہ اُن خوبیوں کی ضد سے یکسر منزہ اور مبرا بھی تھے۔ وہ سراپا خیر و بھلائی تھے اور ازل سے یہ ہوتا آ رہا ہے کہ ہمیشہ خیر و بھلائی سے شر و فساد ہی لکراتا ہے۔

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام تو اپنے بابا کریم ﷺ کے مشن کی تکمیل کے لیے بغاوت کو کچلنے کی خاطر اسی مسلح لشکر کو لے کر آئے تھے جس کو اُن کے بابا نے تیار کر رکھا تھا، لیکن معاویہ کیوں مسلح لشکر کے ساتھ آیا تھا؟ کیا وہ اب بھی قصاصِ عثمان علیہ السلام کے لیے آیا تھا؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو پھر اس کا ثبوت چاہیے۔ اگر ثبوت کوئی نہیں تو پھر ماننا پڑے گا کہ معاویہ بن ابی سفیان کی ساری تنگ و دو صرف اور صرف دنیا کے لیے تھی۔

جب حقیقت یہ ہے تو پھر یہ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ کہا جاتا ہے امام حسن علیہ السلام نے معاویہ کی اہلیت کے پیش نظر اُس کو اختیار فرمایا تھا؟ ارے میاں! امام پاک نے معاویہ کو اختیار نہیں فرمایا تھا بلکہ صلح کو اختیار فرمایا تھا۔ کیا فساد اور مفسد کو بھی اختیار کیا جاتا ہے؟ صلح میں اصل ہدف فریقین کے جان و مال کا تحفظ

اور اس کا حصول ہوتا ہے، اور ہدف کے حصول کے لیے کبھی کبھی مشکل اور ناخوش گوار مراحل سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ کبھی حالیہ فوائد کے حصول کے لیے اور کبھی مستقبل میں فوائد کے حصول کے لیے اہل قبلہ سے تو کیا کھلے کفار سے بھی صلح و سمجھوتہ کرنا پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ عینی حنفی رحمۃ اللہ علیہ ایک حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں:

قَالَ أَصْحَابُنَا: يَجُوزُ الصَّلْحُ مَعَ الْكُفَّارِ بِمَا لَا يُؤْخِذُ مِنْهُمْ أَوْ يُدْفَعُ إِلَيْهِمْ،
إِذَا كَانَ الصَّلْحُ خَيْرًا فِي حَقِّ الْمُسْلِمِينَ.

”ہمارے ائمہ احناف نے کہا ہے: کفار کے ساتھ صلح کرنا ان سے کچھ مال لے کر یا انہیں کچھ مال دے کر جائز ہے، بشرطیکہ وہ صلح مسلمانوں کے حق میں بہتر ہو۔“

(عمدة القاري ج ۱ ص ۱۸، موط: ۱۴ ص ۲۴)

اوپر جو بحوالہ بخاری مشرکین مکہ کے ساتھ سید العالمین ﷺ کی صلح کا ذکر ہو چکا ہے، کیا یہ سمجھنا درست ہوگا کہ اُس صلح میں آقا نے مشرکین کو اختیار فرمایا تھا؟ ہرگز نہیں، بلکہ اُن کی یکطرفہ شرائط کو قبول کر کے انہیں دفع کیا تھا اور صلح کو اختیار فرمایا تھا۔

فسادی اور فساد کو اختیار کیا جاتا ہے یا دفع؟

صلح کی تعریف میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ اس سے مقصود نزاع اور فساد کو ختم کرنا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ فساد تب ختم ہوتا ہے جب مفسد کو دفع کیا جائے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جب مفسد کو مار کر بھگا دیا جائے تو پھر وہ صلح کیا ہوئی؟ لامحالہ فسادِ شخص کو کچھ دے دلا کر ہی دفع کیا جاتا ہے، لہذا خود ہی فرمائیے کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے کس طرح اپنے مد مقابل مفسد شخص کو دفع کیا تھا؟ فی الجملہ یہ کہ مفسد کو دفع کیا جاتا ہے اور صلح کو اپنایا جاتا ہے، اور صلح کے معاملات کسی گروہ کے سرغنہ شخص کے ساتھ ہی طے کیے جاتے ہیں اور اُن شرائط کو طے کرتے وقت جانبدار کے عوام کا مفاد مد نظر ہوتا ہے۔ چنانچہ جب کسی غیر مسلم سرغنہ سے صلح کے امور طے پا رہے ہوں تو اُس وقت اُس غیر مسلم کی ذات مد نظر نہیں ہوتی بلکہ وہی تو باعث نزاع ہوتا ہے لیکن شرائط صلح پھر بھی اُسی کے ساتھ طے ہوتی ہیں، معاہدہ بھی اُسی کے ساتھ کیا جاتا ہے اور دستخط بھی اُسی کے ہوتے ہیں۔

دیکھئے انہی کریم ﷺ نے حدیبیہ کے موقع پر جن کفار کے ساتھ صلح کی تھی انہیں یہ بات بھی گوارا نہیں تھی کہ لکھا جائے ”هَذَا مَا قَاضَى عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ“ انہوں نے کہا تھا: ”مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ“ کی بجائے ”مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ“ لکھا جائے۔ آقا کریم ﷺ نے فرمایا: جو یہ کہتے ہیں وہی لکھ دو۔ اس کے باوجود آقا کریم ﷺ نے صلح کا معاملہ اُن ہی کے ساتھ طے فرمایا تھا۔ بتائیے! کیوں؟ کیا کفر کے مرغضہ لوگ آپ کا مقصود تھے؟ نہیں بلکہ جانہیں کے عوام کا تحفظ اور مستقبل میں کچھ لوگوں کے ایمان و اسلام کی اُمید آپ کا مقصود تھا۔

امام حسن کو فساد کا امکان نہیں یقین تھا

امام حسن مجتبیٰ (علیہ السلام) نے جس شخص کے فساد کو دفع کرنے کی خاطر اُس کے ساتھ صلح فرمائی تھی، اُس کا مقصد ہونا اُن کے نزدیک مبہم نہیں تھا بلکہ یقینی تھا، کیونکہ وہ اُس کے فساد کا مشاہدہ اپنے بابا کریم سیدنا علی (علیہ السلام) کے دور میں کر چکے تھے۔ اُس شخص نے اُن کے بابا کے خلاف بغاوت و خروج کیا تھا اور بغاوت و خروج امن نہیں فساد ہی ہوتا ہے۔ شاید بعض عاشقانِ طلقاء کے ذہن میں خیال پیدا ہو کہ راقم الحروف بڑا گستاخ ہے کہ ایک صحابی کی طرف فساد کی نسبت کر رہا ہے، تو جناب یہ کوئی گستاخی نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ بغاوت فساد ہی ہوتی ہے اصلاح نہیں۔ اگر یقین نہ آئے تو آئیے میرے علاوہ ایک آدھ اور شخص کے کلام میں ہی غور فرما لیجئے۔ طاعلی قاری لکھتے ہیں:

أَمَّا مُعَاوِيَةُ وَاتِّبَاعُهُ فَمَجُوزٌ يَسْتَبْطَنُ إِلَى الْخَطَا وَالْبَغْيِ وَالْخُرُوجِ
وَالْفَسَادِ ، وَأَمَّا لَعْنُهُمْ فَلَا يَجُوزُ أَصْلًا .

”معاویہ اور ان کے پیروکاروں کی طرف خطا، بغاوت، خروج، اور فساد کی نسبت کرنا تو جائز ہے، مگر اُن پر لعنت کرنا جائز نہیں۔“

(شرح الشفا للقاری ج ۲ ص ۵۵۶)

معلوم ہوا کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ (علیہ السلام) نے اپنے سابقہ تجربہ کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک فساد کی شخص کو اُس کا مطلوب دے کر اُس کو اور اُس کے فساد کو تو دفع کیا تھا البتہ صلح کو اختیار فرمایا تھا۔

صلح کے باوجود مکرو خدع کا خدشہ

صلح کچھ دے دلا کر ہو یا کچھ دیے بغیر ہو، بڑے اور اہم معاملات میں صلح کے باوجود بھی خدشات و تحفظات باقی رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں صلح کی طرف مائل ہونے کا حکم فرمایا ہے وہیں اُس عظیم بذات الصدور علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر تمہیں فریق مخالف کی جانب سے دھوکہ دہی اور منافقت کا خدشہ ہو تو مجھ پر بھروسہ کر کے صلح کر لو۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ.
وَإِنْ يُرِيدُوا أَنْ يَخْدَعُوكَ فَإِنْ حَسِبَكَ اللَّهُ

”اور اگر وہ مائل ہوں صلح کی طرف تو آپ بھی مائل ہو جائیے اُس کی طرف اور بھروسہ کیجئے اللہ تعالیٰ پر، بیشک وہی سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ ارادہ کریں کہ آپ کو دھوکہ دیں تو بیشک کافی ہے آپ کو اللہ تعالیٰ۔“

(الأنفال: ۶۲)

ظاہر ہے کہ جب ایک طرف سے دھوکہ دہی کا امکان باقی ہو تو دوسری طرف بھی خدشات باقی رہتے ہیں۔ خود سوچئے کہ دل میں جب ایسے خدشات باقی ہوں تو جس شخص کے ساتھ صلح کی گئی ہو وہ پسندیدہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ جبکہ زیر بحث صلح کے بارے میں تو صحیح احادیث میں آچکا ہے کہ صلح ہوگی مکرو دلوں میں کدورت باقی رہ جائے گی۔ کیا بیک وقت محبت و کدورت کا اجتماع ممکن ہے؟

جانمین سے کدورت تھی، اب مسلم کیا کرے؟

اگر اجتماع کدورت و محبت ممکن نہیں تو پھر بتائیے کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے صلح کے باوجود جس شخص کو پسندیدہ نہ سمجھا اور وہ شخص بھی امام پاک کو نا پسندیدہ سمجھتا رہا حتیٰ کہ اُن کی شہادت پر خوش ہوا اور اُس کی مجلس میں امام پاک کو انگارا کہا گیا تو وہ اُس سے مس نہ ہوا، تو جانمین کی اس نا پسندیدگی پر ایک مومن کو کیا کرنا چاہیے؟ آیا مومن شخص ”أَصْحَابِي كَالنَّجْوَمِ“ والی روایت کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک صحابی کی اتباع

میں سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے بارے میں اپنے دل میں کدورت رکھے یا متعدد احادیث صحیحہ کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک قطعی العام یافتہ اور قطعی جنتی سردار ہستی کی پیروی میں اُس شخص سے مجتنب رہے جس کے نزدیک امام پاک ناپسندیدہ تھے اور وہ امام پاک کے نزدیک ناپسندیدہ تھا؟ صحابہ، مطلقاً اور دوسرے لوگوں کے لیے شرط ایمان کس کی محبت ہے؟ اس سوال کا جواب دینا اُن لوگوں پر لازم ہے جو صلح امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو بعض مطلقاً کی اہلیت و پسندیدگی کی دلیل سمجھتے ہیں۔

وجوہ صلح

سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام صلح کے لیے کیوں آمادہ ہوئے تھے؟ آیا انہوں نے اپنے لشکر کی کمزوریوں اور بے وفائیوں سے دل برداشتہ ہو کر از خود معاویہ کو صلح کی پیش کش کی تھی، یا صلح کی پیش کش معاویہ نے کی تھی اور امام پاک نے قبول فرمائی تھی؟

اس سلسلے میں اکثر کتب تاریخ یہ بتاتی ہیں کہ امام پاک نے اپنے لوگوں کی زیادتیوں اور کمزوریوں کی وجہ سے از خود صلح کی پیش کش کی تھی، حتیٰ کہ کتب تاریخ میں یہاں تک مرقوم ہے کہ امام پاک علیہ السلام نے معاویہ سے فقط صلح ہی نہیں چاہی تھی بلکہ اپنے لیے امان بھی مانگی تھی۔ مثلاً تاریخ الطبری میں ایک روایت میں پہلے یہ مرقوم ہے کہ سیدنا امام حسن علیہ السلام کوفہ سے مدائن تشریف لائے اور انہوں نے قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کی سرپرستی میں بارہ ہزار افراد پر مشتمل ایک لشکر بھیجا تھا۔ امام پاک مدائن میں تشریف فرما تھے کہ کسی نے پکار کر کہا: قیس بن سعد قتل کر دیے گئے، لہذا بھاگ نکلو۔ لوگوں نے دوڑ لگا دی، امام پاک کا خیمہ اکھاڑ دیا حتیٰ کہ جس چادر پر امام پاک تشریف فرما تھے وہ بھی آپ کے نیچے سے کھینچ لی گئی۔ امام پاک وہاں سے اٹھے اور قصر ابیض میں جا بیٹھے، وہاں یہ کھسر پھسر ہونے لگی کہ امام پاک کو پکڑ کر معاویہ کے سپرد کر دیا جائے اور اُن کے بدلہ میں مال و عزت حاصل کی جائے۔ آگے لکھا ہے:

فَلَمَّا رَأَى الْحَسَنُ علیہ السلام تَفَرُّقَ الْأُمْرِ عَنْهُ بَعَثَ إِلَى مُعَاوِيَةَ يَطْلُبُ
الْصَّلْحَ.

”سیدنا امام حسن علیہ السلام نے جب دیکھا کہ معاملہ اُن کے ہاتھ سے نکل چکا ہے تو

انہوں نے معاویہ کے پاس صلح کے لیے آدمی بھیجا۔

اس سے اگلی روایت میں ایک جملہ یوں آیا ہے:

وَكَتَبَ الْحَسَنُ إِلَى مُعَاوِيَةَ فِي الصُّلْحِ وَطَلَبِ الْأَمَانِ.

”امام حسن نے معاویہ کی طرف صلح کے بارے میں لکھا اور امان طلب کی۔“

(تاریخ الطبری ج ۵ ص ۱۵۹، ۱۶۰، الکامل فی التاریخ ج ۳ ص ۵)

یہ جملے یا تو درست نہیں ہیں یا پھر یہ اُس وقت کے بعض سامعین و حاضرین کے اندازوں پر مبنی ہیں۔ ان جملوں کے نادرست ہونے کے کچھ دلائل تو خود کتب تاریخ میں موجود ہیں اور کچھ کتب حدیث میں، مثلاً بعض کتب تاریخ میں ہے کہ سیدنا علیؑ نے معاویہ کی عہد شکنی کے باعث دوبارہ اُس کی بغاوت کو کچلنے کے لیے جو لشکر تیار کیا تھا اُس کی تعداد چالیس ہزار سے زائد تھی اور وہی لشکر سیدنا امام حسنؑ کی معیت میں تھا۔ علماء تاریخ نے لکھا ہے:

وَبَايَعَهُ أَكْثَرُ مِنْ أَرْبَعِينَ أَلْفًا ، كَانُوا لَقَدْ بَايَعُوا أَبَاهُ عَلَى الْمَوْتِ ،

وَكَانُوا أَطْوَعَ لِلْحَسَنِ وَأَحَبُّ لَهُ.

”چالیس ہزار سے زائد لوگوں نے اُن کی بیعت کی، یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے

اُن کے بابا کریمؑ کے ہاتھ پر موت کی بیعت کی تھی، اور وہ لوگ سیدنا امام حسنؑ

کے زیادہ مطیع اور زیادہ محب تھے۔“

(أسد الغابة ج ۲ ص ۱۸، التبيين في أنساب القرشيين لابن قدامة ص ۱۰۵، مرآة الزمان لسبط

ابن الجوزي ج ۷ ص ۹۰۸، تاریخ الإسلام للذهبي ج ۴ ص ۶)

حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اس لشکر نے مولیٰ علیؑ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، امام حسن جنگ کا

ارادہ نہیں رکھتے تھے لیکن یہ لشکر اُن کی رائے پر غالب آ گیا تھا۔ ابن کثیر اس لشکر کی کثرت کے بارے میں

لکھتے ہیں:

فَاَجْتَمَعُوا اِجْتِمَاعًا عَظِيمًا لَمْ يُسْمَعْ بِمِثْلِهِ.

”انہوں نے ایسا عظیم لشکر جمع کر لیا تھا جس کی مثال نہیں سنی گئی۔“

(البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۳۱، ۱۳۲)

اس عظیم لشکر کی خواہش یہ تھی کہ معاویہ کے ساتھ جنگ کی جائے۔ چنانچہ امام پاک نے اپنے خطبہ میں جب انہیں یہ فرمایا تھا:

”تمہارا کام سننا اور اطاعت کرنا ہے۔ تم اُس سے صلح کرو گے جس سے میں صلح کروں

گا اور اُس سے جنگ کرو گے جس سے میں جنگ کروں گا تو وہ شک میں پڑ گئے تھے

اور آپس میں کہنا شروع کر دیا تھا:

مَا هَذَا لَكُمْ بِصَاحِبٍ ، وَمَا يُرِيدُ الْقِتَالُ .

”یہ تمہارے مطلب کے آدی نہیں اور یہ جنگ کا ارادہ نہیں رکھتے۔“

(تاریخ الطبری ج ۵ ص ۱۶۲، مرآۃ الزمان ج ۷ ص ۸، تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص ۶۴۸)

لہذا اُس دور کے بعض حاضرین کا یا بعد والے لوگوں کا یہ سمجھنا کہ امام پاک علیہ السلام نے اپنے لشکر کی سردمہری کی وجہ سے از خود صلح کی پیش کش فرمائی تھی یا معاویہ سے امان چاہی تھی، سراسر غلط ہے۔ صحیح بات وہ ہے جو کتب حدیث میں مذکور ہے۔ بخاری شریف میں ہے کہ صلح کی پیش کش معاویہ کی طرف سے کی گئی تھی جسے امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے شرائط کے ساتھ قبول فرمایا تھا۔ بخاری کی یہ حدیث ہم کتاب کے آغاز میں نقل کر چکے ہیں، جس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ معاویہ کی طرف سے صلح کی یہ پیش کش امام پاک کے لشکر کی کثرت کو مد نظر رکھتے ہوئے کی گئی تھی۔ بعض دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ امام پاک علیہ السلام نے بھی یہ پیش کش کس پرسی کی حالت میں نہیں بلکہ ایسے ماحول میں قبول فرمائی تھی جب لشکر اور گرد و پیش کا معاملہ اُن کے کنٹرول میں تھا۔ چنانچہ درج ذیل سوال و جواب سے یہی حقیقت عیاں ہوتی ہے۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ حضرت جمیر بن نفیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

قُلْتُ لِحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ: إِنَّ النَّاسَ يَقُولُونَ إِنَّكَ تُرِيدُ الْخِلَافَةَ فَقَالَ:

لَا كُنَّا بِنَاجِيَةِ الْقُرْبِ فِي يَدَيَّ ، يُحَارِبُونَ مَنْ حَارَبْتُ وَيُسَالِمُونَ مَنْ

سَأَلْتُ تَرْكُهَا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ تَعَالَى وَحَقْنِ دِمَاءِ أُمَّةٍ مُحَمَّدٍ ﷺ.

”میں نے سیدنا حسن بن علی علیہ السلام سے عرض کیا: لوگ کہتے ہیں کہ آپ خلافت کے خواہاں ہیں۔ فرمایا: عرب کی گروئیں میرے قبضے میں تھیں، میں جس سے جنگ کرتا وہ اُس سے جنگ کرتے اور میں جس سے صلح کرتا وہ اُس سے صلح کرتے۔ میں نے تو اقدار کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور سیدنا محمد ﷺ کی امت کے خون کے تحفظ کی خاطر چھوڑا ہے۔“

(المستدرک، کتاب معرفة الصحابة، ومن فضائل الحسن بن علي بن أبي طالب ﷺ، ج ۳ ص ۱۸۶ حدیث ۴۷۹، حلیۃ الأولیاء، ج ۲ ص ۳۷، سیر اعلام النبلاء، ج ۳ ص ۲۲۴ تاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۳۱۸، المواہب اللدنیہ ج ۳ ص ۵۶۷)

امام حاکم نے اس حدیث کو بخاری اور مسلم کی شرط کے مطابق صحیح قرار دیا ہے اور امام ذہبی نے اُن کی تائید فرمائی ہے۔

سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی فراست

ہر چند کہ امام کا لشکر عظیم تھا اور وہ لشکر چاہتا بھی تھا کہ معاویہ کے خلاف جنگ کی جائے مگر امام پاک دیکھ رہے تھے کہ اُن کے لشکر کے کچھ لوگ تھک چکے تھے اور اُن میں سے بعض کے حوصلے پست بھی ہو گئے تھے اور اُن کے دینی جذبہ میں بھی کچھ کمی آگئی تھی، اور چونکہ اُس وقت اہل اسلام کے ساتھ جنگ کرنے کی صورت میں مالی فوائد کا کوئی تصور نہیں تھا، جبکہ فریق مخالف اپنی فوج کو ہر حال میں نوازتا تھا اور اُن کے ہاں حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی کوئی پروا نہیں کی جاتی تھی، اور لشکر کی پست ہمتی کی صورت حال تو خود سیدنا علی علیہ السلام کی حیات میں بھی پیدا ہو گئی تھی، کیونکہ لشکرِ شام اہل اسلام کا مال بھی اُسی طرح لوٹتا تھا جس طرح اہل کفر کا لوٹا جاتا تھا، اور وہ مسلم خواتین کو اُسی طرح لوٹتیاں بناتے اور انہیں فروخت کرتے تھے جس طرح کفار کی عورتوں کو بنایا جاتا تھا۔ ان وجوہات کی بنا پر شامی فوج ہر لڑائی میں دلچسپی لیتی تھی، جبکہ دوسری جانب ہر ہر قدم کتاب و سنت کے مطابق اٹھانے کی پابندی تھی اس لیے لشکرِ حق کے جذبات میں کچھ کمی آگئی تھی۔ قرآنی

تصریح کے مطابق جہادی جذبہ کی یہ کمی تو خود حضور اکرم ﷺ کی حیات میں بھی بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں آگئی تھی، تفصیل ہماری کتاب ”الاحادیث الموضوعۃ فی فضائل معاویہ“ میں ”شامیوں کی چستی اور عراقیوں کی سستی کا راز“ کے عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔

فی الجملہ یہ کہ امام پاک نے دواہم وجوہ کے پیش نظر جنگ سے اجتناب فرمایا:

۱۔ اپنی فوج کی کمزوری کی وجہ سے مطلوبہ نتیجے کے حصول کا مشکوک ہونا

۲۔ جانہین سے بہت زیادہ خون بہہ جانا

اس کے علاوہ قتال سے مجتنب رہنے کی اور بھی وجوہ ہو سکتی ہیں لیکن اُن وجوہ میں ایسی وجہ قطعاً کوئی نہیں ہے جس کا معاویہ کی اہلیت و صلاحیت سے تعلق ہو۔ امام پاک معاویہ کو اتنا ہی برا سمجھتے تھے جتنا اُس کو اُن کے والد گرامی سیدنا علی رضی اللہ عنہ برا سمجھتے تھے اور انہیں اپنے بابا کریم رضی اللہ عنہ کے اقدام کی صحت پر کسی قسم کا قطعاً کوئی شک نہیں تھا۔ اس کی تفصیل درج ذیل عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

امام حسن مجتبیٰ اور مولا مرتضیٰ کی یقینی ہم آہنگی

کچھ لوگ تو امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کے صلح قبول کرنے کو معاویہ کی اہلیت و صلاحیت کی دلیل سمجھتے ہیں، جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں جبکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اُن کی صلح کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے نزدیک اُن کے والد کے اقدامات درست نہیں تھے۔ یہ دونوں قسم کے لوگ یا تو حماقت و غوایت کا شکار ہیں یا لہر صمد امثالہ آفرینی سے کام لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کے نزدیک نہ تو اُن کے والد گرامی رضی اللہ عنہ کا موقف کمزور یا نادرست تھا اور نہ ہی اُن کے نزدیک معاویہ قاطبی خلافت تھا، البتہ حالات بدل گئے تھے اور مجبوریاں حائل ہو گئی تھیں۔ ہرچند کہ امام کا لشکر مجتمع نظر آتا تھا اور دشمن اُس سے مرعوب بھی تھا مگر امام پاک لشکر کی اندرونی شکستہ دلی سے بے خبر نہیں تھے۔ اس لیے انہوں نے دشمن کی مرعوبیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُس سے شرائط بھی لکھوائی تھیں اور اپنے لشکر کی اندرونی کمزوری کو مد نظر رکھتے ہوئے دشمن سے صلح بھی کر لی تھی۔ گویا امام پاک کے اس اقدام کو حکمت عملی اور مجبوری دونوں سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ آئیے اذرا امام پاک کے اُس خطاب میں غور کرتے ہیں جو انہوں نے صلح سے قبل اپنے لشکر کو کیا تھا اور اُن کے مورال کو

جانچا تھا۔ امام ابن اثیر جزری، حافظ ابن عساکر اور امام ذہبی لکھتے ہیں:

”ہمیں ابو بکر ابن درید نے خبر دی، وہ کہتے ہیں: حضرت حسن ؑ اپنے والد امیر المؤمنین (علی المرتضیٰ علیہ السلام) کی شہادت کے بعد (خطاب کے لیے) کھڑے ہوئے تو اللہ ﷻ کی حمد کے بعد فرمایا: اللہ کی قسم! ہمیں اہل شام کے متعلق کسی شک یا عداوت نے نہیں روکا بلکہ ہم اہل شام سے سلامتی اور صبر کے ساتھ لڑتے تھے مگر اب عداوت کی وجہ سے سلامتی جاتی رہی اور جزع کے سبب سے صبر چلا گیا۔ چنانچہ جب جنگ صفین کی طرف تم بلائے جاتے تھے تو اُس وقت تمہارا دین تمہاری دنیا سے آگے تھا مگر اب تمہاری دنیا تمہارے دین سے آگے ہے۔ یاد رکھا ہم تو اب بھی تمہارے لیے دیے ہی ہیں جیسے تھے مگر تم ہمارے لیے دیے نہیں رہے جیسے پہلے تھے۔ تمہارے دو طرح کے لوگ مقتول ہو چکے ہیں، کچھ تو صفین میں جن کے لیے تم گریہ کناں ہو اور کچھ نہروان میں مقتول ہوئے جن کا تم انتقام چاہتے ہو۔ جو لوگ باقی رہ گئے ہیں وہ پست ہمت ہیں اور جو رو رہے ہیں وہ پریشان ہیں۔ سنو! معاویہ نے ہمیں ایک پیش کش کی ہے جس میں عزت ہے اور نہ ہی انصاف۔ سو اگر تم موت کے خواہش مند ہو تو ہم معاویہ کی پیش کش کو مسترد کر دیتے ہیں اور معاملہ اللہ ﷻ کے سپرد کرتے ہوئے تلوار کی نوک سے فیصلہ کرتے ہیں اور اگر تم زندگی کے خواہش مند ہو تو ہم معاویہ کی پیش کش کو قبول کر لیتے ہیں، اور جس بات پر تم راضی ہو اسی کو اختیار کر لیتے ہیں۔ پس لوگوں نے ہر طرف سے آواز دی کہ ہم باقی رہنے کے خواہش مند ہیں۔ جب سب نے متفق ہو کر یہی بات کی تو سیدنا امام حسن ؑ نے صلح منظور کر لی۔“

(أسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ ج ۲ ص ۱۸، ۱۹، مترجم اردو ج ۱ ص ۵۶۲، الکامل فی التاریخ

ج ۲ ص ۶۰۵، تاریخ دمشق ج ۱۳ ص ۲۶۸، سیر أعلام النبلاء ج ۳ ص ۲۶۹)

سیدنا امام حسن مجتبیٰ ؑ کے اس خطبہ میں تین باتیں توجہ طلب ہیں:

- ۱۔ اِنَّا وَاللّٰهُ مَا قَاتَنَا عَنْ اَهْلِ الشَّامِ شَكٌّ وَلَا نَدَمٌ۔
 ”اللہ کی قسم! ہمیں اہل شام کے متعلق کسی شک یا ندامت نے نہیں روکا۔“
- ۲۔ اَلَا وَاِنَّا لَكُمْ كَمَا كُنَّا ، وَلَسْتُمْ لَنَا كَمَا كُنْتُمْ۔
 ”آگاہ رہو! ہم تو اب بھی تمہارے لیے ویسے ہی ہیں جیسے تھے مگر تم ہمارے لیے اب ویسے نہیں رہے جیسے پہلے تھے۔“

۳۔ اَلَا وَاِنَّ مُعَاوِيَةَ دَعَانَا اِلَى اَمْرِ لَيْسَ بِهِ عِوٌ وَلَا نَصْفَةٌ۔
 ”سنو! معاویہ نے ہمیں ایک پیش کش کی ہے جس میں عزت ہے اور نہ ہی انصاف۔“

چونکہ امام پاک رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تینوں جملے جبکہ مصنفین اور جنگ نہردان کو مد نظر رکھتے ہوئے ارشاد فرمائے ہیں، لہذا معلوم ہوا کہ انہیں اپنے والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ کی اُن دونوں جنگوں کی حقانیت پر کوئی شک تھا اور نہ ہی کوئی ندامت۔ اُن کا تو اپنے والد کے بارے میں یہاں تک عقیدہ تھا کہ وہ کبھی چشم زدن کے لیے بھی شک میں مبتلا نہیں ہوئے۔ چنانچہ ایک مرتبہ انہوں نے سیدنا علی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں عمرو بن العاص کی نامناسب گفتگو کی تردید میں اُس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

وَاللّٰهُ اِنَّكَ لَتَعْلَمُ اَنْ عَلِيًّا رحمۃ اللہ علیہ لَمْ يَتَرَبَّبْ لِي الْاَمْرِ ، وَلَمْ يَشْكُ
 لِي اللّٰهُ طَوْلَةَ غَيْبٍ۔

”اللہ کی قسم! تم بخوبی جانتے ہو کہ سیدنا علی رحمۃ اللہ علیہ کسی معاملہ میں خوف کا شکار نہیں ہوئے اور نہ ہی انہوں نے چشم زدن کے برابر معاملہ الہی میں شک کیا۔“

(المحاسن والمساوي للبيهقي ص ۸۰)

اس حقیقت کو تو مشہور عادی اور نامی قاضی ابوبکر ابن العربی مالکی تک نے بھی تسلیم کیا ہے، چنانچہ وہ

لکھتا ہے:-

اَمَّا قَوْلُ الرَّائِضَةِ اِنَّهُ عَهْدٌ اِلَى الْحَسَنِ فَبَاطِلٌ ، مَا عَهْدٌ اِلَى اَحَدٍ
 وَلَكِنَّ الْبَيْعَةَ لِلْحَسَنِ مُتَعَقِدَةٌ ، وَهُوَ اَخِي مِنْ مُعَاوِيَةَ وَمِنْ كَثِيرٍ مِنْ غَيْرِهِ،

وَتَكَانَ خُرُوجُهُ لِيُجْلَلَ مَا خَرَجَ إِلَيْهِ أَبُوهُ مِنْ دُعَاءِ الْفِتْنَةِ الْبَاغِيَةِ إِلَى
الْإِنْقِيَادِ لِلْحَقِّ وَالِدُخُولِ فِي الطَّاعَةِ ، فَكَانَتْ الْوَسَاطَةُ إِلَى أَنْ تَعْلَى عَنِ
الْأَمْرِ صِيَانَةً لِيَحْقِنَ دِمَاءَ الْأُمَّةِ .

”رہاروافض کا قول کہ سیدنا علی علیہ السلام نے امام حسن علیہ السلام کو ولی عہد بنایا تھا تو یہ باطل
ہے، انہوں نے کسی کو ولی عہد نہیں بنایا تھا، تاہم امام حسن علیہ السلام کی بیعت منعقد ہو گئی تھی
اور وہ معاویہ اور دوسرے بہت سے لوگوں سے زیادہ حق دار تھے، اور ان کا نکلنا اسی طرح
تھا جس طرح اُن کے والد نکلے تھے، باغی گروہ کو حق کی طرف بلائے اور طاعت میں
داخل کرنے کے لیے، پھر درمیان میں وساطت (کچھ لوگ) آگئے تو امام پاک تحفظ
خون امت کی خاطر خلافت سے دست بردار ہو گئے۔“

(العواصم من القواصم لابن العربي المالکی ص ۳۲۴)

اس سے معلوم ہوا کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نہ صرف یہ کہ اپنے بابا کریم علیہ السلام کے اقدامات کی
حقانیت پر کھل یقین رکھتے تھے بلکہ وہ اُن کے نقش قدم پر چلتے ہوئے باغیوں کو حق کی طرف لانے کے لیے
نکل بھی چکے تھے۔

سوال: جب قاضی ابن العربی ناہمی تک نے تسلیم کیا ہے کہ امام پاک اپنے بابا کی طرح بغاوت کو
کچلنے کی خاطر نکلے تھے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ معاویہ کیوں نکلے تھے؟ اگر کہا جائے کہ قصاص عثمان علیہ السلام کے
لیے نکلے تھے تو یہ مطالبہ پیش کیوں نہ کیا اور اگر مطالبہ کیا تھا تو قبل از قصاص صلح کی پیش کش کیوں کی تھی؟

اہل بیت محفوظ یا معصوم؟

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اُن کے والد کبھی شک سے دوچار نہیں ہوئے۔ میں عرض کرتا ہوں:
بھلا وہ ہستی کسی معاملہ میں شک و تذبذب کا شکار کیونکر ہو سکتی تھی جن کے حق میں زبان نبوی ﷺ سے دعا
صادر ہوئی کہ وہ جدھر بھی رخ فرمائیں حق اُدھر ہو جائے۔ غور فرمائیے ادعا یوں نہیں مانگی گئی کہ جدھر حق ہو
انہیں اُدھر پھیر دے بلکہ دعایہ کی گئی کہ جدھر وہ رخ فرمائیں حق اُدھر ہو جائے۔ چونکہ ایسی انوکھی دعائیں

فقط اہل بیت کرام علیہم السلام کے لیے ہی مانگی گئیں اسی لیے بعض علماء اہل سنت نے تشدد ہونے کے باوجود اس قسم کی دعاؤں کو اہل بیت کرام علیہم السلام کی عصمت کی دلیل قرار دیا ہے۔ چنانچہ مشہور متنازع کتاب ”تقویۃ الایمان“ کے مصنف شاہ محمد اسماعیل شہید فاروقی لکھتے ہیں:

”مقامات ولایت میں سے ایک مقام عظیم عصمت ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عصمت کی حقیقت حفاظتِ غیبی ہے جو محصوم کے تمام اقوال، افعال، اخلاق، احوال، اعتقادات اور مقامات کو راجح کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے اور حق سے روگردانی کرنے سے مانع ہوتی ہے۔ یہی حفاظت جب انبیاء سے متعلق ہو تو اُسے عصمت اور اگر کسی دوسرے کامل سے متعلق ہو تو اُسے حفظ کہتے ہیں۔ پس عصمت اور حفظ حقیقت میں ایک ہی چیز ہے لیکن ادب کے لحاظ سے عصمت کا اطلاق اولیاء اللہ پر نہیں کرتے۔ حاصل یہ کہ اس مقام میں مقصود یہ ہے کہ یہ حفاظت غیبی جیسا کہ انبیاء کرام کے متعلق ہے ایسا ہی اُن کے بعض اکابرِ قبعین کے متعلق ہوتی ہے۔..... اور نبی ﷺ نے حضرت علیؑ کے حق میں دعا کی:

اللّٰهُمَّ اُدْرِ الْحَقَّ مَعَهُ حَيْثُ دَارَ.

اے اللہ! جس جگہ علی جائے اُس کے ساتھ حق جاری رکھ۔

اور فرمایا:

الْقُرْآنُ مَعَ عَلِيٍّ وَعَلَيْهِ مَعَ الْقُرْآنِ.

قرآن علی کے ساتھ ہے اور علی قرآن کے ساتھ۔

اور فرمایا:

إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمْ الثَّقَلَيْنِ: كِتَابَ اللَّهِ وَعِزَّتِي أَهْلَ بَيْتِي، وَلَنْ يَتَفَرَّقَا

حَتَّى يَرُدَّ عَلَيَّ الْحَوْضُ.

میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑتا ہوں: ایک تو کتاب ہے اور دوسری میرے اہل بیت

اور یہ دونوں تم سے جدا نہ ہوں گے حتیٰ کہ حوض کوثر پر آئیں گے۔“

(منصبِ امامت ص ۶۶، ۶۷، ۶۸)

شاہ اسماعیل شہید کے اس طویل اقتباس میں سے پہلے حسب ذیل الفاظ میں غور فرمائیے:

”عصمت کی حقیقت حفاظتِ غیبی ہے جو معصوم کے تمام اقوال، افعال، اخلاق، احوال، اعتقادات اور مقامات کو راہِ حق کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے۔“

پھر اُن کی درج کردہ سنن ترمذی کی اس حدیث میں غور فرمائیے!

اللَّهُمَّ اِدْرِ الْحَقَّ مَعَهُ حَيْثُ دَاوَّ.

”اے اللہ! جس جگہ علی جائے اُس کے ساتھ حق جاری رکھ۔“

پھر ان دونوں باتوں کا نتیجہ نکالتے ہوئے بتائیے کہ شاہ صاحب کے ان الفاظ: ”عصمت کی حقیقت حفاظتِ غیبی ہے جو معصوم کے تمام اقوال، افعال، اخلاق، احوال، اعتقادات اور مقامات کو راہِ حق کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے“ میں اور سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے مذکورہ بالا الفاظ کے نتیجے میں کیا فرق ہے؟ یعنی کسی کا چشم زدن کے لیے بھی شک و تذبذب میں مبتلا نہ ہونا اور کسی کا معصوم ہونا، ان دونوں باتوں میں کیا فرق ہے؟

محفوظ الاقوال والافعال کا معاویہ کے بارے میں موقف

جب یہ ثابت ہو گیا کہ سیدنا مولیٰ علی علیہ السلام چشم زدن کے لیے بھی کسی معاملہ میں تذبذب اور شک کا شکار نہیں ہوئے اور اُن کے تمام اقوال، افعال، اخلاق، احوال، اعتقادات اور مقامات محفوظ و معصوم تھے تو پھر یہ حقیقت اس سے قبل بیان ہو چکی ہے کہ اُن کے نزدیک معاویہ لائقِ خلافت بھی نہیں تھا اور خلیفہ برحق کے حکم سے سرتابی کرنے کی وجہ سے باغی بھی تھا، اور چونکہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے نزدیک اُن کے بابا کے تمام اقدامات ہر لحاظ سے شکوک و شبہات سے منزہ و مبرا تھے اسی لیے اُن کے نزدیک بھی معاویہ کا خلافت کے لیے نا اہل ہونا اور باغی ہونا متحقق ہو گیا۔ جب آپ پر یہ حقیقت عیاں ہو گئی تو اب ایک مرتبہ ”الکامل فی اللغة والأدب للبرد“ اور دوسرے حضرات کی وہ عبارت ضرور پڑھ لیجئے جس میں ہے کہ امام حسن

مجتہبیؑ صلح کے باوجود معاویہ کو خوارج سے بھی زیادہ برا سمجھتے تھے۔ وہ عبارت آئندہ صفحات میں ان شاء اللہ تعالیٰ ”معیار اہلیت میں صحابہؓ اور بعض علماء ہند میں اختلاف“ کے عنوان کے تحت آئے گی۔

شاید یہاں کسی کے پیٹ میں مروڑ اٹھے کہ یہ کھینچ تان کر سیدنا علیؑ کو محفوظ الاقوال بنایا گیا ہے تو ہم ایسے شخص کو کہتے ہیں کہ بخاری شریف میں سیدنا عمار بن یاسرؓ کو خود نبی کریم ﷺ نے محفوظ الاقوال فرمایا ہے اور انہوں نے معاویہ اور اُس کے پیروکاروں کو باطل اور ضلالت پر قرار دیا تھا۔

امام حسینؑ کے ہاں مقام معاویہ

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سیدنا امام حسینؑ کا موقف بھی نقل کر دیا جائے۔ دور معاویہ میں مدینہ منورہ میں مختلف لوگ سیدنا امام حسینؑ سے ملاقات کرنے کے لیے آتے رہتے تھے، درآنحالیکہ وہاں کا گورنر مردان بن الحکم تھا، اُس نے خطرہ محسوس کیا تو معاویہ کو خط لکھ بھیجا۔ یہاں ہم اُس خط کو اہل حدیث عالم مولانا محمد اسحاق مدنی کے وضاحتی ترجمہ کے ساتھ نقل کر رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”مردان نے مدینہ سے معاویہ کو خط لکھا کہ مجھے یہ ڈر ہے کہ حسینؑ بغاوت کریں گے اور مقابلہ بہت بڑا ہوگا۔ اس پر معاویہ نے امام حسینؑ کو خط لکھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب تم کسی سے معاہدہ کرو تو پورا کرو۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ کوفہ کے لوگ تمہارے پاس آتے ہیں اور تجھے دعوت دیتے ہیں کہ تو ہمارے خلاف اٹھے۔ عراقیوں کو تم جانتے ہو کہ تمہارے باپ اور بڑے بھائی سے انہوں نے کیا سلوک کیا۔ حسینؑ اللہ سے ڈرا اور معاہدہ پر قائم رہ! پھر دمکی دیتے ہوئے لکھا کہ اگر تم میرے خلاف کوئی چال چلو گے تو میں بھی چال چلوں گا۔

سیدنا حسینؑ نے جواب دیتے ہوئے لکھا: تیرا خط ملا ہے، جو باتیں تم نے لکھی ہیں میں ان میں سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا، میں بھائی کے معاہدہ پر قائم ہوں اور نیکی کا راستہ اللہ تعالیٰ بھاتا ہے۔ فی الحال تیرے ساتھ نہ میرا کوئی جنگ کا ارادہ ہے نہ خلاف اٹھنے کا مگر تیرے خلاف جہاد نہ کرنے کا کوئی عذر مجھے بارگاہ خداوندی

میں پیش کرنے کے لیے سمجھ میں نہیں آتا، اور یہ جو تم نے لکھا ہے کہ میں کسی فتنے میں پڑ جاؤں تو میرے علم کے مطابق اس سے بڑا فتنہ کوئی نہیں ہے کہ تیرے جیسا آدمی اس اُمت کا سربراہ بن گیا ہے۔“

(مقصد حسین ص ۴۷۴)

آخری الفاظ کی عربی ملاحظہ فرمائیں:

وَلَا أَعْلَمُ فِتْنَةً أَكْبَرُ مِنْ وَلَا يَكُ أَمْرٌ هَذِهِ الْأُمَّةِ.

البدایہ والنہایہ مترجم میں اس جملہ کا ترجمہ یوں ہے:

”مجھے معلوم ہے کہ اس اُمت کی امارت پر آپ کے قابض ہونے سے بڑھ کر اور کوئی فتنہ نہیں۔“

(الطبقات الكبرى لابن سعد ج ۶ ص ۴۲۳؛ تاریخ دمشق ج ۱۴ ص ۲۰۶؛ مختصر تاریخ دمشق ج ۷ ص ۱۳۷، ۱۳۸؛ البدایہ والنہایہ، ط: قطر، ج ۸ ص ۲۳۲، و مترجم اردو ج ۸ ص ۲۱۰؛ وط: بتحقیق محسن الترمذی ج ۱۱ ص ۵۰۰؛ سیر أعلام النبلاء ج ۳ ص ۲۹۴؛ تہذیب الکمال للزمز ج ۶ ص ۴۱۳، ۴۱۴؛ تہذیب تہذیب الکمال للذہبی ج ۲ ص ۳۴۵، ۳۴۶) ذرا ابن صحر کے اندازِ تکلم اور الفاظ میں تو غور فرمائیے، لختِ جگر مصطفیٰؐ اور ہر قسم کی رجز سے منزہ و مصفیٰ ہستی کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتا ہے:

فَإِنَّكَ مَتْنِي فَكِدْنِي أَكِلَكَ.

”پس اگر تو نے میرے ساتھ مکر کیا تو میں بھی تیرے ساتھ مکر کروں گا۔“

سچ ہے کہ ”الْمَرْءُ يَقْبِضُ عَلَى نَفْسِهِ“ (انسان دوسرے کو خود پر قیاس کرتا ہے) اس میں دو طرح کی زیادتی ہے: اول تو یہ کہ امام عالی مقام کی طرف مکر کی نسبت کی ہے، دوسری یہ کہ دھمکی دی ہے کہ میں بھی تیرے ساتھ مکر کروں گا۔ اگر امام پاک کی طرف سے معاویہ کے خلاف کسی قسم کی کوئی بات ہوتی بھی کسی تو یوں بھی خط لکھا جاسکتا تھا کہ ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہے، اگر ایسی کوئی بات

ہے تو بتائیے میں ازالہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں“ مگر ایسی امید اُن سے کی جاسکتی ہے جو ”اَنْزِلَ عَنْ مَنْبِرِ اٰیہی“ کے الفاظ کو سن کر غضبناک ہونے کی بجائے خوش ہوئے تھے۔

بعض علماء ہند کا محل نظر استدلال

گذشتہ سطور میں سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے خطبہ سے ماخوذ تین اقتباسات میں سے پہلے اقتباس کا خلاصہ یہ ہے کہ معاویہ سیدنا امام حسن اور اُن کے والد گرامی علیہما السلام کے نزدیک خلافت کے لیے اہل نہیں تھا جبکہ سیدنا امام حسین علیہ السلام کے نزدیک معاویہ کی امارت سے بڑا فتنہ ہی کوئی نہیں تھا، اور اس سے قبل آپ پڑھ چکے ہیں کہ سیدنا عمر، سیدنا عبداللہ بن عباس، ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ اور سیدنا عبدالرحمان بن غنم اشعری رحمہم اللہ معاویہ کو خلافت کے لیے اہل نہیں سمجھتے تھے، لہذا اس قدر تصریحات اکابر کی موجودگی میں اگر کوئی شخص معاویہ کی اہلیت کا قول کرے تو وہ قابل اعتبار نہیں ہوگا۔ مثلاً بعض علماء نے لکھا ہے:

”امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگر خلافت کے اہل نہ ہوتے (تو) امام مجتبیٰ ہرگز انہیں تفویض نہ فرماتے، نہ اللہ و رسول اسے جائز رکھتے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔“

(فتاویٰ رضویہ ج ۲۹ ص ۳۳۷)

یہ استدلال کیونکر قابل قبول ہو سکتا ہے جبکہ شریعت نے ہمیں اہل بیت کرام علیہم السلام کے دامن ہدایت کو تھا مننے کی رغبت دی ہے اور فرمایا ہے کہ اگر تم اُن کے دامن کو تھا مو گے تو ہرگز گمراہ نہیں ہو گے۔ سو جب اہل بیت کرام علیہم السلام اور بشمول سیدنا عمر بن الخطاب متعدد صحابہ و تابعین رحمہم اللہ نے معاویہ کو خلافت کے لیے اہل نہیں سمجھا تو ہمارے لیے اُن کا قول و فہم ہی باعث ہدایت ہے اور جو کچھ اُن کے قول و فہم سے متصادم ہے وہ ہندو پاک یا عرب و عجم کے کسی بھی عالم کا قول ہو تو محض مردود و باطل ہے۔

صلح میں امام حسن علیہ السلام کی مجبوریاں

انجائی افسوس ناک بلکہ مضحکہ خیز بات ہے کہ بعض لوگ مجبوری اور پسند میں فرق نہیں کرتے۔ مجبوراً کسی چیز کو گوارا کرنے اور طبعاً کسی چیز کو اپنانے میں فرق نہ کیا جائے تو یقیناً فساد پیدا ہوتا ہے۔ سیدنا امام

حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے جو ایک نا اہل شخص کو اقتدار سونپا گوارا کیا تھا اُس میں کئی مجبوریاں تھیں:

۱۔ اذلا یہ کہ اُن کے لشکر میں بے لوث لڑنے کے لیے اب وہ دم خم نہیں رہا تھا جو پہلے تھا۔ اس کو امام پاک نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

اَلَا وَاِنَّا لَكُمْ كَمَا كُنَّا ، وَلَنْسُخَ لَنَا كَمَا كُنْتُمْ .

”آگاہ رہو! ہم تو اب بھی تمہارے لیے ویسے ہی ہیں جیسے تھے مگر تم ہمارے لیے اب ویسے نہیں رہے جیسے پہلے تھے۔“

یہ اُس خطبہ سے، خود جملہ ہے جو اس سے قبل ”اسد الغابہ“ وغیرہ سے نقل کیا گیا ہے، اُسی کے آخر میں یہ بھی ہے کہ قوم سے جب اُن کی مرضی پوچھی گئی تو انہوں نے جہاد پر حیات کو ترجیح دی، حالانکہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام جہاد کے خواہاں تھے اور انہیں معاویہ نے جس صلح کی پیش کش کی تھی وہ انہیں پسند نہیں تھی، وہ اُس میں عزت سمجھتے تھے اور نہ ہی انصاف۔

ایسی ہی صورت حال سے اُن کے بابا کریم سیدنا مولیٰ علی علیہ السلام بھی دوچار ہوئے تھے۔ جب صفین میں جب لشکر شام ہزیمت کا شکار ہونے لگا تو اُس وقت عمرو بن العاص کی خدایت و کمیت لشکر شام کی نصرت کو آئی اور اُن کے کہنے پر قرآن مجید کو نیزوں پر بلند کیا گیا، اس سے اُن کا مقصد یہ تھا کہ جنگ بند ہو جائے اور کوئی معاہدہ طے پا جائے، جسے بعد میں تحکیم کا نام دیا گیا۔ سیدنا علی علیہ السلام اُن کی چال کو بھانپ گئے تھے اس لیے انہوں نے کھلے الفاظ میں منع کیا تھا اور فرمایا تھا کہ یہ دھوکہ دہی کی کوشش کی جا رہی ہے، لہذا جنگ جاری رکھو مگر اُن کے لشکر کا ایک حصہ دھوکہ میں آ گیا اور جنگ سے پیچھے ہٹ گیا تو مجبوراً تحکیم کو گوارا کرنا پڑا۔ اب اس مجبوری کو اگر کوئی شخص مولیٰ علی علیہ السلام کی پسند قرار دے کر اس سے کسی کی اہلیت کی دلیل اخذ کرنا شروع کر دے تو اُس کی عقل پر افسوس ہی کیا جاسکتا ہے؟

۲۔ ثانیاً یہ مجبوری تھی کہ صلح کی پیش کش معاویہ کی طرف سے تھی۔ ایسی صورت حال میں کبھی بھی اگر اسلام کے حقیقی نمائندے صلح کی پیش کش کو ٹھکرا دیں تو مخالفین اور خصوصاً منکر بن اسلام کو غلط پروپیگنڈا کرنے کا موقع مل جاتا ہے، جبکہ معاشرہ میں اصل چیز اصولوں پر قائم رہتے ہوئے امن، اصلاح اور صلح کو یقینی

بیانا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کافر بھی اگر صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی جھک جاؤ، اگرچہ اُن کا ارادہ دھوکہ دہی کا ہی کیوں نہ ہو، جیسا کہ ہم اس سے قبل سورۃ الانفال کی آیات نقل کر چکے ہیں۔

معاویہ کے ساتھ صلح میں عزت نہیں

ثالث درج ذیل الفاظ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی مجبوری کو چیخ چیخ کر بیان کر رہے ہیں:

أَلَا وَإِنَّ مُعَاوِيَةَ دَعَانَا إِلَىٰ أَمْرِ لَيْسَ فِيهِ عِزٌّ وَلَا نَصْفَةٌ.

”سنو! معاویہ نے ہمیں ایک پیش کش کی ہے جس میں عزت ہے اور نہ ہی انصاف۔“

اس جملہ سے یہ حقیقت عیاں ہو رہی ہے کہ سیدنا امام حسن علیہ السلام نے مجبوراً صلح فرمائی تھی، اور وہ مجبوری تھی جانین کے اہل اسلام کے خون کی حفاظت۔ خود سوچئے کہ امام پاک ایک طرف تو فرما رہے ہیں کہ جس بات کی طرف معاویہ بلا رہا ہے اُس میں عزت و انصاف نہیں ہے اور دوسری طرف انہوں نے وہ بات گوارا بھی کر لی اور مجبوراً مملکت معاویہ کے سپرد بھی کر دی تو اس سے معاویہ کی اہلیت کیسے ثابت کی جاسکتی ہے؟

اکابر پرستی یا حق پرستی؟

ہر چند کہ ہندو پاک کا کوئی عالم امام مذہب ہے اور نہ ہی امام عقیدہ، مگر تمام علماء حق واجب التعظیم ہیں، لیکن تعظیم الگ چیز ہے اور اکابر پرستی الگ چیز ہے، اس لیے اعتدال پسند مسلمان اکابر پرست نہیں بلکہ حق پرست ہوتا ہے۔ سو جس مسئلہ میں دلائل اکابر کے موقف کے خلاف ہوں تو حق پسند شخص دلائل کی روشنی میں حق کو اپنالیتا ہے اور اکابر کو تو نہیں لیکن قول اکابر کو چھوڑ دیتا ہے۔ سو اسی اصول کے مطابق چونکہ بعض اکابر کا صلح امام حسن علیہ السلام کو معاویہ کی اہلیت کی دلیل بنانا باطل ہے اس لیے اُن کے قول کو چھوڑ کر حق کو قبول کرنا ضروری ہے، کیونکہ ”الْحَقُّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ“ (حق زیادہ حق رکھتا ہے کہ اُس کی اتباع کی جائے)۔

مضطر کے لیے ممنوعات کا استعمال مباح یا محبوب؟

بعض متاخرین ہند کا صلح امام حسن سے اہلیت معاویہ کا قول کرنا ایسے ہے جیسا کہ بعض علماء کا معاملہ حکیم سے معاویہ کی بغاوت کی نفی کرنا، حالانکہ جس طرح امام حسن علیہ السلام نے صلح مجبوراً کی تھی اسی طرح سیدنا علی علیہ السلام

نے حکیم کو بھی مجبوراً گوارا کیا تھا، اور بالکل اسی طرح نبی کریم ﷺ نے بھی مشرکین مکہ کے ساتھ حدیبیہ کے مقام پر مجبوراً دس سالہ صلح کا معاہدہ کیا تھا، اور آپ نے اُسی موقع پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو پیش گوئی فرمادی تھی کہ تمہیں بھی ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ چنانچہ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

عَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ قَيْسٍ، قَالَ: قُلْتُ لِعَلِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ تَجْعَلُ بَيْنَكَ وَبَيْنَ ابْنِ أَبِي كَبَادٍ حَكْمًا؟ قَالَ: إِنِّي كُنْتُ كَاتِبَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ يَوْمَ الْحُدَيْبِيَّةِ، فَكُتِبَ هَذَا مَا صَالَحَ عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ، وَسُهَيْلُ بْنُ عُمَرَ، فَقَالَ سُهَيْلٌ: لَوْ عَلِمْنَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ مَا قَاتَلَنَا، أَمْحَاهَا، فَقُلْتُ: هُوَ وَاللَّهِ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَإِنْ رَغِمَ أَنْفُكَ، لَا وَاللَّهِ لَا أَمْحُوهَا، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: أَرَيْتُ مَكَانَهَا، فَأَرَيْتُهُ لَمْحَاهَا، وَقَالَ: أَمَا إِنَّ لَكَ مِثْلَهَا وَسَتَأْتِيهَا وَأَنْتَ مُضْطَرٌّ.

”حضرت علقمہ بن قیس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے عرض کیا: آپ نے اپنے اور ”ابن ابی کباد“ (کلیجہ چبانے والی کے بیٹے) کے درمیان فیصلہ مقرر کر دیا ہے؟ انہوں نے فرمایا: حدیبیہ کی صلح میں، میں رسول اللہ ﷺ کا کاتب تھا، پس لکھا گیا: یہ صلح نامہ محمد رسول اللہ ﷺ اور سہیل بن عمرو کی طرف سے ہے تو سہیل نے کہا: اگر ہم ان کو رسول اللہ سمجھتے تو ان سے برسرِ پیکار کیوں ہوتے؟ اس (لفظ رسول اللہ) کو مٹا دو۔ میں نے کہا: خدا کی قسم! وہ اللہ کے رسول ہیں اگرچہ تمہیں ناگوار ہو، خدا کی قسم میں نہیں مٹاؤں گا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ان الفاظ کی جگہ مجھے دکھاؤ! میں نے آپ کو وہ جگہ دکھائی تو آپ نے اس کو مٹا دیا اور فرمایا: ایسا معاملہ تمہارے ساتھ بھی ہوگا اور عنقریب پیش آئے گا اور اُس وقت تم مجبور ہو گے۔“

(السنن الکبریٰ للنسائی ج ۷ ص ۴۸۱، ۴۸۲ حدیث ۸۵۲۳ و ط: ج ۵ ص ۱۶۷ حدیث ۸۵۷۶)

خصائص امیر المؤمنین علی بن ابی طالب، بتحقیق الحوینی ص ۱۵۲ حدیث ۱۸۶)

اس حدیث کی سند میں چھ رواۃ ہیں۔

۱۔ ”معاویہ صالح ابن الوزیر دمشقی: حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں: یہ سچا ہے۔“

(تقریب التہذیب ص ۹۵۵)

۲۔ عبدالرحمان بن صالح ازوی: سچا تھا شیعہ (مقدمین کے مطابق محبت اہل بیت) تھا۔

(تقریب التہذیب ص ۵۸۲)

۳۔ عمرو بن ہاشم الجنبی: یہ حدیث میں کمزور تھا۔

(تقریب التہذیب ص ۷۴۷)

۴۔ محمد بن اسحاق بن یسار: یہ امام المغازی ہیں، صدوق ہیں، مدلس ہیں اور ان پر تشیع اور قدریہ ہونے کی جہمت ہے۔

(تقریب التہذیب ص ۸۲۵)

حضرت محمد بن اسحاق بن یسار رحمہ اللہ کو محدث سفیان بن عیینہ اور حضرت شعبہ نے امیر المؤمنین فی الحدیث مانا ہے۔ ان کے متعلق تفصیل کے لیے ہماری کتاب ”انوار العرفان فی أسماء القرآن“ صفحہ ۸۵۸ تا ۸۳۹ ملاحظہ فرمائیے۔

۵۔ محمد بن کعب القرظی: ثقہ عالم ہیں۔

(تقریب التہذیب ص ۸۹۱)

۶۔ علقمہ بن قیس کوئی: ثقہ، ثبت، فقیہ اور عابد تھے۔

(تقریب التہذیب ص ۶۸۹)

اگر کوئی شخص اس حدیث کو تسلیم کرنے میں متردد ہو تو ہم اس کے سامنے ایسی صحیح سند حدیث پیش کر دیتے ہیں جس میں ذکر ہے کہ حکیم میں سیدنا علی رحمہ اللہ کو امیر المؤمنین تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور انہیں لفظ ”امیر المؤمنین“ اسی طرح مٹانا پڑ گیا تھا جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لفظ ”مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰہِ“ مٹانا پڑ گیا تھا۔ یعنی جس طرح قریش مکہ کے ساتھ معاہدہ صلح لکھواتے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا

بعینہ ایسی ہی دشواریوں کا سامنا سیدنا علیؑ کو بھی کرنا پڑ گیا تھا۔ اسی بنا پر اُن کے لشکر کے کچھ لوگ انہیں چھوڑ کر الگ ہو گئے تھے اور خوارج قرار پائے تھے، انہوں نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ جب وہ امیر المؤمنین نہیں ہیں تو پھر امیر الکافرین ہیں۔ بالآخر سیدنا ابن عباسؓ نے اُن کے ساتھ مناظرہ کیا اور اُن کے دوسرے اعتراضات کو دفع کرنے کے ساتھ ساتھ لفظ امیر المؤمنین کو محو کرنے کی مجبوری کو بھی صلح حدیبیہ کی مثال سے واضح فرمایا تو اُن میں سے ہزاروں لوگوں نے اپنی غلطی سے رجوع کر لیا۔ چنانچہ محدثین کرام نے طویل حدیث کے ضمن میں خوارج کے اس اعتراض کو بایں الفاظ نقل کیا ہے:

قَالُوا: إِنَّهُ مَعْطَى نَفْسَهُ مِنْ أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ، فَإِنْ لَمْ يَكُنْ أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ فَهُوَ أَمِيرُ الْكَافِرِينَ.

”خوارج نے کہا: انہوں نے اپنی ذات سے امیر المؤمنین مٹا دیا ہے، پس اگر وہ امیر المؤمنین نہیں تو امیر الکافرین ہیں۔“

سیدنا ابن عباسؓ نے اُن کے اس اعتراض کا جواب یوں دیا تھا:

وَأَمَّا قَوْلُكُمْ: مَعْطَى نَفْسَهُ مِنْ أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ، فَإِنْ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ دَعَا قَرِيشًا يَوْمَ الْحُدَيْبِيَّةِ عَلَى أَنْ يَكْتُبَ بَيْنَهُمْ كِتَابًا، فَقَالَ: اكْتُبْ! هَذَا مَا قَاضَى عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ، قَالُوا: لَوْ كُنَّا نَعْلَمُ أَنَّكَ رَسُولُ اللَّهِ مَا صَدَدْنَاكَ عَنِ الْبَيْتِ، وَلَا قَاتَلْنَاكَ، وَلَكِنْ اكْتُبْ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ، فَقَالَ: وَاللَّهِ إِنِّي لَرَسُولُ اللَّهِ حَقًّا وَإِنْ كَذَبْتُمُونِي، اكْتُبْ يَا عَلِيُّ امْحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ، فَرَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَفْضَلُ مِنِّي عَلِيٌّ.

”وہ گیا تمہارا یہ قول کہ انہوں نے اپنی ذات سے امیر المؤمنین محو کر دیا ہے، تو

(اس کا جواب یہ ہے کہ) رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کے دن قریش کو اس بات کی

دعوت دی کہ آپ کے اور اُن کے درمیان معاہدہ لکھا جائے۔ پس آپ نے فرمایا:

لکھو! یہ محمد رسول اللہ کی جانب سے صلح نامہ ہے۔ قریش نے کہا: اگر ہم جانتے کہ آپ

اللہ کے رسول ہیں تو ہم آپ کو بیت اللہ سے روکتے اور نہ ہی آپ سے جنگ کرتے۔
 آپ نے فرمایا: لکھو محمد بن عبد اللہ۔ پھر فرمایا: اللہ کی قسم! میں بالیقین اللہ کا رسول
 ہوں اگرچہ تم مجھے جھٹلاتے ہو۔ اے علی! لکھ دو: محمد بن عبد اللہ۔ پس رسول اللہ ﷺ
 سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے افضل تھے۔

(المصنف للإمام عبدالرزاق: کتاب الفرائض، باب ما جاء في الحرورية، ج ۱۰ ص ۱۵۸،
 ۱۵۹ حدیث ۱۸۶۷۸؛ السنن الكبرى للنسائي ج ۷ ص ۴۷۹ حدیث ۸۵۲۲؛ المستدرک:
 کتاب قتال أهل البغي، مناظرة ابن عباس مع الحرورية ج ۲ ص ۱۵۰؛ المعجم الكبير ج ۱۰
 ص ۳۱۲، ۳۱۳ حدیث ۱۰۵۹۸؛ السنن الكبرى للبيهقي: کتاب قتال أهل البغي، باب لا يبدأ
 الخوارج بالقتال حتى يسألوا ما نقموا، ج ۸ ص ۱۷۹ وط: ج ۸ ص ۳۰۹، ۳۱۰ حدیث
 ۱۶۷۴۰؛ کتاب الأموال لأبي عبيد: محاجة ابن عباس للحرورية في شأن علي كاتب صلح
 الحديبية ج ۱ ص ۲۶۶ حدیث ۴۶۴؛ کتاب الأموال لابن زنجويه: باب الصلح والمهادنة
 تكون بين المسلمين والمشرکين إلى مدة ص ۳۹۶، ۳۹۷ حدیث ۶۵۵؛ جامع بيان العلم
 وفضله، لابن عبد البر: باب المناظرة والمجادلة وقامة الحججة ج ۱ ص ۹۶۲ حدیث ۱۸۳۴؛
 حلية الأولياء لأبي نعيم: مناقب عبدالله بن عباس، ج ۱ ص ۳۱۹؛ الأحاديث المختارة: مسند
 عبدالله بن عباس ج ۱۰ ص ۱۱۳ حدیث ۴۳۷؛ مجمع الزوائد: کتاب قتال أهل البغي، باب
 ما جاء في ذي الشبدة وأهل النهروان، ج ۱۳ ص ۵۷۵، ۵۷۷ حدیث ۱۰۵۰۳)

امام زرقانی رحمۃ اللہ علیہ: ”سِرُّ لَكَ مِثْلُهَا وَسَتَائِبُهَا وَأَنْتَ مُضْطَرٌّ“ (ایہ معاملہ تمہارے
 ساتھ بھی ہوگا اور عنقریب پیش آئے گا اور اس وقت تم مجبور ہو گے) کی تشریح میں لکھتے ہیں:

يُشِيرُ إِلَى مَا رَفَعَ عَلَيَّ يَوْمَ الْحَكَمَيْنِ، فَإِنَّهُ لَمَّا كَتَبَ الْكَاتِبُ:
 بِهَذَا مَا صَالَحَ عَلَيْهِ عَلِيُّ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ، أُرْسِلَ مُعَارَاةً يَقُولُ: لَوْ كُنْتُ
 أَعْلَمُ أَنَّ أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ مَا قُلِعَتْ (مَا قَاتَلَتْ)، أَمَحَها وَكَتَبَ ابْنُ أَبِي طَالِبٍ،

فَقَالَ عَلِيٌّ: اَللّٰهُ اَكْبَرُ مَثَلٌ بِمَثَلٍ، اَمَحُهَا.

”یہ آپ ﷺ نے اُس واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو حکیم کے روز پیش آیا تھا، سو جب کاتب نے لکھا: یہ صلح نامہ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے ہے۔ معاویہ نے آدمی بھیج کر کہا: اگر میں اُسے امیر المومنین سمجھتا تو اُس سے جنگ نہ کرتا، اس لفظ کو مٹاؤ اور ابن ابی طالب لکھو۔ اس پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ! یہ تو ہو بہو (صلح حدیبیہ کی طرح) معاملہ ہو گیا، اس کو ٹھوکر دو۔“

(شرح الزرقانی علی المواہب ج ۳ ص ۲۰۱)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

(مدارج النبوة اور دوج ۲ ص ۲۶۶، شبیر برادرز، لاہور)

سو جس طرح نبوی پیش گوئی کے مطابق سیدنا علی رضی اللہ عنہ باغیوں کے خلاف جنگ کرنے پر حکیم کو ماننے میں مجبور تھے، اسی طرح سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ اُن ہی ناگوار لوگوں کے ساتھ صلح کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔

ارباب دانش و بینش غور فرمائیں کہ نبی کریم ﷺ نے مشرکین کے ساتھ جو دس سالہ معاہدہ کیا تھا، جس کی وجہ سے مزید دس سال تک کعبہ معظمہ کے اصنام سے ملوث رہنے کا خدشہ بھی موجود تھا، کیا اُس معاہدہ کو آقائے کائنات ﷺ کی خوشنودی اور مشرکین مکہ کے پسندیدہ ہونے کی دلیل سمجھنا عقل مندی ہے؟ اگر نہیں تو نبی کریم ﷺ نے تو اُسی وقت ہی فرمادیا تھا کہ اے علی! عنقریب تجھے بھی ایسی ناگوار صورت حال سے دوچار ہونا پڑے گا۔ پھر ساتھ ہی واضح الفاظ میں فرمادیا ”وَ اَنْتَ مُضْطَرٌّ“ (آپ اُس وقت مضطر ہوں گے) ایمان سے ہٹا دیے کہ اگر کوئی کامل مومن اور متقی شخص مضطر ہونے کی حالت میں کسی حرام چیز کو استعمال کرنے پر مجبور ہو جائے تو کیا وہ چیز اُس کے استعمال کرنے کی وجہ سے پسندیدہ ہو جائے گی؟ حالت اضطرار میں تو مسلمان اگر مردار، بہتا خون، خنزیر کا گوشت اور معبودانِ باطلہ کے نام پر زبح شدہ جانور تک کا گوشت کھالے تو قرآن مجید کے مطابق ”لَا اِنَّہُمْ عَلَیْہِ“ (اُس پر کوئی گناہ نہیں) (البقرہ: ۱۷۳)، لیکن کیا اس سے یہ دلیل حاصل کی جاسکتی ہے کہ ایک متقی شخص کے استعمال کرنے کی وجہ سے وہ اشیاء پسندیدہ ہو جائیں گی؟

اگر نہیں تو پھر جان لینا چاہیے کہ جس طرح ماکولات و مشروبات کے مسائل میں کسی مومن کو حالت اضطرار سے گذرنا پڑتا ہے اسی طرح معاملات وغیرہ میں بھی اُسے حالت اضطرار سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

مولیٰ علیؑ سے سوتیلے سلوک، لمحہ فکر یہ

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ معاویہ بن ابی سفیان نے مولیٰ المومنینؑ کو خلیفہ تسلیم نہیں کیا تھا، اُن کے نام کے ساتھ لفظ امیر المومنین لکھا جانا برداشت نہیں کیا تھا، اُن کے خلافت بغاوت کی، اُن پر سب و شتم کیا، اُنہیں اذیت پہنچائی اور اُن کے ساتھ جنگ کی لیکن حیرت ہے کہ اس سب کچھ کے باوجود بعض لوگ ایسے شخص کو ”سیدنا“ وغیرہ الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ انصاف سے بتائیے! اگر کوئی شخص طاقت کے بل بوتے پر سیدنا ابو بکر صدیقؓ کی خلافت کا انکار کرتا، اُنہیں امیر المومنین نہ مانتا، اُن کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا، اُن پر سب و شتم کرتا اور اُنہیں اذیت پہنچاتا تو کیا اُسے بھی ”سیدنا“ (ہمارا آقا) کہا جاتا؟

شرائطِ صلح

سیدنا امام حسن مجتبیٰؑ اور معاویہ کے درمیان طے پانے والی صلح کی جملہ شرائط کسی ایک کتاب میں یکجا نہیں ملتیں، کسی کتاب میں شرائط کا کچھ حصہ بیان کیا گیا ہے اور کسی میں کچھ، اور ایسا اجمال یا اِکمال اکثر واقعات میں ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن و سنت سے ایسی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ بہر حال ہم آپ کے سامنے مختلف کتب سے شرائط کے اکثر جملے باحوالہ پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

خلافت پھر امام کو لوٹانا ہوگی

امام ابن عبدالبر، امام ابن اثیر جزری، ابن عساکر، سبط ابن الجوزی، نووی، علامہ ذہبی، شعرانی اور سیوطی لکھتے ہیں، واللفظ له:

فَأَرْسَلَ إِلَيْهِ الْحَسَنُ: يَبْدُلُ لَكَ تَسْلِيمُ الْأَمْرِ إِلَيْهِ عَلَى أَنْ تَكُونَ لَكَ
الْخِلَافَةُ مِنْ بَعْدِهِ، وَعَلَى أَنْ لَا يَطْلُبَ أَحَدًا مِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ وَالْبَحْرَيْنِ
وَالْعِرَاقِ بِشَيْءٍ مِمَّا كَانَ أَتَمَّ أَبِيهِ.

”سیدنا امام حسن ؓ نے معاویہ کو پیغام بھیجا کہ وہ اُسے معاملہ سپرد کرتے ہیں
اس شرط پر کہ اُس کے بعد خلافت اُن (امام حسن) کے لیے ہوگی اور یہ کہ اہل مدینہ،
حجاز اور عراق میں سے کسی شخص سے کسی ایسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا جو اُن کے بابا
کے دور میں تھی۔“

(الاستیعاب ج ۱ ص ۲۳۰، ۲۳۱؛ اسد الغابہ ج ۲ ص ۱۸؛ تاریخ دمشق ج ۱۳ ص ۲۶۱؛ مرآة
الزمان ج ۷ ص ۹؛ تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۱۵۹؛ تاریخ الإسلام للذہبی ج ۴ ص ۵۵؛
الطبقات الکبریٰ للشعرانی ج ۱ ص ۵۱؛ تاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۳۱۷)

جب شرائط میں یہ بات طے کی گئی تھی کہ معاویہ کے مرنے کے بعد خلافت پھر امام پاک کولونائی
جائے گی تو اس سے تو امام پاک کی مجبوری واضح طور پر سمجھ آ جاتی ہے، اس کے باوجود بعض علماء ہند کا لکھنا کہ
امام پاک نے معاویہ کو پورے حجاز مقدس سے اختیار کیا تھا، کس قدر عجیب بات ہے۔

بعض معاصرین کی غلط فہمی

ہمارے بعض معاصرین کی فہم کے مطابق یہ شرط محل نظر ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

”حضرت معاویہ اور امام حسن ؓ کے درمیان صلح نامہ میں عام طور پر ایک
شرط بہت مشہور ہے کہ حضرت معاویہ کے بعد حسن ؓ خلیفہ ہوں گے لیکن یہ شرط
مسعودی کی کتاب ”مروج الذهب“، دینوری کی اخبار الطوال، تاریخ یعقوبی، تاریخ
طبری اور ابن اثیر کی اسد الغابہ اور کامل فی التاریخ سمیت کسی مستند تاریخ کی کتاب میں
نہیں ملتی، البتہ علامہ ابن عبدالبر نے الاستیعاب میں لکھا ہے کہ ”حضرت امام حسن
ؓ صرف معاویہ ؓ کی ہی زندگی تک کے لیے ان کے حق میں دستبردار ہوئے
تھے۔“ ان کا یہ بیان محل نظر محسوس ہوتا ہے کیونکہ حضرت امام حسن ؓ کی شہادت
کے فوراً بعد حضرت معاویہ اپنے بیٹے یزید کی بیعت لینے کے لیے مدینہ جا پہنچے اور امام
حسین، عبداللہ بن زبیر اور عبدالرحمن بن ابی بکر ؓ سمیت کسی صحابی نے اس واقعہ یا

شرط کا ذکر نہ کیا کہ آپ معاہدے کی خالف ورزی کر رہے ہیں۔ اگر معاہدے میں شرط ہوتی تو کم از کم یہ ذکر ضرور ہوتا کہ اگر امام حسن علیہ السلام کی شہادت ہو گئی ہے تو ان کے بھائی امام حسین علیہ السلام موجود ہیں، خلافت ان کا حق بنتا ہے، انہیں نامزد کیا جائے لیکن ان میں سے کسی ایک نے بھی ایسا نہ کہا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر اور دیگر صحابہ کرام علیہم السلام نے حضرت معاویہ کے اس فعل کی سخت مزاحمت کی اور مخالفت میں بے شمار دلائل دیئے کہ اس طرح اپنے بیٹے کی بیعت لینا رسول اللہ ﷺ کی سنت نہیں اور نہ ہی یہ خلفاء راشدین کا طریقہ ہے۔ عبدالرحمن بن ابی بکر علیہ السلام نے کہا: یہ قیصر و کسریٰ کا طریقہ ہے لیکن کسی نے بھی یہ دلیل نہیں دی کہ حسن علیہ السلام صرف تمہارے حق میں دستبردار ہوئے تھے۔ اس لیے یزید کو ولی عہد نہیں بنایا جاسکتا۔ اگر ان اکابرین کو اس قسم کی شرط کا علم ہوتا تو وہ دوسرے دلائل کے ساتھ اسے بھی یزید کی جانشینی کی مخالفت میں ضرور پیش کرتے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے بھی دلائل دیئے لیکن انہوں نے بھی یہ نہیں فرمایا کہ آپ نے میرے بھائی حضرت امام حسن علیہ السلام سے یہ طے کیا تھا کہ آپ کی خلافت کے بعد وہ خلیفہ ہوں گے۔ لہذا کہا جاسکتا ہے کہ بوقت صلح اس قسم کی کوئی شرط طے نہیں پائی تھی۔“

(ربحانۃ النبی ﷺ، للدکتور محمد حسین آزاد، ص ۱۴۲)

نامعلوم اس قدر طویل تبصرہ کے پیچھے ڈاکٹر آزاد صاحب کی غرض کیا ہے؟ اُن کی جو بھی غرض ہو ہمیں اُس سے کوئی سروکار نہیں، البتہ ہم اتنا عرض کیے دیتے ہیں کہ انہوں نے امام ابن عبدالبر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نقل کو جو محض نظر کہا ہے، یہ اُن کے عدم تدبر کا نتیجہ ہے۔ اس سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ امام ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کی نقل میں منفرد ہیں، لہذا قابل اعتبار نہیں، حالانکہ ڈاکٹر صاحب نے اُن کے معارضہ میں جتنے اسماء ذکر کیے ہیں امام ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ اُن سب سے زیادہ معتبر ہیں، ماسوا امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ کے۔

پھر ڈاکٹر صاحب کا یہ استدلال بھی عجیب ہے کہ چونکہ ان پانچ حضرات کی کتب میں اس شرط کا ذکر نہیں ملتا لہذا یہ محل نظر ہے۔ کیا کسی بات کے اثبات کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُس بات کا ڈاکٹر صاحب کے سامنے موجود کتب میں مذکور ہونا ضروری ہے؟ اگر ڈاکٹر صاحب کے ذکر کردہ پانچ علماء نے اپنی کتب میں اس شرط کا ذکر نہیں کیا تو کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اُن سے زیادہ علماء نے اس شرط کا ذکر کیا ہے، جیسا کہ ہم مذکورہ بالا سطور میں ابن اثیر، ابن عساکر، سبط ابن الجوزی، نووی، ذہبی، شعرانی اور سیوطی کی کتب کے حوالے سے لکھ چکے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ”اسد الغابۃ“ کے بارے میں بھی لکھ دیا ہے کہ اُس میں بھی اس شرط کا ذکر نہیں ہے، حالانکہ اس میں یہ شرط مذکور ہے، اور اُس کے الفاظ یہ ہیں:

فَارْسَلْ إِلَى مُعَاوِيَةَ يُبَدِّلْ لَهُ تَسْلِيمُ الْأَمْرِ إِلَيْهِ ، عَلَى أَنْ تَكُونَ لَهُ الْخِلَافَةُ
بَعْدَهُ.

”پھر امام نے معاویہ کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ معاملہ اُس کے سپرد کرنے پر تیار ہیں،
اس شرط پر کہ خلافت اُس کے بعد اُن کے لیے ہوگی۔“

(اسد الغابۃ ج ۲ ص ۱۸)

اس شرط کو حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی ذکر کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:
وَأَعْطَاهُ عَهْدًا إِنْ حَدَّثَ بِهِ حَدَّثَ وَالْحَسَنُ حَتَّى تَجْعَلَ هَذَا الْأَمْرَ إِلَيْهِ.
”معاویہ نے امام حسن سے عہد کیا کہ اگر کوئی اچانک معاملہ پیش آگیا اور امام حسن
[الطیلت] زندہ ہوں گے تو وہ ضروریہ امر اُن کی طرف لوٹا دیں گے۔“

(الإصابة بتحقيق محسن التركي ج ۲ ص ۵۴۱، ۵۴۲؛ تهذيب التهذيب ج ۲ ص ۵۳)

حافظ رحمۃ اللہ علیہ بعض مقامات پر لکھتے ہیں:

وَذَكَرَ مُحَمَّدُ بْنُ قُدَامَةَ فِي كِتَابِ الْخَوَارِجِ بِسَبْقِ قَوْلِي إِلَى أَبِي
بَصْرَةَ أَنَّهُ سَمِعَ الْحَسَنَ بْنَ عَلِيٍّ يَقُولُ فِي خُطْبَتِهِ عِنْدَ مُعَاوِيَةَ: إِنِّي
إِشْتَرَطْتُ عَلَى مُعَاوِيَةَ لِنَفْسِي الْخِلَافَةَ بَعْدَهُ.

”محمد بن قدامہ نے ”کتاب الخوارج“ میں ابو بصرہ تک سند قوی کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ انہوں نے امام حسن مجتبیٰ ؑ کو معاویہ کے پاس بیان کرتے ہوئے سنا: میں نے معاویہ پر شرط عائد کی ہے کہ خلافت اُن کے بعد میرے سپرد ہوگی۔“

(فتح الباری ج ۱۶ ص ۵۳۲؛ موسوعة الحافظ ابن حجر العسقلانی ج ۶ ص ۳۳۷)
ڈاکٹر صاحب کا یہ استدلال بھی بے جان ہے کہ اگر یہ شرط طے کی گئی ہوتی تو کم از کم امام حسین، ابن زبیر اور ابن ابی بکر ؓ، یزید کے ناجائز تقرر کے وقت معاویہ کو یاد تو کراتے۔ اس سادگی پر قربان جائیے، جناب والا! معاویہ نے اور کون سی شرط پوری کی تھی کہ یہ حضرات اُسے یہ شرط یاد دلاتے؟ خود ڈاکٹر صاحب نے بھی لکھا ہے کہ معاویہ نے شرائط تسلیم تو کی تھیں لیکن کسی شرط کو پورا نہیں کیا تھا۔ چنانچہ وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

”حضرت امام حسن ؑ بھی طبعاً امن پسند اور صلح جو واقع ہوئے تھے اور مسلمانوں کے درمیان ہرگز کشت و خون کے خواہاں نہ تھے، اس لیے انہوں نے صلح کی شرائط لکھ کر ارسال فرمادیں جنہیں حضرت معاویہ ؓ نے من و عن تسلیم کر لیا۔“

(ریحانۃ النبی ؐ، للدکتور محمد حسین آزاد، ص ۱۵۰)

جبکہ دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

”حضرت معاویہ ؓ نے دستبرداری کے وقت جو شرائط اور وعدے وعید کیے تھے، وہ پورے نہ کیے اور اہل بصرہ نے بھی اپنی زمینوں سے خراج دینے سے معذرت کر لی۔“

(ریحانۃ النبی ؐ، للدکتور محمد حسین آزاد، ص ۱۵۰)

جب یہ تینوں حضرات پچھلے دس برسوں میں دیکھ چکے تھے کہ معاویہ نے امام حسن ؑ کے ساتھ طے کردہ شرائط میں سے کوئی ایک شرط بھی پوری نہیں کی تو پھر وہ یہ شرط اُسے کیوں یاد کراتے؟ انہوں نے ان شرائط کو یاد کرانے کی بجائے اُن موٹی اور واضح باتوں کو اُس کے سامنے رکھا جن کو وہ رد نہ کر سکے، اور وہ

یہ ہیں: نبوی طریقہ، صدیقی طریقہ اور فاروقی طریقہ۔

ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ جس شرط کا لکھا جانا انہیں محل نظر محسوس ہو رہا ہے وہ شرط لکھی گئی تھی، اور یہی وہ خاص شرط تھی جو ہمہ وقت معاویہ کو کھٹکتی رہتی تھی، یہی وجہ ہے کہ جب سیدنا امام حسن مجتبیٰ (علیہ السلام) ۵۰ھ میں زہر سے شہید کر دیے گئے تھے تو معاویہ نے سکھ کا سانس لیا تھا، اُن کی شہادت کو مصیبت نہیں سمجھا تھا اور اُس کے دربار میں کسی بد بخت نے امام پاک کے بارے میں کہا کہ وہ انکارہ تھے جنہیں اللہ نے بجا دیا تو معاویہ اُس بد بخت پر ناراض نہیں ہوا تھا بلکہ اُن کو پیسے دیے تھے۔

دراصل ڈاکٹر صاحب سے اس کتاب میں حق کا چہرہ دھندلا ہو گیا ہے، خدا جانے کہ اُن سے ایسا کیوں ہوا؟ مجھے اُن سے یہ توقع نہیں تھی۔ کچھ لوگوں کو تمام طبقات میں مقبول رہنے کی ٹھکر ہوتی ہے، لیکن اہل بیت کی محبت کا دم بھرنا اور پھر ہر طبقہ میں مقبول رہنے کی توقع کرنا مع

ایں خیال است و محال است و جنوں

معاویہ صلح پر اتنا خوش کیوں؟

امام ابن عبد البر اور سبط ابن الجوزی وغیرہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب معاویہ کے پاس صلح کی یہ شرائط پہنچیں تو وہ بہت خوش ہوئے، حتیٰ کہ الفاظ ہیں:

رَكَادَ أَنْ يُطَيَّرَ لِرُوحَا.

”قریب تھا کہ وہ خوشی سے اڑنے لگتے۔“

(الاستيعاب ج ۱ ص ۲۳۰، ۲۳۱؛ مرآة الزمان ج ۷ ص ۹)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ امام حسن مجتبیٰ (علیہ السلام) کی دست برداری پر معاویہ اس قدر کیوں خوش ہوئے، کیا اس لیے کہ خلافت ایک نا اہل سے اہل کی طرف منتقل ہو رہی تھی، یا اس لیے کہ دین کو زیادہ جاننے والے کی طرف منتقل ہو رہی تھی، یا اس لیے کہ دین کے زیادہ خیر خواہ کی طرف منتقل ہو رہی تھی، یا اس لیے کہ بنو ہاشم سے بنو امیہ کی طرف منتقل ہو رہی تھی، آخر اس قدر خوش ہونے کی وجہ کیا تھی؟

متبعین علی کو چھیڑا نہیں جائے گا

مذکورہ بالا عبارت میں یہ دوسری شرط تھی، اس شرط پر امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے بطور خاص اس لیے زور دیا کہ سیدنا علی علیہ السلام سے حکیم کے بعد ابن صخر نے سیدنا علی علیہ السلام کے پیروکاروں کو ۳۷ھ سے ۴۰ھ کے درمیان مکہ، مدینہ اور یمن وغیرہ مقامات پر ناحق قتل کیا تھا، اُن کے اموال لوٹے تھے، اُن کے نابالغ بچوں تک کو چھریوں سے ذبح کیا تھا اور اُن کی خواتین کو لونڈیاں بنا کر بازار میں فروخت کے لیے کھڑا کیا تھا۔ تفصیل کے لیے ”الاحادیث الموضوعه فی فضائل معاویہ“ میں ”بسر بن ابی اریطہ کے مظالم“ کا ذکر پڑھے۔ افسوس کی بات ہے کہ معاویہ بن ابی سفیان نے اس شرط کو بھی دوسری شرائط کی طرح قبول تو کیا تھا مگر عمل پورا نہیں کیا تھا۔ چنانچہ سیدنا حجر بن عدی، اُن کے رفقاء اور دوسرے متبعین مرتضیٰ علیہ السلام پر جو مظالم ہوئے وہ سب صلح امام حسن کے بعد ڈھائے گئے تھے۔

کتاب و سنت پر عمل کرنا ہوگا

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی جانب سے سب سے بڑی، جامع اور اہم شرط یہ تھی کہ انہوں نے معاویہ سے عہد لیا تھا کہ اُسے امور خلافت کتاب و سنت کے مطابق چلانا ہوں گے۔ چنانچہ علامہ ابن بطلال اور دوسرے شارحین لکھتے ہیں:

وَقَالَ الْحَسَنُ: اتَّقِ اللَّهَ يَا مُعَاوِيَةُ اَعْلَى أُمَّةٍ مُحَمَّدٍ، لَا تَفْنِيهِمْ
بِالسَّيْفِ عَلَى طَلَبِ الدُّنْيَا وَغُرُورِ قَائِلِيَةِ زَائِلَةٍ، فَسَلِّمَ الْحَسَنُ الْأُمُورَ إِلَى
مُعَاوِيَةَ وَصَالَحَهُ وَبَايَعَهُ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ عَلَى إِقَامَةِ كِتَابِ اللَّهِ
وَسُنَّةِ نَبِيِّهِ.

”امام حسن علیہ السلام نے فرمایا: معاویہ! اُمّت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں خدا کا خوف کر! انہیں دنیا طلبی اور فانی و زائل ہو جانے والے غرور کی خاطر فنا نہ کر! پھر امام حسن نے معاملہ معاویہ کے سپرد کر دیا، اُس سے مصالحت کر لی اور کتاب اللہ اور سنت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

ﷺ کو قائم رکھنے کی شرط پر اُس کی بات سننے اور ماننے کی بیعت کر لی۔

(شرح ابن بطال علی البخاری ج ۸ ص ۹۷؛ التوضیح لابن الملقن ج ۱۷ ص ۷۷، ۷۸؛ عمدة القاری (السحر للطباعة والنشر) ج ۱۲ ص ۱۷۰؛ فتح الباری ج ۱۶ ص ۵۳۰؛ حاشیة التأودي ابن سودة علی البخاری ج ۶ ص ۳۷۱؛ الإذاعة لماکان وما یكون بین یدی الساعة ص ۷۴)

معاویہ کسی کو اپنا ولی عہد نہیں بنائے گا

بعض کتب میں قرآن و سنت کے ساتھ ساتھ خلفاء راشدین کی سیرت پر چلنے کی شرط بھی مذکور ہے اور بالخصوص یہ بھی مذکور ہے کہ معاویہ اپنے بعد کسی کو از خود اپنا ولی عہد نہیں بنائے گا بلکہ اہل اسلام کی مجلس شوریٰ جس کو چاہے گی اُسی کو امت پر خلیفہ بنائے گی۔ چنانچہ تردید و انقض میں شہرت یافتہ مصنف علامہ ابن حجر شافعی مکی اور علامہ ابن الصبار مالکی لکھتے ہیں:

هَذَا مَا صَلَّحَ عَلَيْهِ الْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ مَعَاوِيَةَ بْنُ أَبِي سُفْيَانَ ،
صَالِحَهُ عَلَى أَنْ يُسَلِّمَ إِلَيْهِ وَلَايَةَ الْمُسْلِمِينَ عَلَى أَنْ يُعْمَلَ فِيهِمْ بِكِتَابِ
اللَّهِ تَعَالَى وَسُنَّةِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَسِمْرَةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمُهَدِّدِينَ ،
وَلَيْسَ لِمَعَاوِيَةَ بْنِ أَبِي سُفْيَانَ أَنْ يُعْهَدَ إِلَى أَحَدٍ مِنْ بَعْدِهِ عَهْدًا ، بَلْ
يَكُونُ الْأَمْرُ مِنْ بَعْدِهِ شُورَى بَيْنَ الْمُسْلِمِينَ .

”یہ صلح نامہ ہے جس پر حسن بن علیؓ نے معاویہ بن ابوسفیان کے ساتھ صلح کی ہے، انہوں نے اس بات پر اُن سے صلح کی ہے کہ وہ مسلمانوں کی حکومت انہیں سونپ دیں گے، اس شرط پر کہ وہ مسلمانوں میں کتاب الہی، سنت نبوی اور ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سیرت کے مطابق عمل کریں گے، اور معاویہ بن ابوسفیان کو یہ اختیار نہیں ہوگا کہ وہ کسی سے اپنے بعد ولی عہدی کا معاہدہ کریں بلکہ یہ معاملہ اُن کے بعد مسلمانوں کی مجلس شوریٰ میں طے ہوگا۔“

(الصواعق المحرقة ص ۳۹۸، ۳۹۹، وط: ص ۳۹۹؛ الفصول المهمة في معرفة أحوال الأئمة

ص ۱۵۴، و ط: ج ۲ ص ۷۲۸، ۷۲۹

اس سے امام پاک کی دورانہ نشی ظاہر ہوتی ہے کہ اگر امام پاک معاویہ سے پہلے ہی دنیا سے چلے جائیں تو پھر معاویہ پر لازم ہوگا کہ وہ معاملہ خلافت کو شورائی کے سپرد کرے۔

اس سے بعض اُن نام نہاد حکماء امت کی بھی تردید ہوتی ہے جنہوں نے یزید کے ولی عہد بنائے جانے کو قرآن کے مطابق سنت انبیاء اور سنت ابی بکر لکھ مارا۔ اگر یہ معاملہ کتاب و سنت کے مطابق ہوتا تو سیدنا امام حسن ؓ کتاب و سنت کے خلاف کیوں شرط طے کرتے؟ اور معاویہ جس کی شان میں ”اللّٰهُمَّ عَلِّمْ مُعَاوِيَةَ الْكِتَابَ“ جیسی روایات بیان کی جاتی ہیں، وہ اس قسم کی غلط شرط کو کیوں تسلیم کرتے جو قرآن مجید، گزشتہ انبیاء کے طریقے اور خلیفہ اول سیدنا ابوبکر ؓ کی سنت سے ثابت ہوتی؟ وہ تو بر ملا امام حسن کو ٹوکتے ہوئے کہتے: اے حسن بن علی! خدا کا خوف کیجئے، آپ ایسی شرط کیوں عائد کر رہے ہیں جو کتاب و سنت کے خلاف ہے؟

خلفاء راشدین ؓ کے طریقے پر چلنا ہوگا

ابن حجر مکی کے کلام میں یہ شرط اس اہمیت کی حامل ہے کہ اس کا ذکر الگ عنوان سے کیا جائے۔ کتاب و سنت پر چلنے کی شرط کے ساتھ ساتھ سیدنا امام حسن مجتبیٰ ؓ کا ”وَسَيَرَةُ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ“ کا جملہ بھی باقاعدہ شامل رکھنا بڑی باریک بینی کی دلیل ہے، کیونکہ سب لوگ قرآن و سنت کے علوم سے بہرہ ور نہیں ہوتے لیکن اکثر لوگ پیشرو حکمرانوں کے اچھے اور برے طریقہ حکومت سے ضرور باخبر ہوتے ہیں۔

معاویہ کے بعد معاملہ شورائی طے کرے گی

مذکورہ الصدر شرط کی طرح شورائی والی شرط بھی اہمیت کی حامل ہے، لہذا اس کا ذکر بھی الگ عنوان سے کر رہا ہوں۔ سیدنا امام حسن مجتبیٰ ؓ نے اِن الفاظ میں اس شرط کو معاہدہ میں شامل کیا تھا:

وَلَيْسَ لِمُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِي سُفْيَانَ أَنْ يُعْهَدَ إِلَيَّ أَحَدٌ مِنْ بَعْدِهِ عَهْدًا،

بَلْ يَكُونُ الْأَمْرُ مِنْ بَعْدِهِ شُورَى بَيْنَ الْمُسْلِمِينَ.

”اور معاویہ بن ابوسفیان کو یہ اختیار نہیں ہوگا کہ وہ کسی سے اپنے بعد ولی عہدی کا معاہدہ کریں بلکہ یہ معاملہ اُن کے بعد مسلمانوں کی مجلس شوریٰ میں طے ہوگا۔“

(الصواعق المحرقة ص ۳۹۸، ۳۹۹، وط: ص ۳۹۹؛ الفصول المهمة في معرفة أحوال الأئمة

ص ۱۵۴، وط: ج ۲ ص ۷۲۸، ۷۲۹)

اس اہم شرط کی بھی دجیاں اڑائی گئی تھیں، جیسا کہ عنقریب تفصیل آئے گی۔

مولانا علیؒ پر سب و شتم نہیں کیا جائے گا

جو لوگ اہلبیت معاویہ کے گیت گاتے نہیں تھکتے، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جب سیدنا امام حسن مجتبیٰؑ نے تحفظِ خونِ مسلمین کی خاطر اقتدار معاویہ کو سپرد کرنا چاہا تو جہاں دوسری شرائط لکھی گئی تھیں وہیں اُس لائقِ وفا نیک اور ہادی و مہدی انسان کے ساتھ باقاعدہ ایک شرط یہ بھی طے کرنا ناگزیر سمجھا گیا تھا کہ وہ مولانا علیؑ پر سب و شتم سے باز آجائے گا۔ چنانچہ علامہ قلندر لکھتے ہیں:

وَكَانَ مَشْرُوطًا عَلَيْهِ أَنْ لَا يُسَبَّ عَلَيْهِ.

”اور اُس پر یہ شرط عائد کی گئی تھی کہ وہ سیدنا علیؑ کو برا نہیں کہے گا۔“

(مآثر الإنافة في معالم الخلافة ج ۱ ص ۱۰۸)

امام ابن اثیر جزری اور دوسرے حضرات لکھتے ہیں:

وَأَنْ لَا يُشْتَمَ عَلَيْهِ، فَلَمْ يُجَبَّ إِلَى الْكَفِّ عَنْ شَتْمِ عَلِيٍّ، فَطَلَبَ أَنْ لَا يُشْتَمَ وَهُوَ يَسْمَعُ فَأَجَابَهُ إِلَى ذَلِكَ ثُمَّ لَمْ يَفِ لَهُ بِهِ أَيْضًا.

”اور یہ کہ سیدنا علیؑ کو برا نہیں کہا جائے گا تو انہوں نے شتم علی سے باز رہنے

کی شرط کو قبول نہ کیا۔ پھر امام صاحب نے فرمایا کہ جب وہ سن رہے ہوں تو انہیں برا

نہ کہا جائے تو اس بات کو معاویہ نے قبول کر لیا، پھر اس کو بھی پورا نہ کیا۔“

(الكامل في التاريخ ج ۳ ص ۶؛ المختصر في أخبار البشر ج ۱ ص ۱۸۳؛ تاريخ دمشق ج ۱۲

ص ۲۶۴، العبر فی اخبار من غیر للذهبی ج ۱ ص ۳۵، وط: ص ۴۸، البدایة والنهاية ج ۱ ص

۱۳۲، ۱۳۳، تاریخ ابن الوردي ج ۱ ص ۱۶۶)

سب دشم سے باز آنے کی شرط کو تو کیا بادشاہ سلامت نے کسی بھی شرط کو پورا نہیں کیا تھا، جیسا کہ عنقریب اس بات کی تصریح آرہی ہے۔

کچھ مالی شرائط

اکثر کتب میں اس موقع پر بعض مالی شرائط کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

فَأَشْرَطَ أَنْ يَأْخُذَ مِنْ بَيْتِ مَالِ الْكُوفَةِ خَمْسَةَ آلَافِ أَلْفٍ دِرْهَمٍ ،
وَأَنْ يَكُونَ دَارُ أَهْلِ جَرْدَ لَهُ ، وَأَنْ لَا يُسَبَّ عَلَيَّ وَهُوَ يَسْتَعُ ، فَإِذَا فَعَلَ
ذَلِكَ نَزَلَ عَنِ الْأُمُورِ لِمُعَاوِيَةَ ، وَيَخْلُقُ دِمَاءَ الْمُسْلِمِينَ .

”امام حسن ؑ نے شرائط عائد فرمائیں کہ وہ کوفہ کے بیت المال سے پانچ لاکھ درہم لیں گے اور دارا بگردان کے لیے ہوگا اور یہ کہ جب وہ سن رہے ہوں تو سیدنا علی ؑ کو سب دشم نہیں کیا جائے گا، پس جب یہ شرائط قبول کی جائیں گی تو وہ معاویہ کے لیے اتر جائیں گے اور مسلمانوں کے خون کو محفوظ بنائیں گے۔“

(البدایة والنهاية ج ۱ ص ۱۳۲، ۱۳۳)

شرائط مذکورہ پر عمل کتنا ہوا؟

سیدنا امام حسن مجتبیٰ ؑ اور معاویہ کے درمیان طے پانے والے معاہدہ کی جو موٹی موٹی شرائط اب تک ذکر کی گئیں وہ حسب ذیل ہیں:

- ۱۔ خلافت پھر امام حسن کو لوٹا دی جائے گی
- ۲۔ کتاب و سنت کے مطابق چلنا ہوگا
- ۳۔ خلفاء راشدین ؑ کے طریقے پر چلنا ہوگا

۴۔ معاویہ کے بعد خلافت کا معاملہ شوریٰ طے کرے گی

۵۔ مولا علیؓ پر سب و شتم نہیں کیا جائے گا

۶۔ کچھ مالی شرائط

پہلی شرط کی دھجیاں کیسے اڑائی گئیں؟

ان میں سے کس شرط پر کتنا عمل ہوا؟ آئیے! خود ہی دیکھ لیجئے۔ پہلی شرط یہ تھی کہ خلافت پھر امام حسن کو لوٹادی جائے گی اس پر یوں عمل ہوا کہ موصوف نے اپنی موت سے دس گیارہ برس قبل ہی یزید کی ولی عہدی کے لیے کوششیں شروع کر دی تھیں۔ چنانچہ امام ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وَكَانَ مُعَاوِيَةُ قَدْ أَشَارَ بِالتَّبَعَةِ إِلَى يَزِيدَ فِي حَيَاةِ الْحَسَنِ ، وَعَوَّضَ بِهَا وَلَكِنَّهُ لَمْ يَكْشِفْهَا وَلَا عَزَمَ عَلَيْهَا إِلَّا بَعْدَ مَوْتِ الْحَسَنِ .

”معاویہ امام حسن مجتبیٰؓ کی حیات میں ہی یزید کی بیعت کی طرف اشاروں سے کام لیتا تھا لیکن اُس نے اس پر عزم امام حسنؓ کی شہادت کے بعد کیا تھا۔“

(الاستیعاب ج ۱ ص ۲۴۳)

یاد رہے کہ امام ابن اثیر اور حافظ ابن کثیر نے امام حسنؓ کی شہادت ۴۹ھ میں لکھی ہے۔

(الکامل فی التاريخ ج ۳ ص ۵۸، البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۳۲)

صلح نامہ میں معاہدہ یہ طے پایا تھا کہ معاویہ اپنے بعد کسی کو اپنا ولی عہد مقرر نہیں کریں گے مگر انہوں نے اپنی وفات سے گیارہ بارہ سال قبل ہی اس معاہدہ کی خلاف ورزی شروع کر دی تھی اور اس پر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ انہیں یزید کی ولی عہدی اس قدر محبوب تھی کہ امام حسن مجتبیٰؓ کو زہر سے شہید کیا گیا تو موصوف کو قلبی راحت حاصل ہوئی اور اُن کی اچانک شہادت کو مصیبت ہی نہ سمجھا، جیسا کہ ہم اس قبل سنن ابی داؤد وغیرہ سے صحیح حدیث نقل کر چکے ہیں۔

دوسری شرط کا حشر و نشر

دوسری شرط یہ تھی کہ کتاب و سنت کے مطابق چلنا ہوگا اس کو پہلی شرط کی عدم تکمیل سے ہی جانا جاسکتا ہے۔ کتاب و سنت میں جس قدر عہد کی پاس داری پر زور دیا گیا ہے وہ اہل علم پر مخفی نہیں، تاہم اس سلسلے میں کچھ تصریحات اس بحث کے اختتام پر پیش کی جائیں گی۔ علاوہ ازیں موصوف کے دور میں سود، شراب، قتل ناحق، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور یمن وغیرہ پر ناحق چڑھائی کی گئی اور مسلم خواتین تک کو لوٹڑی بنایا گیا۔ کیا یہ کتاب و سنت پر عمل ہے؟ بعض علماء کرام نے تو موصوف کو اس سے قبل یعنی ۳۷ھ میں ہی قرآن و سنت کا تارک قرار دیا ہے، جیسا کہ کتاب طحا کے ابتدائی صفحات میں ملا علی قاری کی طویل عبارت گزر چکی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے راقم الحروف کی کتاب ”الاحادیث الموضوعة في فضائل معاوية“ کا مطالعہ کیا جائے۔

تیسری شرط کا استیاناس

شرط سوم یہ تھی کہ خلفاء راشدین ؓ کے طریقے پر چلنا ہوگا، اس شرط کا ایسا استیاناس کیا گیا کہ قیامت تک اُس کی نحوست جاری و ساری رہے گی۔ خلفاء راشدین ؓ میں سے ہر ایک کی اولاد اُن کے وصال کے وقت عاقل، بالغ، صالح اور لائق موجود تھی مگر اُن میں سے کسی نے بھی اپنے لائق فرزند کو اپنا ولی عہد بنانا مناسب نہ سمجھا جبکہ موصوف اپنے شرابی، کبابی، زانی اور نالائق بیٹے کو اپنے زمانہ صحت ہی میں اپنا ولی عہد بنا گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اولاً تو اہل اسلام کے سیاسی گروپ بنے اور پھر وہی سیاسی گروپ مذہب میں تبدیل ہو گئے، اور آج تک شیعہ، نواصب، خوارج اور روافض کا دنگا فساد اُسی ولی عہدی کی نحوست ہی کی وجہ سے چل رہا ہے اور قیامت تک چلے گا۔ اگر اہل تحقیق و دانش لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ سارے فرقے اور مذہبی دنگا فساد اُس دور سے لے کر تاحال جاری ہے تو پھر یہاں اُس فرمان نبوی ﷺ میں ایک مرتبہ پھر غور فرمائیے جو اس سے قبل بھی ذکر ہو چکا ہے:

إِذَا رُبِنَ الْأَمْرُ إِلَى غَيْرِ أَهْلِهِ فَلَا تَنْظُرُوا السَّاعَةَ.

”جب معاملہ نالائق کو سونپ دیا جائے تو قیامت کا انتظار کرو۔“

(بخاری ص ۱۶ حدیث ۵۹)

خلفاء راشدین کی سیرت پر چلنے کی شرط کیوں؟

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے خلفاء راشدین کی سیرت پر عمل پیرا ہونے کی شرط کو جو لازم رکھا اسی میں ساری خیر تھی اور معاویہ اس سیرت سے بے خبر نہیں تھے مگر حیرت ہے کہ انہوں نے شرائط معاہدہ کو تسلیم کر لینے کے باوجود اس سیرت پر عمل نہ کیا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں:

”حضرت معاویہ خلافتِ خاصہ کے بعض مقاصد جانتے تھے مگر ان کو اجراء نہ کر سکے۔“

(ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء ج ۱ ص ۵۷۴)

یعنی خلفاء راشدین کی مکمل سیرت پر چلنا تو کجا انہوں نے بعض مقاصد پر بھی عمل نہ کیا۔ شاہ صاحب ایک اور مقام میں لکھتے ہیں:

لَا نَنْتَه كَانْ عَلَى سِيْرَةِ الْمُلُوْك ، لَا عَلَى سِيْرَةِ الْخُلَفَاءِ قَبْلَهُ .
”اس لیے کہ وہ بادشاہوں کے طریقے پر تھے، اپنے پیشرو خلفاء کرام کی طرف سے طریقہ پر نہیں تھے۔“

(حجة الله البالغة ج ۲ ص ۵۸۱ و ط: ج ۲ ص ۳۳۱)

علامہ پر ہاروی کی تضاد بیانی

اس سلسلے میں علامہ عبدالعزیز پر ہاروی کا یہ اعترافی کلام بھی قابل ذکر ہے، وہ اپنے ممدوح کے دفاع میں لکھتے ہیں:

وَأَمَّا مُعَاوِيَةُ فَهُوَ وَإِنْ لَمْ يَرْكَبْ مُنْكَرًا لِكِنَّهُ تَوَسَّعَ فِي الْمُبَاحَاتِ
وَلَمْ يَكُنْ فِي دَرَجَةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ فِي أَذَاءِ حُقُوقِ الْخِلَافَةِ ، لَكِنْ
عَدَمُ الْمَسَارَاةِ بِهِمْ لَا يُوجِبُ قَدْحًا فِيهِ .

”رہے معاویہ تو وہ اگرچہ کسی برائی کے مرتکب نہیں ہوئے لیکن انہوں نے مباحات میں وسعت کر دی تھی اور وہ حقوق خلافت کی ادائیگی میں خلفاء راشدین کے درجہ میں نہیں تھے، لیکن اُن کی خلفاء راشدین ؓ کے ساتھ عدم مساوات اُن کے بارے میں کسی قسم کے عیب کا موجب نہیں۔“

(النبراس علی شرح العقائد ص ۵۱۰)

کیا ”وَلَمْ يَكُنْ لِي ذَرْجَةُ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ“ (وہ خلفاء راشدین کے درجہ میں نہیں تھے) کے الفاظ سے اُن کے لیے یا کسی بھی بادشاہ کے لیے تمام منکرات مباح ہو سکتے ہیں؟ پھر ہاروی صاحب کا یہ جملہ ”وَإِنْ لَمْ يُوَكِّبْ مُنْكَرًا“ (وہ اگرچہ کسی برائی کے مرتکب نہیں ہوئے) کس قدر خلاف واقعہ ہے؟ ذرا انصاف تو فرمائیے کہ اہل بیت کرام ؑ علیہم السلام پر سب دشمن کرنا، سیدنا حجر بن عدی اور اُن کے رفقاء ؓ کو ناحق قتل کرنا، خلیفہ راشد کے خلاف بغاوت کرنا، خطبہ عیدین کو نماز عید پر مقدم کرنا، امام حسن مجتبیٰ ؑ کے ساتھ کیے ہوئے تمام وعدوں کو پس پشت ڈال دینا اور نظام انتخاب کو موروثیت میں تبدیل کرنا وغیرہ امور منکرات (برائیاں) نہیں تو کیا معروفات (بھلائیاں) ہیں؟

علامہ ہاروی صاحب اور اُن جیسے دوسرے لوگوں سے پوچھا جائے کہ اگر کوئی غیر صحابی شخص خلفاء راشدین ؓ کے طرز پر حقوق خلافت ادا کرنے میں کامیاب ہو جائے تو کیا اُس کی ایسی کامیابی اُس کی فضیلت کا موجب ہوگی یا نہیں؟ اگر جواب ہاں میں ہو تو پھر کسی صحابی کہلانے والے شخص کا خلفاء راشدین ؓ کے طرز عمل پر پورا نہ اُترنا، یا اُن کی سیرت سے منحرف ہو کر کتاب و سنت کا تارک ہونا اُس کے لیے موجب عیب کیوں نہیں ہوگا؟

تعجب ہے کہ علامہ ہاروی اور اُن کی مثل دوسرے لوگ ایک طرف تو معاویہ بن ابی سفیان کو نجات، مجتہد، حاوی اور محمدی قرار دیتے ہیں اور اکابر صحابہ کرام ؓ کی شان میں وارد شدہ احادیث میں شامل کرتے ہیں، جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے

قَدْ صَرَّحَ عُلَمَاءُ الْحَدِيثِ بِأَنَّ مُعَاوِيَةَ ؓ مِنْ كِبَارِ الصَّحَابَةِ

وَنَجَسَانِيَهُمْ وَمُجْتَهِدِيَهُمْ ، وَلَوْ سَلِمَ أَنَّهُ صِفَارُكُمْ فَلَا شَكَّ فِي أَنَّهُ دَخَلَ
فِي غُنَوَانِ الْأَحَادِيثِ الصَّحِيحَةِ الْوَارِدَةِ فِي تَشْرِيفِ الصَّحَابَةِ ، بَلْ قَدْ
وَرَدَ لَيْدٌ بِخُصُوصِهِ أَحَادِيثُ كَقَوْلِهِ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ: اللَّهُمَّ اجْعَلْهُ
هَادِيًا مَهْدِيًا وَاهِدًا بِهِ.

”علماء حدیث نے تصریح فرمائی ہے کہ معاویہ ؓ کبار صحابہ کرام میں سے ہیں
(دحشی، ابوسفیان اور بسر بن ابی ارطاة بھی طلقاء میں سے تھے، اگر انہیں سلطنت ملتی تو
وہ بھی کبار صحابہ میں شمار کیے جاسکتے ہوتے۔ فیضی) اور صحابہ کے نجات اور مجتہدین میں
سے ہیں۔ اگر انہیں اصغر صحابہ کرام میں سے بھی تسلیم کیا جائے تب بھی اس بات
میں کوئی شک نہیں کہ وہ ان احادیث کے عموم میں شامل ہیں جو صحابہ کرام ؓ کی عزت
افزائی میں وارد ہوئیں، بلکہ ان کی شان میں بالخصوص بھی احادیث نبویہ وارد ہوئی ہیں
جیسا کہ آپ ﷺ کی یہ دعا: اے اللہ! اُس کو ہادی اور مہدی بنا دے اور اُس کے
ذریعے دوسروں کو ہدایت دے۔“

(النبراس علی شرح العقائد، ص ۵۵۰)

جبکہ دوسری طرف موصوف کہتے ہیں کہ اگر وہ حقوق خلافت کی ادائیگی میں خلفاء راشدین ؓ کے
مساوی نہیں ہو سکے تو یہ بات ان کے بارے میں موجب عیب نہیں، کیونکہ وہ خلفاء راشدین ؓ کے درجہ میں
نہیں تھے۔

قارئین کرام خود انصاف فرمائیں کہ یہ کیسی تاویلات ہیں؟ یہ عاجز کچھ کہنے کی جسارت کرنے سے
قاصر ہے، البتہ میرے ذہن میں اس وقت شتر مرغ کی وہ کہانی گردش کر رہی ہے جو بچپن میں پڑھی تھی۔
فَتَأَمَّلْ!

نوٹ:

حدیث ترمذی: ”اللَّهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مَهْدِيًا وَاهِدًا بِهِ“ موضوع ہے، تفصیل کے لیے راقم

الحروف کی کتاب ”الاحادیث الموضوعة فی فضائل معاویة“ کا مطالعہ فرمائیے۔

خلیفہ اور ملک (بادشاہ) میں زمین و آسمان کا فرق

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی بصیرت پر قربان، انہوں نے معاویہ کے ساتھ خلفاء راشدین علیہ السلام کی سیرت پر چلنے کا معاہدہ لکھوا کر موصوف کو دنیا و آخرت میں جواب دہ بنا دیا ہے۔ امام پاک علیہ السلام پر ان کی بصیرت کی بدولت روشن تھا کہ خلفاء راشدین علیہ السلام کے طرز پر چلنا معاویہ کے بس کا روگ ہی نہیں، اس لیے انہوں نے معاہدہ میں کتاب و سنت پر چلنے کی شرط کے ساتھ ساتھ یہ شرط بھی باقاعدہ لکھوائی تھی تاکہ اتمام حجت ہو جائے۔ اب جو لوگ ایک طرف تو معاویہ بن ابی سفیان کو خلیفہ کہتے ہیں اور جملہ صحابہ کے فضائل میں شریک مانتے ہیں اور دوسری طرف جب دیکھتے ہیں کہ وہ خلفاء راشدین کی سیرت پر نہیں چلے تو پھر کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ کوئی بات نہیں، کیونکہ وہ تو بادشاہ تھے۔ انہیں چاہیے کہ وہ کوئی ایک بات کریں، اس لیے کہ بادشاہت اور خلافت میں انیس بیس کا فرق نہیں بلکہ زمین و آسمان سے بھی زیادہ فرق ہے۔ چنانچہ مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب لکھتے ہیں:

”باقی رہے امیر معاویہ، ہر چند کہ ان کو بظاہر تمکین میسر آئی، لیکن حقیقت میں وہ تمکین دین نہ تھی، تمکین ملک و سلطنت تھی۔ چنانچہ واقفان فن سیر پر پوشیدہ نہیں کہ خلفائے اربعہ کے اطوار اور انداز اور امیر معاویہ کے اطوار و انداز میں زمین و آسمان کا فرق تھا، ان کی گزران فقیرانہ اور زاهدانہ تھی اور امیر معاویہ کا طور ملوک کا سا تھا، اس لیے اہل سنت ان کو باوجودیکہ صحابی سمجھتے ہیں خلفاء میں نہیں گنتے، ملوک میں شمار کرتے ہیں۔“

(هدية الشيعة ص ۶۶)

”زمین و آسمان کا فرق“ سے کیا مراد ہے؟ یہ بات علامہ نانوتوی صاحب کی بعض دوسری تصانیف کے اقتباسات سے سمجھی جاسکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”یہ صحیح ہے کہ سنی اصحاب اربعہ یعنی چار یار کو بترتیب معلوم چالیسین حضرت سید المرسلین

صلی اللہ علیہ وعلی آلہ اجمعین سمجھتے ہیں اور خلیفہ راشد اعتقاد کرتے ہیں، پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید پلید اور عبد الملک وغیرہ کوسنیوں میں کوئی بھی خلیفہ راشد نہیں سمجھتا۔

(اجوبہ اربعین للنانوتوی ص ۱۸۵)

موصوف کچھ آگے چل کر لکھتے ہیں:

”بالجملہ اہل سنت خلیفہ سبھی کو کہہ دیا کرتے ہیں، اس لفظ میں کچھ بزرگی نہیں، اس کے معنی فقط جانشین کے ہیں، سو تمہیں کہو کہ اس میں کیا بزرگی ہے؟ اگر کسی نیک آدمی کی جگہ کوئی بد معاش بیٹھ جائے تو اُس کو جانشین تو ضرور کہیں گے پر اُس میں کچھ بزرگی نہ لکھے گی، ہاں لفظ راشد بزرگی پر دلالت کرتا ہے۔ اس صورت میں خلیفہ کی دو قسمیں ہوں گی: ایک خلیفہ راشد، یہ تو چار یا ار پانچویں چھ مہینے کے لیے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ ہو گئے تھے۔ دوسرا خلیفہ غیر راشد، اور خلیفہ غیر راشد کو بادشاہ اور ملک بھی سنیوں کی اصطلاح میں کہتے ہیں۔ یزید اور عبد الملک وغیرہ سب اسی قسم کے ہیں، ہاں عمر بن عبد العزیز البتہ مردانوں میں سے خلیفہ راشد ہوئے ہیں۔“

(اجوبہ اربعین للنانوتوی ص ۱۸۵)

علامہ نانوتوی صاحب کا مذکورہ بالا جملہ جو ان الفاظ سے شروع ہو رہا ہے ”اہل سنت خلیفہ سبھی کو کہہ دیا کرتے ہیں“ انتہائی قابل توجہ ہیں۔ انہوں نے خوب فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص خلافت راشدہ کی طرح حکومت نہیں کر سکا یعنی خلیفہ راشد نہیں بن سکا تو وہ خلیفہ نہیں بلکہ ملک اور بادشاہ ہے۔ لوگ اُس کو جو القاب دیتے رہیں اُس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ بہر حال ابن محرز خلیفہ تھے یا بادشاہ؟ وہ جو کچھ بھی تھے کتاب و سنت کا فقط اُن سے نہیں بلکہ ہر دور کے مسلمانوں سے ہر حال میں یہ تقاضا ہے کہ مسلمان کتاب و سنت اور انعام یافتہ طبقات کے طریقے پر چلیں، بلکہ سورۃ التوبہ کی آیت نمبر سو (۱۰۰) کے مطابق جو لوگ مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہ کے بعد مسلمان ہوئے اُن پر بھی اور قیامت تک آنے والے تمام مسلمانوں پر بھی مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہ کی اتباع بطور شرط فرض کی گئی ہے، لہذا جو شخص حاکم ہو اُس کے لیے ایسی سیرت عامۃ الناس کی نسبت زیادہ

لازم ہوتی ہے، کیونکہ ”النَّاسُ عَلَى دِينٍ مُلُوكِهِمْ“ (لوگ بادشاہوں کے طریقے پر ہوتے ہیں) اور پھر جس نے معاہدہ کیا ہو اور معاہدہ کی شرائط میں باقاعدہ مرقوم شرط کو تسلیم کیا ہو کہ اُسے خلفاء راشدین ؑ کی سیرت پر چلنا ہوگا تو اُس پر اور بھی زیادہ ذمہ داری اور پابندی عائد ہو جاتی ہے، جبکہ معاویہ نے نہ صرف یہ کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ ؑ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ خلفاء راشدین ؑ کی سیرت پر چلے گا بلکہ لوگوں نے بھی اُس کی بیعت اسی شرط پر کی تھی۔ چنانچہ محدث ابن ابی عاصم لکھتے ہیں:

قَالَ رَجَاءُ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَوْفٍ ، وَكَانَ النَّاسُ أَخَذُوا عَلَيْهِ جَمْعَ بَأْيُهُمْ أَنْ يُسِيرَ بِهِمْ سِيرَةَ عُمَرَ .

”رجاء عبد اللہ بن عوف سے نقل کرتے ہیں کہ لوگوں نے معاویہ کی بیعت کرتے ہوئے اُس سے عہد لیا تھا کہ وہ انہیں سیرت عمر ؓ پر چلائیں گے۔“

(الاحاد والمثنائی لابن ابی عاصم ج ۱ ص ۳۷۶ حدیث ۵۰۲)

لیکن وہ ایسے تمام معاہدات کے باوجود سیرت خلفاء راشدین ؑ سے منحرف ہی رہے۔

بعض نامور علماء کا تکلف

بعض نامور اور قد آور علماء نے خلفاء راشدین ؑ کی سیرت سے انحراف کو معاویہ بن ابی سفیان کے لیے نرم بنانے کی کوشش کرتے ہوئے لکھا ہے:

”تاریخی حقائق اور خاص طور پر اُس پیچیدہ اور مبہم دور کو سامنے رکھتے ہوئے جو حضرت عثمان ؓ کی شہادت کے بعد پیش آیا اور اسلامی معاشرہ پر اندرونی و بیرونی بدلتے ہوئے حالات کا جو ردِ عمل ہوا، اُن سب کا جائزہ لینے سے جو بات نظر آتی ہے، وہ یہ کہ حضرت معاویہ ؓ کو لوگوں کی نفسیات پہچاننے کا ملکہ اور عرصہ دراز تک حکومت مکرانے کا جو تجربہ تھا، اُس نے اُن کو یقین دلایا کہ اُس وقت کے اسلامی معاشرہ کی قیادت اور وسیع اسلامی مملکت کی سربراہی (جس کے عناصر میں تنوع پیدا ہو چکا تھا اور جس کو چند در چند مسائل و مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا) خلافتِ راشدہ کے اُن خطوط

پر قائم نہیں رکھی جاسکتی تھی، جن پر خلفاء ثلاثہ ؓ چلتے رہے، اور جن کو پوری طاقت سے نبھاتے رہے۔ حضرت معاویہ اس بات پر مطمئن ہو گئے کہ وقت کا تقاضا یہی ہے کہ اسلامی مملکت کو خطرات سے محفوظ رکھا جائے، امن و امان قائم رہے، غزوات و فتوحات کا سلسلہ جہاں تک جاری رہ سکتا ہے اُس کو جاری رکھا جائے اور اس کی خاطر اگر ایک شخص موردِ مکرِ عادلِ حکومت قائم ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے، حکومت اسلامی تعلیمات کے تابع ہو مگر اُس میں پلک ہو اور شریعت کا پاس و احترام بھی امکانی حد تک قائم رہے، حکومت کے انتظامیہ اور حکومت چلانے کے طریقے اور لوگوں سے معاملت کرنے کے اصول میں توسع سے کام لیا جائے۔ اگر ضرورت و حالات اس کے متقاضی ہیں تو اس میں کوئی نقصان نہیں ہے، مملکت تو دائرۂ اسلام سے باہر نہیں جائے گی (جس کی نوعیت اب ایک بڑی سلطنت کی ہو چکی ہے، اور وہ مختلف نسلوں، تہذیبوں اور مذاہب کے ماننے والے عناصر پر مشتمل ہے) ہوشیاری اور پلک کے ساتھ معاملات سلجھائے جائیں اور جو مشکلات سامنے آئیں اُن کو حل کرنے میں حکمتِ عملی اور مصلحتِ وقت سے مدد لی جائے، وقت و مقام کے اختلاف کو پیش نظر رکھا جائے، لہذا اُنہوں نے اپنی حکومت ایک مسلمان فوجی و انتظامی سربراہ کی حیثیت سے قائم کر لی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی پیش گوئی بھی فرمادی تھی:

خلافة النبوة ثلاثون سنة ثم يعطي الله الملك (أو ملكه) من يشاء .

خلافت علی منہاج النبوة تیس (۳۰) سال رہے گی اس کے بعد اللہ ملک جس کو چاہے گا دے دے گا، ایک روایت میں ہے: اپنا ملک جس کو چاہے گا دے دے گا۔

حضرت معاویہؓ کو خود بھی اس کا دعویٰ نہ تھا کہ اُن کی حکومت خلفاء ثلاثہ (حضرات ابو بکر و عمر و عثمان ؓ) کی خلافت کی طرح خلافتِ راشدہ ہے، وہ صفائی کے ساتھ فرماتے تھے کہ وہ ایک حاکم اور والی سلطنت ہیں، البتہ اُن کے بعد جو حکام اور والی بن سلطنت

آئیں گے اُن کے طرز عمل کو دیکھ کر اُن کی قدر آئے گی اور کھلا فرق محسوس ہوگا۔“

(المرتضیٰ ص ۳۱۷، ۳۱۸)

ارباب عقل و فکر سے التماس ہے کہ وہ پہلے علامہ سید ابوالحسن علی ندوی کی اس عبارت میں غور فرمائیں کہ کس طرح انہوں نے معاویہ بن ابی سفیان کی حکومت کے لیے ”النُّكْحَةُ بَعْدَ الْوُقُوعِ“ کے طور پر خلافتِ راشدہ سے انحراف کو جواز فراہم کرنے کی کوشش کی ہے؟ پھر وہ ندوی صاحب کی بعض کتب سے بنو امیہ ہی کے بعض حکمرانوں کی جائز مدح و ثناء پر مبنی کلام میں بھی غور فرمائیں اور خود ہی انصاف فرمائیں کہ اُس وقت جب اسلامی مملکت مزید وسیع ہو گئی تھی اور حالات مزید بگڑ چکے تھے مگر تمام تر بگاڑ کے باوجود بنو امیہ ہی کے ایک فرد نے فقط ڈھائی برس میں خلافتِ راشدہ کا وہ دور لوٹا دیا تھا جس کو معاویہ بن ابی سفیان جیسے کہنہ مشق اور ماہر نفسیات قائم ہی نہیں رکھ سکے تھے۔ آئیے ذرا غور سے علامہ ندوی کی تحریر کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے اور لکھتے ہیں:

”عمر بن عبدالعزیزؒ نے زمامِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی بلا تاخیر اُن چند عمالِ حکومت کو معزول کیا جو سخت ظالم اور ناخدا ترس تھے۔ اُن کے سامنے شاہی تزک و احتشام اور جانشینی کا جو سامان پیش کیا گیا اس کو بیت المال میں داخل کیا، اور اُسی گھڑی سے اُن کی سیرت یکسر بدل گئی، اب وہ (اپنے پیش رو) سلیمان کے جانشین نہ تھے بلکہ امیر المومنین عمر بن الخطابؓ کے جانشین تھے، جواری اور باندیوں کو تحقیق کے بعد اُن کے خاندانوں اور شہروں کو واپس کر دیا، مظلوم کا تصفیہ کیا، اور اپنی مجلس کو جس نے کسرٹی و قیصر کے دربار کی حیثیت اختیار کر لی تھی، سنت اور خلافتِ راشدہ کے نمونہ پر سادہ اور مطابق سنت بنادیا، اپنی جاگیر مسلمانوں کو واپس کر دی، بیوی کا زیور بیت المال میں داخل کیا، انہوں نے ایسی زاهدانہ زندگی اختیار کی جس کی نظیر بادشاہوں میں تو کیا مل سکتی ہے، درویشوں اور فقراء میں بھی ملتی مشکل ہے۔“

موصوف ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں:

”اس زائدانہ زندگی اور تقویٰ و احتیاط کے ماسوا انہوں نے حکومت کی روح بدل دی، پہلا اور بنیادی انقلاب یہ تھا کہ انہوں نے حکومت کا نقطہ نظر بدلا، اُس وقت حکومت محاصل و خراج وصول کرنے اور صرف کرنے کا ایک انتظامی ادارہ تھا، جس کو جمہور کے اخلاق و عقائد، سیرت و تربیت اور ضلالت و ہدایت سے کچھ بحث نہ تھی، اسی نقطہ کے گرد اس کا سارا نظام گردش کرتا تھا، انہوں نے اپنے اس مشہور تاریخی فقرے سے کہ:

محمد ﷺ دنیا میں ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے، تحصیل دار بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔ حکومت کا مزاج اور نقطہ نظر ہی تبدیل کر دیا، اور اس کو دنیاوی حکومت کے بجائے خلافت نبوت بنا دیا۔“

(تاریخ دعوت و عزیمت ج ۱ ص ۳۵، ۳۷، رجال الفكر والدعوة ج ۱ ص ۷۰، ۷۴)

قارئین کرام سے گزارش ہے کہ علامہ ابوالحسن ندوی کی دونوں کتابوں کے اقتباسات کو بار بار پڑھئے اور موازنہ کیجئے کہ کتنا فرق ہے؟ اگر کسی شخص کو زیادہ فرق محسوس نہ ہو تو وہ اتنا ہی سمجھ لے کہ معاویہ بن ابی سفیان کو خلافت راشدہ کے فوراً بعد حکومت ملی تو انہوں نے اُس کو خلافت علی منہاج النبوة کی بجائے دنیوی حکومت بنا دیا اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کو معاویہ اور اُن کے بعد والے حکمرانوں کی بگڑی ہوئی دنیوی اور کسریٰ و قیصر کی طرز پر چلنے والی حکومت ملی تو انہوں نے اس کو فقط اڑھائی سال کے عرصہ میں پھر سے خلافت علی منہاج النبوة کی طرز پر چلا دیا۔

علامہ سید ابوالحسن علی ندوی ایک معتدل، منجھے ہوئے اور مدبر قلم کار تھے مگر افسوس کہ انہوں نے خلافت راشدہ کے منافی ایک دنیوی سلطنت کو جواز فراہم کرنے کی ناجائز کوشش میں مبتلا ہو کر اپنے مقام و مرتبہ کا خیال نہ کیا۔

خلیفہ اور بادشاہ کے لیے الگ الگ قانون؟

معاویہ بن ابی سفیان نے جو خلافت راشدہ سے عملاً انحراف کیا اور اُس کو علامہ ابوالحسن علی ندوی نے

جو از فراہم کرنے کی جوتا جائز کوشش کی، کیا اس سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ معاویہ یا کسی بادشاہ سے اس کی افراط و تفریط پر اس لیے حساب نہیں لیا جائے گا کہ وہ خلیفہ نہیں بلکہ بادشاہ تھے، اور کیا معاویہ نے امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام سے کیے گئے معاہدہ کی جو پاسداری نہ کی، اس کا بھی فقط اس لیے حساب نہیں ہوگا کہ وہ تو بادشاہ تھے؟

اس وعدہ خلافی کی وجہ سے جو بھی انک حالات پیدا ہوئے اور جن کے اثرات تا حال جاری ہیں، کیا علامہ ندویؒ وغیرہ کی تقاریر و تحاریر سے اس کی تلافی ہو سکتی ہے؟
کیا اس قسم کی تقریر و تحریر کو پیش کر کے علامہ الغیوب علیہ السلام کی بارگاہ سے جان چھوٹ جائے گی؟
یہ جو قرآن مجید میں ہے:

وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا

”اور پورا کیا کرو اپنے عہد کو، بے شک وعدوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔“

(بنی اسرائیل: ۳۴)

کیا اس مطلق سوال سے بادشاہ مستثنیٰ ہوگا اور کوئی بادشاہ یہ کہہ کر جان چھڑا سکے گا کہ وہ تو محض حاکم اور والی سلطنت تھا اور خلیفہ نہیں تھا، لہذا اس سے باز پرس کیسی؟
فرض کیا اگر کوئی شخص کاتب وحی رہا ہو اور اس نے دوسری آیات کے ساتھ ساتھ مذکورہ آیت کی کتابت بھی کی ہو تو بتلائیے! وہ ایسے سوالات سے مستثنیٰ ہوگا یا وہ دوسروں کی بنسبت زیادہ جواب دہ ہوگا؟
کیا قیامت کے دن ”خلافة النبوة لثلاثون سنة“ وغیرہ احادیث پیش کر کے وعدہ خلافی کے سوال سے استثناء مل جائے گا؟

کیا تقدیر کا بہانہ چلے گا؟

سید ابوالحسن علی ندوی نے جو ”خلافة النبوة لثلاثون سنة“ حدیث پیش فرمائی ہے، کیا معاویہ بن ابی سفیان نے اسی حدیث کو مد نظر رکھتے ہوئے خلافت علی منہاج النبوة کا رخ موروثی سلطنت کی طرف موڑا تھا؟ اگر کہا جائے کہ ہاں تو پھر سوال ہوگا کہ اگر از خود موڑا تھا تو یہ بہت بڑا جرم ہے اور اگر حالات ہی ایسے

ہو گئے تھے تو کیا انہوں نے مزاحمت کی تھی؟ اگر نہیں کی تھی تو پھر بھی بڑا جرم ہے، اور قیامت کے دن قطعاً کسی بھی شخص کا کسی بھی جرم پر تقدیر کا بہانہ نہیں چلے گا۔ بندے کا اُس کے اعمال پر ہی محاسبہ ہوگا۔ چنانچہ ارشاد الہی ہے:

وَقُلْ اَعْمَلُوا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ وَسَتُرَدُّونَ
اِلٰى عَالَمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ.

”اور فرمائیے! عمل کرتے رہو، پس دیکھے گا اللہ تعالیٰ اور اُس کا رسول اور تمام
مومنین تمہارے عمل کو، اور لوٹائے جاؤ گے تم اُس کی طرف جو جاننے والا ہے ہر پوشیدہ
اور ظاہر کا، پس وہ آگاہ کر دے گا تمہیں اُس سے جو تم کیا کرتے تھے۔“

(التوبہ: ۱۰۵)

مومنین عمل کو دیکھتے ہیں اور دیکھتے رہیں گے، وہ تقدیر کو نہیں دیکھ سکتے۔ کسی بندے کو خود معلوم ہی
نہیں ہوتا کہ آئندہ لمحہ میں اُس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے، البتہ وہ اپنے عزم کے ساتھ جو کر گزرتا ہے اُسی پر
وہ جوابدہ ہوگا۔ اس لیے بندہ تقدیر کا نہیں اعمال کا پابند ہے۔ اس حقیقت کو علامہ ندوی کے ممدوح مفکر اسلام
علامہ ڈاکٹر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے بہت عمدہ انداز میں سمجھایا ہے، وہ فرماتے ہیں۔

پابندی تقدیر کہ پابندی احکام؟
یہ مسئلہ مشکل نہیں، اسے مردِ خردمند
اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر
ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش، ابھی خورسند
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکام الہی کا ہے پابند

(ضربِ کلیم ص ۶۴؛ کلیاتِ اقبال اردو ص ۵۲۶)

شوری کی شرط کا کیا حشر ہوا؟

سیدنا امام حسن مجتبیٰ ؑ نے چوتھی شرط یہ لکھوائی تھی معاویہ کے بعد خلافت کا معاملہ شوری طے کرے گی۔ اس شرط کا جو ستیاناس کیا گیا وہ مت پوچھئے! موصوف نے اپنی وفات سے دس گیارہ سال قبل ہی یزید پلیدی کی دلی عہدی کے لیے کوششیں شروع کر دی تھیں۔ ارباب عقد و حل خصوصاً حرمین شریفین کے صحابہ کرام ؑ میں سے کسی سے بھی اس سلسلے میں کوئی مشورہ نہ کیا اور جو لوگ شام میں موصوف کے مقرب و درباری تھے، اُن سے مصنوعی طور پر مشورہ چاہا تو چونکہ وہ موصوف کی دلی مراد و پسند کو بھانپ گئے تھے، اس لیے اُن میں سے بعض عقل مندوں نے کہا: اگر گرج بولیں تو آپ کا ڈر ہے اور جھوٹ بولیں تو خدا کا خوف ہے۔ چنانچہ ثقہ رواۃ امام حسن بصری ؑ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

ذَكَرُوا عِنْدَ مُعَاوِيَةَ شَيْئًا ، فَتَكَلَّمُوا ، وَالْأُخْفُ سَابِكٌ ، فَقَالَ
مُعَاوِيَةُ: تَكَلَّمْ يَا أَبَا بَخْرٍ فَقَالَ: أَخَافُ اللَّهَ إِنْ كَذَبْتُ وَأَخَافُكُمْ إِنْ
صَدَقْتُ.

”لوگوں نے معاویہ کے ہاں کسی چیز کا ذکر کیا تو اُس میں خوب بحث کی مگر اخف بن قیس خاموش رہے، اس پر معاویہ نے انہیں کہا: اے ابو بخر اتم بھی کچھ بولو۔ انہوں نے فرمایا: اگر میں جھوٹ بولوں تو خدا کا ڈر ہے اور اگر سچ بولوں تو تمہارا ڈر ہے۔“

(الطبقات الكبرى لابن سعد ج ۹ ص ۹۴؛ المعتظم ج ۶ ص ۹۳، ۹۴؛ تاریخ دمشق ج ۲ ص ۳۲۷؛ عیون الأخبار ج ۲ ص ۱۸۰؛ تہذیب الکمال ج ۱ ص ۴۷۹؛ سیر أعلام النبلاء ج ۴ ص ۹۲؛ تاریخ الإسلام للذهبی ج ۵ ص ۳۵۱؛ تہذیب تہذیب الکمال للذهبی ج ۱ ص ۲۹۱؛ کنز الدور لابن أیك ج ۴ ص ۴۵؛ تاریخ اسلام للندوی حصہ سوم ص ۲۹۴)

جو بات مذکورہ کتب میں ”شَيْئًا“ (کسی چیز) کے لفظ سے مبہم آئی ہے اُسی بات کو امام ابن البرق، امام ابن اثیر جزری، علامہ ابن عبد ربہ اندلسی اور حافظ ابن کثیر نے کھول کر بیان کر دیا ہے۔ ہم اُس عبارت کا ترجمہ مولانا محمد شفیع اوکاڑوی کی کتاب سے پیش کر رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”حضرت امیر معاویہ نے اخف بن قیس سے جواب بھی تک خاموش تھے فرمایا: ابو
البحر! تم کیا کہتے ہو؟ انہوں نے کہا: اگر ہم سچ کہیں تو آپ لوگوں کا ڈر ہے اور جھوٹ
کہیں تو خدا سے خوف آتا ہے۔ امیر المومنین! آپ یزید کے لیل و نہار، ظاہر و باطن
اور خلوت و جلوت سے خوب واقف ہیں، اگر آپ اس کو اللہ تعالیٰ اور امت کے لیے
واقعی پسندیدہ و بہتر خیال کرتے ہیں تو اس کے لیے کسی سے مشورہ لینے کی ضرورت نہیں
اور اگر آپ اس کے متعلق ایسی رائے اور خیال نہیں رکھتے تو راہی آخرت ہوتے ہوئے
اس معاملہ کو توشہ دنیا بنا کر اس کے حوالے نہ کرتے جائیے۔ ویسے ہمارا کام تو یہی ہے
کہ ہم کہہ دیں ”سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا“ کہ ہم نے سنا اور مانا۔“

(امام پاک اور یزید ہلید للآوکاروی ص ۳۶؛ الکامل فی التاریخ ج ۳ ص ۱۰۱؛ الکامل فی
اللغة للمبرد ج ۱ ص ۹۸؛ العقد الفرید ج ۱ ص ۵۶، ج ۴ ص ۱۱۱، ج ۵ ص ۱۱۷، ۱۱۸؛
البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۸۰، مکتبۃ المعارف؛ القول السدید فی حکم یزید للسراج أحمد
سعیدی ص ۱۰۷)

مشورہ کی بجائے دھمکی اور کذب بیانی

ابن صحر نے حضرات عبدالرحمان بن ابی بکر، ابن عمر اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم سے مشورہ نہیں کیا تھا بلکہ انہیں
فقط اپنے فیصلہ سے آگاہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ بھی یزید کی بیعت کریں۔ بخاری اور دوسری کتب حدیث
میں تو یہاں تک مذکور ہے کہ مسجد نبوی شریف کے منبر پر کھڑے ہو کر مروان ملعون ابن ملعون نے ابن صحر کی
جانب سے یزید کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا تو اس پر سیدنا عبدالرحمان بن ابی بکر رضی اللہ عنہما نے اعتراض کیا
اور فرمایا کہ یہ ہرقلی (کسریٰ کی) سنت ہے کہ باپ کے بعد بیٹے کو مقرر کر دیا جائے۔ اس پر مروان ملعون
نے کہا تھا: ”نَحْنُ ذُوهُ“ (اس کو دبوچ لو) یہ سنتے ہی سیدنا عبدالرحمان بن ابی بکر رضی اللہ عنہما دوڑ کر اپنی بہن ام
المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں پناہ گزین ہوئے اور پھر ام المومنین رضی اللہ عنہا اور
مروان کے درمیان مکالمہ ہوا جس میں اماں پاک نے مروان کو فرمان نبوی ﷺ کی روشنی میں ملعون ابن

ملعون قرار دیا۔ اس ساری تفصیل میں آپ کو کہیں بھی یہ بات نہیں ملے گی کہ یزید یا کسی کی دلی عہدی اور خلافت کے لیے مشورہ کیا گیا ہو۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور دوسرے متعدد حضرات نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ جب ان حضرات نے بیعت یزید کے مطالبہ کو مسترد کر دیا تو ابن محرز نے ان پر اپنا سپاہی کھڑا کر دیا اور اس کو کہا کہ اب میں ایک اعلان کرنے والا ہوں، ان میں سے کوئی بھی شخص میرے کسی جملہ کو مسترد کرنے کی کوشش کرے تو اس کی گردن اڑا دیتا۔ پھر کھڑے ہو کر اپنی طرف سے ہی جھوٹا اعلان کر دیا کہ ان بزرگوں نے یزید کی دلی عہدی کی بیعت کر لی ہے۔ چنانچہ شیخ محقق اور دوسرے محدثین کرام لکھتے ہیں:

”اس کے بعد امیر معاویہ نے منبر پر چڑھ کر حمد و ثناء کے بعد کہا: میں نے کجرو اشخاص کی یہ باتیں سنی ہیں کہ ابن ابوبکر، ابن عمر اور ابن زبیر کسی قیمت پر یزید کی خلافت کی بیعت نہیں کریں گے، حالانکہ ان حضرات نے برضا و رغبت یزید کی بیعت کر لی ہے۔ لوگوں نے باہم کہنا شروع کیا کہ ابن ابوبکر، ابن عمر اور ابن زبیر نے بیعت کر لی، حالانکہ یہ ہر سہ حضرات قسمیہ کہتے رہے کہ ہم میں سے کسی نے یزید کی بیعت نہیں کی ہے اور کیفیت یہ کہ لوگ ہاں اور نہیں یعنی مثبت و منفی اقوال زبان پر لاتے رہے، اور امیر معاویہ مدینہ سے روانہ ہو کر مملکت شام واپس چلے گئے۔“

(مأثبات بالسنة عن أعمال السنة، مترجم اردو: مومن کے ماہ و سال ص ۳۷، ۳۸؛ تاریخ خلیفہ بن خیاط ص ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، الأول لأبي هلال العسكري ص ۲۳۵، ۲۳۶؛ تاریخ الإسلام للذهبي ج ۴ ص ۱۴۸، ۱۵۲؛ تاریخ الخلفاء للسيوطي ص ۳۲۶، ۳۲۷؛ سير الصحابة للندوي ص ۷۱؛ القول السديد في حكم يزيد للمراج أحمد سعيدي ص ۹۳)

یہ واقعہ کافی طویل ہے اور اس کو تین سندوں سے روایت کیا گیا ہے، اس کی ایک سند میں نعمان بن راشد ہے، اس کو ابن حبان نے ثقہ کہا ہے اور ایک قول کے مطابق ابن معین نے بھی ثقہ کہا ہے لیکن اکثر علماء کے نزدیک یہ ضعیف ہے تاہم اس پر وضع اور کذب کا الزام نہیں ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ تھا بھی

بنو امیہ کا ظلم۔

(تہذیب التہذیب ملخصاً ج ۶ ص ۵۶۱، ۵۶۲)

یہاں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ ابن راشد کے بارے میں توثیق و تضعیف دونوں اقوال ملتے ہیں، گویا یہ مختلف فیہ راوی ہیں، اور محدثین نے لکھا ہے کہ جب کوئی راوی مختلف فیہ ہو تو اس کی روایت کردہ حدیث قابل اعتبار ہوتی ہے بلکہ بعض اس پر حدیث حسن کا حکم بھی لگاتے ہیں۔ چنانچہ امام منذری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

فَاقُولُ: إِذَا كَانَ رُؤَاةُ إِسْنَادِ الْحَدِيثِ ثِقَاتًا وَفِيهِمْ مَنْ اخْتَلَفَ فِيهِ:
إِسْنَادُهُ حَسَنٌ أَوْ مُسْتَقِيمٌ أَوْ لَا بَأْسَ بِهِ.

”جب سند حدیث کے تمام راوی ثقہ ہوں اور ان میں کوئی مختلف فیہ راوی ہو تو میں کہتا ہوں: اس کی سند حسن یا مستقیم ہے یا اس میں کوئی حرج نہیں۔“

(الترغیب والترہیب للمعذری ج ۱ ص ۴)

اسی کے قریب امام زیلعی نے بھی طلق بن علی پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

وَالْحَدِيثُ مُخْتَلَفٌ فِيهِ، فَهَبْنِي أَنْ يُقَالَ فِيهِ: حَسَنٌ، وَلَا يُحْكَمُ
بِصِحَّتِهِ.

”اور یہ حدیث مختلف فیہ ہے، لہذا مناسب ہے کہ اس کے بارے میں کہا جائے:
حسن ہے اور اس پر صحت کا حکم نہ لگایا جائے۔“

(نصب الراية لأحاديث الهداية ج ۱ ص ۶۲، قواعد في علوم الحديث للظفر أحمد عثمانی)

التہانوی [موضحاً] ص ۷۲)

یہ تو تھی اس واقعہ کی اس سند پر گفتگو جس میں نعمان بن راشد مختلف فیہ راوی ہے، یہ واقعہ اس کے علاوہ ایسی دوسندوں سے منقول ہے جس میں یہ راوی نہیں ہے۔ چنانچہ محدث خلیفہ بن خیاط کے ہاں اس کی ایک سند یہ ہے:

وَهَبُ بْنُ جَرِيرٍ قَالَ: حَدَّثَنِي جُوَيْرِيَةُ بْنُ أَسْمَاءَ.

(تاریخ خلیفہ بن خیاط ص ۲۱۵)

اول الذکر کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے بطور خلاصہ لکھا ہے:

ثِقَّةٌ مِنَ الْعَاصِقَةِ.

”نویں طبقہ کا ثقت راوی ہے۔“

(تقریب التہذیب ص ۱۰۴۳)

اور ثانی الذکر کے بارے میں لکھا ہے:

صَدْرُكَ مِنَ السَّابِقَةِ.

”ساتویں طبقہ کا ہمیشہ سچ بولنے والا آدمی ہے۔“

(تقریب التہذیب ص ۲۰۵)

محدث ابو ہلال العسکری نے اس واقعہ کو حسب ذیل سند کے ساتھ قلم بند کیا ہے:

أَخْبَرَنَا أَبُو أَحْمَدَ عَنِ الْجَوْهَرِيِّ، عَنِ أَبِي زَيْدٍ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ

غَامِرٍ، عَنْ جُوَيْرِيَةَ [جُوَيْرِيَةَ] ابْنِ أَسْمَاءَ.

”ہمیں ابواحمد نے الجوہری سے حدیث بیان کی، انہوں نے ابو زید سے، انہوں

نے سعید بن عامر سے اور انہوں نے جویریہ بن اسماء سے روایت کیا ہے۔“

(الأوائل لأبي هلال العسكري ص ۲۳۵)

یہ کل پانچ راوی ہیں:

۱۔ ابواحمد: ان کا مکمل تعارف یہ ہے: محمد بن عبد اللہ بن زبیر بن عمر بن درہم اسدی الزہری الکوفی۔ ان

سے روایت کرنے والوں میں جوہری کا نام بھی آتا ہے۔

(تہذیب التہذیب ص ۶۶۵)

حافظ صاحب ان کے متعلق تمام اقوال کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ثِقَّةٌ ثَبَتَ ، إِلَّا أَنَّهُ قَدْ يَخْطِئُ فِي حَدِيثِ الثَّوْرِيِّ .

”ثقة اور ثبت ہیں، الا یہ کہ ثوری سے حدیث کی روایت میں کبھی غلطی کر جاتے ہیں۔“

(تقریب التہذیب ص ۸۶۱)

خیال رہے کہ زیر بحث سند میں ثوری نہیں ہے، لہذا اس سند میں ”قَدْ يَخْطِئُ“ کا خدشہ نہ رہا۔

۲۔ دوسرے راوی الجوهری ہیں۔ ان کا پورا نام یہ ہے: عبد اللہ بن اسحاق الجوهری ابو محمد بصری، ان سے روایت کرنے والوں میں ابو زید الہروی کا نام بھی آتا ہے۔ حافظ رحمہ اللہ ان کے متعلق لکھتے ہیں:

ثِقَّةٌ حَافِظٌ .

”ثقة حافظ ہیں۔“

(تقریب التہذیب ص ۴۹۱)

۳۔ تیسرے راوی ابو زید ہیں۔ ان کا پورا نام یہ ہے: سعید بن رفیع حرشی عامری ابو زید ہروی بصری۔ یہ صحیحین کے راوی ہیں، حافظ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

ثِقَّةٌ مِنْ صَفَارِ الثَّابِعَةِ .

”ثقة ہیں، نویں طبقہ کے کم عمر لوگوں میں سے ہیں۔“

(تقریب التہذیب ص ۳۷۷)

۴۔ چوتھے راوی سعید بن عامر ضعی ابو محمد بصری ہیں۔ حافظ ان کے متعلق لکھتے ہیں:

ثِقَّةٌ صَالِحٌ ، وَقَالَ أَبُو حَاتِمٍ رُتَمًا وَهَمٌ .

”ثقة صالح ہیں اور ابو حاتم نے کہا: بعض مرتبہ وہم کا شکار بھی ہوتے تھے۔“

(تقریب التہذیب ص ۳۸۱)

یحییٰ بن معین نے کہا ہے:

الْبِقَّةُ الْعَامُونَ . ”ثقة محفوظ ہیں۔“

(تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۶۵۹)

اس سند کے پانچویں راوی جویریہ بن اسماء ہیں، یہ بخاری اور مسلم کے راوی ہیں اور مذکورہ بالا راوی سعید بن عامر کے ماموں ہیں۔ ان کے بارے میں پہلے لکھا جا چکا ہے کہ یہ صدوق ہیں۔

شاہی لغت میں رضا اور غبت کا مفہوم

یاد رہے کہ اس روایت میں ہے کہ اولین سلطان اسلام نے مذکورہ بالا حضرات کے بیعت نہ کرنے کے باوجود ان کی طرف سے از خود جو اعلان بیعت کیا اور اُس کو برضا اور غبت کا نام دیا، اُس برضا اور غبت کی اصل حقیقت کیا تھی؟ اس کو امام ابن اثیر جزری نے کھول کھول کر بیان کر دیا ہے۔ ہم اُن کی عبارت کا ترجمہ غزالیؒ زماں علامہ سید احمد سعید شاہ کالمی ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ و مرید سراج اہل سنت علامہ سراج احمد سعیدی کی کتاب سے نقل کر رہے ہیں۔ وہ شام و عراق وغیرہ اور حجاز مقدس میں بیعت یزید کے لیے معاویہ بن ابی سفیان کی کوششوں کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

”حضرت عبداللہ بن زبیر (رضی اللہ عنہما) نے (معاویہ کو) جواب میں کہا: آپ تین کاموں میں ایک کام کیجئے: یا تو نبی ﷺ کی طرح کسی کو جانشین نہ بنائیے، لوگ خود اس طرح کسی کو اپنا خلیفہ بنالیں گے جس طرح انہوں نے حضرت ابوبکر (ؓ) کو بنایا تھا۔ یا پھر وہ طریقہ اختیار کیجئے جو حضرت ابوبکر (ؓ) نے کیا کہ اپنی جانشینی کے لیے حضرت عمر (ؓ) جیسے شخص کو مقرر کیا جس سے اُن کا دُور پرے کا رشتہ بھی نہیں تھا۔ یا پھر وہ طریقہ اختیار کیجئے جو حضرت عمر (ؓ) نے کیا کہ چھ آدمیوں کی شوریٰ تجویز کی اور اُس میں اُن کی اولاد میں سے کوئی شامل نہ تھا۔ حضرت معاویہ نے باقی حضرات سے پوچھا: آپ لوگ کیا کہتے ہیں؟ انہوں نے کہا: ہم بھی وہی کہتے ہیں جو ابن زبیر نے کہا ہے۔ اس پر حضرت معاویہ نے کہا:

اب تک میں تم لوگوں سے درگزر کرتا رہا ہوں، اب میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر تم میں سے کسی نے میری بات کے جواب میں ایک لفظ کہا تو دوسری بات اُس کی زبان سے نکلنے کی نوبت نہ آئے گی تلوار اُس کے سر پر پہلے پڑ چکی ہوگی۔ پھر اپنے

باڈی گارڈ کے افسر کو بلا کر حکم دیا کہ ان میں سے ہر ایک پر ایک ایک آدمی مقرر کر دو اور اُسے تاکید کرو کہ ان میں سے جو بھی میری بات کی تردید یا تائید میں زبان کھولے اس کا سر قلم کر دے۔ اس کے بعد وہ انہیں لیے ہوئے مسجد میں آئے اور اعلان کیا کہ یہ مسلمانوں کے سردار اور بہترین لوگ ہیں جن کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کیا جاتا، یزید کی ولی عہدی پر راضی ہیں اور انہوں نے بیعت کر لی ہے، لہذا تم لوگ بھی بیعت کر لو۔

(القول السليد في حكم يزيد ص ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰؛ الكامل في التاريخ ج ۳ ص ۱۰۳؛ العقد الفرید ج ۵ ص ۱۲۰؛ البداية والنهاية ج ۸ ص ۸۰؛ امام پاک اور یزید ہلید، للا و کاروی ص ۳۸)

یاد رہے کہ تلوار کے سائے تلے بیعت یزید کے اس اعلان کا ذکر ان دور وایتوں میں بھی ہے جن کے ایک ایک راوی کی ثقاہت و صداقت پر ہم ابھی ابھی کلام کر چکے ہیں۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے اس واقعہ کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:

”غرض کسی نہ کسی طرح ۵۶ھ میں امیر معاویہؓ نے یزید کی بیعت لے کر نظام خلافت کا خاتمہ کر دیا۔“

(سیر الصحابة ج ۴ ص ۷۲)

در اصل نظام خلافت کا خاتمہ تو صلح سیدنا امام حسن مجتبیٰؓ کے دن ہی ہو گیا تھا اور جبر و تسلط اور ملک عضو کا آغاز ہو چکا تھا، تاہم شاہ معین الدین احمد ندوی کی تحریر سے نظام خلافت کو شوریٰ سے موروثیت میں بدلنے والے شخص کا تعین ہو گیا اور واضح ہو گیا کہ نظام شوریٰ کی سنت کو تبدیل کرنے والا اول شخص کون تھا۔ اس حقیقت کو حدیث پاک میں یوں بیان فرمایا گیا ہے:

أَوَّلُ مَنْ يُغَيِّرُ مَسْنَعِي رَجُلٌ مِّنْ بَنِي أُمَيَّةَ.

”اول شخص جو میری سنت کو تبدیل کرے گا بنو امیہ سے ہوگا۔“

(الأوائل لابن أبي عاصم ص ۷۷ حدیث ۶۳؛ المصنف لابن أبي شيبة ج ۱۹ ص ۵۵۴، ۵۵۵)

حدیث ۳۷۰، ۲۷؛ صحیح الجامع الصغیر للألبانی ص ۵۰۴۔ حدیث ۲۵۸۲؛ جمع الجوامع
للمیوطی ج ۲ ص ۲۵۵ حدیث ۸۸۱۹؛ تاریخ دمشق ج ۶۵ ص ۲۵۰؛ تحاف الخیرة المعهدة ج
۶ ص ۴۰۸ (حدیث ۶۱۶۰)

سلفی عالم ناصر الدین البانی "مِنْ أَعْلَامِ بُيُوتِهِ ۙ الْفُضَيْيَّةُ" (نبی کریم ﷺ کا غیبی خبریں دینا)
کا عنوان قائم کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وَلَعَلَّ الْمُرَادَ بِالْحَدِيثِ تَغْيِيرُ نِظَامِ اخْتِيَارِ الْخِلَافَةِ وَجَعْلُهُ وَرِثَةً.
”شاید اس حدیث سے مراد انتخاب خلافت کو بدلنا اور اُسے موروثی بنانا ہے۔“

(السلسلة الأحادیث الصحيحة للألبانی ج ۴ ص ۳۲۹، ۳۳۰۔ حدیث ۱۷۴۹)

مشورہ تو کیا کتاب و سنت ہی مسترد

یاد رکھئے کہ سیدنا امام حسین اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورہ کو جو معاویہ بن ابی سفیان نے مسترد
کیا تو اُس سے بہت کچھ مسترد ہو گیا۔ آئیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور معاویہ بن ابی سفیان کے مابین جو مکالمہ ہوا
اُسے مفتی محمد شفیع عثمانی صاحب کے الفاظ میں ایک مرتبہ پھر پڑھئے۔ وہ اجتماعی طور پر ”حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو
صحیح مشورہ کا“ عنوان قائم کر کے لکھتے ہیں:

”اس کے بعد حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ وغیرہ خود جا کر
حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے ملے اور اُن سے کہا کہ آپ کے لیے یہ کسی طرح مناسب نہیں
کہ آپ اپنے بیٹے یزید کے لیے بیعت پر اصرار کریں۔ ہم آپ کے سامنے تین
صورتیں رکھتے ہیں جو آپ کے پیشروؤں کی سنت ہے:

۱۔ آپ وہ کام کریں جو رسول اللہ ﷺ نے کیا کہ اپنے بعد کے لیے کسی کو متعین
نہیں فرمایا بلکہ مسلمانوں کی رائے عامہ پر چھوڑ دیا۔

۲۔ یا وہ کام کریں جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کیا کہ ایک ایسے شخص کا نام پیش کیا جو نہ
ان کے خاندان کا ہے نہ ان کا کوئی رشتہ دار ہے اور اس کی اہلیت پر بھی سب مسلمان

متفق ہیں۔

۳۔ یادہ صورت اختیار کریں جو حضرت عمرؓ نے کی کہ اپنے بعد معاملہ چھ آدمیوں پر دائر کر دیا۔

اس کے سوا ہم کوئی چوتھی صورت نہیں سمجھتے نہ قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ حضرت معاویہؓ کو اپنی اس رائے پر اصرار رہا کہ اب تو یزید کے ہاتھ (پر) بیعت مکمل ہو چکی ہے، اس کی مخالفت آپ کو جائز نہیں ہے۔“

(شہید کربلا للمفتی محمد شفیع عثمانی ص ۱۷؛ العقد الفرید ج ۵ ص ۱۲۰)

جو برسر اقتدار، جائز و ناجائز پر اُسی کا اختیار

مفتی صاحب کے آخری جملہ میں غور فرمائیے!

”حضرت معاویہؓ کو اپنی اس رائے پر اصرار رہا کہ اب تو یزید کے ہاتھ (پر) بیعت مکمل ہو چکی ہے، اس کی مخالفت آپ کو جائز نہیں ہے۔“

شاباش! اس کو کہتے ہیں اقتدار، کیا جائز ہے اور کیا ناجائز ہے؟ اس کا علم جتنا برسر اقتدار شخص کو ہو سکتا ہے کسی دوسرے کو نہیں ہو سکتا۔ ہر دور میں یہ تماشا دیکھا جاسکتا ہے کہ جائز و ناجائز پر اُس کا سکہ چلتا ہے جو منصب پر براجمان ہو۔ حسین بن علی، ابن ابی بکر، ابن عمر اور ابن زبیرؓ جو انتخاب خلیفہ کی تین صورتوں کو جائز اور چوتھی صورت کو ناجائز کہتے ہیں، ان کو کیا خبر کہ جائز کیا ہوتا ہے اور ناجائز کیا۔ تسلیم کہ یہ تمام حضرات اسلام، علم، عمل اور تقویٰ میں مقدم تھے اور یہ بھی تسلیم کہ معاویہؓ طلیق ابن طلیق تھا اور مجبوراً اسلام لایا تھا لیکن اس شاہی حقیقت سے کس کو انکار کی مجال کہ ”جو برسر اقتدار، جائز و ناجائز پر اُسی کا اختیار، باقی سب افکار بیکار“۔ اپنے بچپن میں غالباً مثنوی کے حوالے سے اپنے بعض بزرگوں سے یہ حکایت سنی تھی کہ:

”بیل، دہنے اور اونٹ کی دوستی تھی، ایک مرتبے چلتے چلتے یہ تینوں دور نکل گئے

اور بھوک سے بڑھ چکے تھے۔ چند قدم آگے گئے تو اچانک اُن کی نگاہ پڑی کہ

پک ڈنڈی پر تھوڑی سی ہری بھری گھاس پڑی تھی۔ تینوں گردن جھکا کر گھاس کو گھور گھور

کر دیکھنے لگے، گھاس اتنی کم تھی کہ اگر تینوں کھاتے تو کسی کا گزارہ نہ ہوتا۔ ان میں سے کسی نے کہا: بھائی قرعہ ڈالو، جس کے نام کا قرعہ نکل آیا گھاس کھانے کا حق دار وہی ہوگا۔ دنبے نے کہا: نہیں بلکہ جس کی عمر زیادہ ہو اس گھاس کو کھانے کا زیادہ حق دار اُسی کو سمجھنا چاہیے۔ بیل نے کہا: اگر تم نے لمبی عمر کی بات کی ہے تو ہمارا تمہاری عمر کتنی ہے؟ دنبے نے کہا: ہم دو بھائی تھے: ایک سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے فدیہ میں ذبح ہو گیا اور دوسرا میں ہوں۔ اس پر بیل نے کہا: پھر تو تو ہمارا بچہ نکڑا ہے۔ اُس نے کہا: وہ کیسے؟ بیل نے کہا: جب سیدنا آدم علیہ السلام نکل چلا تے تھے تو ہم دو بھائی تھے، ایک فوت ہو گیا اور دوسرا میں ہوں۔ یہ سنتے ہی اونٹ نے گھاس کو اُپر اٹھالیا اور کہا: جس کی ٹانگیں بڑی، جس کا پیٹ بڑا، جس کی کوہان بڑی اور جس کی گردن بڑی تو عمر بھی اُسی کی بڑی۔ آؤ پہنچ سکتے ہو تو کھاؤ!“۔

یہ حکایت سننے کے بعد وہ بزرگ سرانگی زبان میں ایک منظوم کلام بھی پڑھتے تھے۔ سرانگی داں حضرات کے ذوق کے لیے اُسے پیش کر کے دوسرے حضرات کی آسانی کے لیے اُس کا مفہوم عرض کر رہا ہوں۔ وہ فرماتے تھے۔

مڈی فقیر دی اے، فنکار کھادی دیندے
غریب روئدا بیٹھے، غدار کھادی دیندے
شام و سحر دا تھمیرا، تکرار کھادی دیندے
یاری دا وقت کتھے؟ یار کھادی دیندے

اس کا مفہوم یہ ہے:

حق فقیر کا ہے، فنکار کھارہا ہے
غریب رو رہا ہے، غدار کھارہا ہے
صبح و شام کا جھگڑا، تکرار کھارہا ہے

یاری کا وقت کہاں؟ یا رکھا رہا ہے

حاکم کے ”جائز“ سے کتنے ”جائز“ نا جائز

مفتی محمد شفیع عثمانی صاحب نے اپنی عبرت میں تین نمبر قائم کیے ہیں:

• پہلے نمبر میں غور فرمائیں تو رسول اللہ ﷺ کی سنت مسترد ہوتی نظر آتی ہے۔

• مشہور آیت ﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ﴾ [الحشر: ۷] سے عملی روگردانی بھی ثابت ہو رہی ہے۔

• دوسرے اور تیسرے نمبر کے فقرے میں مزید غور فرمائیں تو شیخین کریمین رضی اللہ عنہما کی سنت مسترد ہوتی نظر آ رہی ہے۔

• ﴿لَعَلَّيْكُمْ يَسْتَبِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ﴾ (تم پر میری اور خلفاء راشدین کی سنت لازم ہے) سے عملی روگردانی نظر آ رہی ہے۔

• ﴿اَقْلُوا بِاللَّذِينَ مِنْ بَعْدِي أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرُ﴾ (میرے بعد ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی اقتدا کرنا) سے انحراف نظر آ رہا ہے۔

• اسی انحراف کی وجہ سے قرآن مجید کی اس آیت ﴿وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾ (التوبة: ۱۰۰) سے بھی روگردانی ہو رہی ہے۔

• ضابطہ الہی ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا﴾ [النساء: ۵۸] کی خلاف ورزی ثابت ہو رہی ہے۔

• قرآن و اہل بیت کے تمسک پر جو زور دیا گیا ہے اُس سے روگردانی نظر آ رہی ہے، کیونکہ ۳۷ھ میں موصوف کو سیدنا علیؑ نے کتاب و سنت کی طرف بلایا، ۴۱ھ میں امام حسن مجتبیٰؑ نے مسئلہ خلافت کو مجلس شوریٰ میں لے جانے کا عہد لیا اور ۵۶ھ میں امام حسینؑ نے بھی اسی بات پر زور دیا لیکن موصوف نے ان تینوں ہستیوں کے حکم کو پس پشت ڈال دیا، جو کہ درحقیقت فرمان نبوی کو پس پشت ڈالنا ہے، کیونکہ

”إِنِّي قَارِكٌ لِّكُمْ الثَّقَلَيْنِ، الْخ“ کو فرمانِ نبوی ہے۔

بتائے امیرِ شخص کے ”جائز“ کے مقابلہ میں کتنے ”جائز“ نا جائز ہوئے؟ بہر حال چونکہ ابن ابی بکر، ابن عمر، ابن زبیر اور ابن علی رضی اللہ عنہم ایسے لکیر کے فقیر تھے کہ انہیں دورِ خلافت راشدہ کے جائز و ناجائز کے علاوہ کچھ پتا ہی نہیں تھا، اس لیے وہ دربارِ شاہی میں بھی اُسی پرانے جائز و ناجائز کو لے کر بیٹھ گئے۔ کاش! وہ شاہی جائز و ناجائز سے واقف ہوتے تو ان سے اتنی بڑی غلطی نہ ہوتی!

تقریرِ یزید میں بعض حکماء امت کی فکر

انتہائی افسوس کی بات ہے کہ یزید پلید کے اس تقریر میں معاویہ نے جو قرآن، حدیث اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی سنت سے انحراف کیا اور صائب الرائے اصحاب کے مشورہ کو مسترد کر کے جبر و سوریہ کی بنیاد ڈالی، اُس کو ہمارے بعض بریلویوں نے قرآن اور سنتِ انبیاء علیہم السلام کی پیروی بنا ڈالا۔ چنانچہ ایک حکیم الامت صاحب لکھتے ہیں:

”پہلے خلیفہ کا دوسرے کو اپنی زندگی میں خلیفہ کرنا درست ہے۔ خلافت کے چند طریق ہیں۔ رائے عامہ سے خلیفہ بننا جیسے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت۔ پہلے خلیفہ کے انتخاب سے خلافت جیسے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خود اپنی حیات شریف میں آپ کو خلیفہ بنا گئے۔ خاص الملّ حل و عقد کے انتخاب سے خلافت جیسے خلافت عثمانی و مرتضوی۔ اگر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اس انتخاب کی وجہ سے تصور وار ہیں تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر بھی یہی اعتراض آئے گا۔

اپنے بیٹے کو اپنا جانشین کرنا کسی آیت یا حدیث کی رو سے ممنوع نہیں، اگر ممنوع ہے تو وہ آیت یا حدیث پیش کر دو۔ آج عام طور پر صوفیاء مشائخ سلاطین اپنی اولاد کو مدی نشین اپنا جانشین بنا جاتے ہیں، کیا ان مشائخ صوفیاء کرام کو فاسق کہو گے؟ غرضیکہ اپنی اولاد کو اپنا جانشین کرنا کسی آیت و حدیث کی رو سے جرم نہیں۔ اس سے پہلے امام حسن رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بن چکے تھے، بیٹے کا خلیفہ بننا حضرت حسن رضی اللہ عنہ

سے شروع ہوا۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے دعا کی کہ مولیٰ میرے بھائی ہارون (علیہ السلام) کو میرا

وزیر بنادے:

وَأَجْعَلْ لِي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي، هَارُونَ أَخِي، أَشْذُ بِهِ أَزْدِي، وَأَشْرُ كُنْهِي
أَهْرِي.

اور میرے لیے میرے گھر والوں میں سے ایک وزیر کروے، یعنی میرے بھائی ہارون (علیہ السلام) کو، اُن سے میری کمر مضبوط کر اور انہیں میرے کام میں شریک فرما دے۔

آپ کی یہ دعا قبول فرمائی گئی، رب نے آپ پر ناراضی نہ فرمائی کہ تم اپنوں کے لیے کوشش کیوں کرتے ہو۔

ذکر یا (علیہ السلام) نے رب العالمین سے فرزند مانگا اور دعا کی کہ وہ میرا بیٹا میرا جانشین ہو۔ یہ دعا قبول ہوئی، رب فرماتا ہے:

فَهَبْ لِي مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا، يَرْثُنِي وَيُورِثَ مِنِّي يَتَّقُوبَ.

پس مجھے اپنی طرف سے ایک وارث دے جو میرا اور آل یعقوب (علیہ السلام) کا وارث

ہو۔

غرضیکہ اپنے فرزند اپنے بھائی اپنے اہل قرابت کو اپنا نائب کرنا نہ حرام ہے نہ مکروہ بلکہ اس کی کوشش کرنا اس کی دعا کرنا انبیاء سے ثابت ہے۔

(امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، مفتی احمد یار خان نعیمی، ص ۸۱، ۸۲)

بعض حکماء امت کی تردید میں عبارات علماء

ہمارے بعض بریلوی حکماء امت نے جو اپنی فکر عمیق پیش فرمائی ہے، ایسے باریک نکتوں اور گہری تاویلات پر فقط و کلاً طلقاء کو ہی ملکہ حاصل ہوتا ہے، جبکہ اُن کے برعکس جو علماء خالی خولی فکر اسلام اور غم اہل اسلام کے جذبہ سے سرشار ہوتے ہیں وہ ایسی نکتہ آفرینیوں سے محروم رہتے ہیں۔ آئیے! محض خالی خولی

جذبہ اسلام کے حامل مگر بعض طلقاء کی عظمتوں کی معرفت سے محروم چند علماء کرام کی فکر ملاحظہ فرمائیں۔

مشہور فقیہ و فلسفی ابن رشد کی فکر اسلام

حکومت معاویہ اور اُس کے برے اثرات کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر فرح النون نے مشہور فقیہ و فلسفی امام ابوالولید محمد بن احمد المعروف ابن رشد قرطبی مالکی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۵۲۰ھ کا نظریہ نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

وَمِنْ رَأْيِ ابْنِ رُشْدٍ أَنَّ الْحَاكِمَ الظَّالِمَ هُوَ الَّذِي يَحْكُمُ الشَّعْبَ مِنْ أَجْلِ نَفْسِهِ لَا مِنْ أَجْلِ الشَّعْبِ ، وَإِنَّ مِنْ شَرِّ الظَّالِمِ ظَلَمَ رِجَالِ الدِّينِ ، وَإِنَّ أَحْوَالَ الْعَرَبِ فِي عَهْدِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ كَانَتْ عَلَى غَايَةِ مِنَ الصَّالِحِ ، فَكَانَ مَا وَصَفَ أَفْلَاطُونُ حُكُومَتَهُمْ لَمَّا وَصَفَ فِي جَمْهُورِيَّتِهِ الْحُكُومَةَ الْجَمْهُورِيَّةَ الصَّحِيحَةَ الَّتِي يَجِبُ أَنْ تَكُونَ مَقَالًا لِجَمِيعِ الْحُكُومَاتِ ، وَلَكِنْ مُعَارِيَةً هَذِهِ ذَلِكَ الْبِنَاءُ الْجَلِيلُ الْقَدِيمُ ، وَأَقَامَ مَكَانَهُ دَوْلَةُ بَنِي أُمَيَّةَ وَسُلْطَانُهَا الشَّدِيدُ ، فَفَتَحَ بِذَلِكَ بَابًا لِلْفِتَنِ الَّتِي لَا تَزُولُ إِلَى الْآنَ قَائِمَةً قَاعِدَةً حَتَّى فِي بِلَادِنَا هَذِهِ الْأَنْدَلُسِ .

”ابن رشد کے نظریہ کے مطابق ظالم حاکم وہ ہے جو پبلک پر اپنی خاطر حکومت کرتا ہے نہ کہ پبلک کی خاطر، اور ظالموں میں سے سب سے بدترین فسادین کے مدعیوں کا فساد ہوتا ہے، بلاشبہ عرب کے حالات خلفاء راشدینؓ کے دور میں بہت اچھے تھے، گویا کہ افلاطون نے اپنی کتاب جمہوریت میں جب تعریف کی تو ان کی حکومت کی تعریف کی، وہ ایسی صحیح جمہوری حکومت تھی جس کو تمام حکومتوں کے لیے نمونہ (ماڈل) بنانا واجب ہے، لیکن معاویہ نے اُس قدیم و عظیم الشان بنیاد کو منہدم کر دیا اور اُس (اسلامی خلافت راشدہ) کی جگہ سخت اموی حکومت قائم کر دی، پس انہوں نے اُس حکومت کے ذریعے ایسے مسلسل فتنوں کا دروازہ کھول دیا جو تا حال (۵۲۰ھ

تک) جاری ہیں حتیٰ کہ ہمارے ان شہروں اندلس وغیرہ میں بھی پہنچ چکے ہیں۔“

(فلسفۃ ابن رشد ص ۳۶)

راقم الحروف کہتا ہے: بلکہ ہمارے دور ۱۳۴۰ھ تک بھی وہ نئے مسلسل جاری ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی فکر اسلام

مولانا ابوالکلام آزاد کی ”اسلام اور جمہوریت“ کے نام سے ایک تصنیف ہے، اُس میں انہوں نے شریعت اسلامی کی روشنی میں حقیقی جمہوریت کے خدوخال واضح فرمائے ہیں اور حق یہ ہے کہ انتہائی اختصار کے باوجود حق ادا کر دیا ہے، اُن کا کلام ہی گواہی دیتا ہے کہ وہ واقعہً ابوالکلام تھے۔ وہ ایک مقام پر یزید پلید کی جبری ولی عہدی کی مذمت بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

”خلافتِ راشدہ کے بعد بنو امیہ کا دور فتن و بدعات شروع ہوتا ہے، جنہوں نے نظام حکومت اسلامی کی بنیادیں حنزل کر دیں۔“

(اسلام اور جمہوریت ص ۳۶)

ایک اور مقام پر علامہ موصوف نے کتب عقائد و کلام سے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کتب کے مصنفین نے مسئلہ خلافت و امامت کبریٰ کو اُس طرح بیان نہیں کیا جیسا کہ اُس کو بیان کرنے کا حق تھا۔ اِس کے بعد انہوں نے یہ عنوان قائم کیا ہے: ”بنو امیہ کی بد باطنی و ظلم“ پھر لکھا ہے:

”لیکن اِس اغماض سے نفس مسئلہ کی تصنیف صحیح نہ ہوگی، بلکہ دراصل یہ حالت

بھی مثل اور بہت سی حالتوں کے نتیجہ ہے بنی امیہ کے اُس تسلط اور احاطہ مستبدہ (شوریٰ

سے انحراف) کا جس کے اثر سے ہمارے ہر فن کا لٹریچر متاثر ہوا اور بد قسمتی سے عقائد

و کلام کے تو بہت سے گوشے ہیں جن سے اس کی صدائے بازگشت آج تک آرہی ہے۔

بنی امیہ کی سب سے پہلی بدعت اور اسلام و مسلمین پر اُن کا اولین ظلم یہ تھا کہ نظام

حکومت اسلامیہ کا تختہ یکسر الٹ دیا اور خلافتِ راشدہ جمہوریت صحیحہ کی جگہ مستبدہ مُلک

عضوض کی بنیاد ڈالی۔ یہ انقلاب بہت شدید تھا اور بہت مشکل تھا کہ مُلک کو اس پر راضی

کیا جائے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ابھی موجود تھے اور خلافتِ راشدہ کے واقعات بچے بچے کی زبان پر تھے، اس لیے اُس احساسِ اسلامی کو مٹانے کے لیے تلوار سے کام لیا گیا اور جس نے قوتِ حق و معروف سے زبان کھولی، اس کو زورِ شمشیر و خنجر سے چپ کرایا گیا۔ رفتہ رفتہ احساسِ مقلب اور خیالاتِ پلٹنے لگے اور حقیقتِ روزِ بروز مستور و محبوب ہوتی گئی۔“

(اسلام اور جمہوریت ص ۴۰، ۴۱)

خلافتِ راشدہ کے فوراً بعد جو کاٹنے والی حکومت قائم ہوئی، اُس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے پر سیدنا حجر بن عدی اور اُن کے رفقاء ؓ کا جو شکر کیا گیا، اگر آپ اُسے مد نظر رکھیں گے تو مولانا ابوالکلام کے کلام کی حقانیت کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

علامہ ابوالکلام ایک اور مقام پر سیدنا معاذ بن جبل ؓ کی زبانی خلیفہ برحق کے اوصاف اور عوام کے سامنے اُس کے جوابدہ ہونے وغیرہ امور کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

”اللہ بنی اُمیہ سے انصاف کرے، جنہوں نے اسلام کی اُس مقدس تصویر مساوات کو اپنی کثرتِ اغراض و نفس سے ملوث کر دیا اور اُس کی بڑھتی ہوئی قوتیں عین دورِ عروج میں پامال مفسد و استبداد ہو کر رہ گئیں“ ضَلُّوا فَأَضَلُّوا، قَوْلُ لَهُمْ وَ لَا تَبْعَاهُمْ (وہ گمراہ ہوئے تو لوگوں کو بھی گمراہ کیا، پس اُن کے لیے اور اُن کے پیروکاروں کے لیے ہلاکت ہے)۔“

(اسلام اور جمہوریت ص ۵۰)

خیال رہے کہ جن لوگوں کو مولانا ابوالکلام آزاد نے گمراہ کہا ہے، انہیں سیدنا علی المرتضیٰ ؓ نے خلافتِ سنیہ لے کے آغاز میں مُضِلِّیْن (گمراہ کن) کہا تھا اور سیدنا خزیمہ بن ثابت اور سیدنا عمار بن یاسر ؓ نے بھی جنگِ صفین میں انہیں گمراہ قرار دیا تھا، جیسا کہ ہم اپنی کتاب ”شرح خصائص علی ؓ“ اور ”الاحادیث الموضوعة في فضائل معاوية“ میں باحوالہ لکھ چکے ہیں۔ خود اسی کتاب میں بھی

مختصراً لکھا جا چکا ہے۔

شیخ ابو زہرہ مصری کی فکرِ اسلام

شیخ ابو زہرہ مصری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”معاویہ بن ابوسفیان نے جن حرکتوں کا ارتکاب کیا ہے وہ بہت ہیں، انہوں نے اسلام کے نظامِ حیات میں سے شوریٰ کو نکال دیا، انہوں نے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنا دیا، اور اس طرح امرِ خلافت کو ایک فاسق و فاجر بادشاہ کے سپرد کر دیا، اُن کا ادعا یہ تھا کہ یزید کو ولی عہد بنا کر وہ سنتِ ابو بکر ؓ پر عمل کر رہے ہیں، کیونکہ انہوں نے بھی اپنے بعد عمر ؓ بن الخطاب کو ولی عہد بنایا تھا، لیکن معاویہ اور ابو بکر ؓ کے اس اقدام میں بڑا واضح فرق ہے۔ یہ عمر جنہیں ابو بکر ؓ نے ولی عہد بنایا تھا وہ تھے جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

اللہ نے عمر ؓ کے قلب و لسان پر حق لکھ دیا ہے۔

جبکہ یزید وہ تھا جو محرمات کے ارتکاب سے بھی پرہیز نہیں کرتا تھا۔ دراصل ابو بکر ؓ نے وزراءِ نبی ﷺ میں سے ایک کو ولی عہد بنایا تھا، جس سے اُن کی کوئی ذاتی قربت نہیں تھی، اور عمر ؓ وہ تھے جن کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا: جس راستے میں عمر چلتے ہیں وہاں شیطان داخل نہیں ہوتا۔

لیکن معاویہ کے ولی عہد کے بارے میں تاریخ نے جو کچھ کہا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ اسی بارے میں حضرت حسن بصری نے فرمایا تھا: معاویہ میں چار برائیاں ایسی ہیں کہ اگر اُن میں سے صرف ایک بھی ہوتی تو تب بھی وہ ہلاک کرنے کے لیے کافی تھی۔

- ۱۔ اُمتِ اسلامیہ پر خروجِ یہاں تک کہ حقِ مشورہ چھین کر اُس پر مسلط ہو جانا
- ۲۔ استخلافِ یزید، یعنی یزید جیسے شخص کو اپنا جانشین بنایا جو شرابی تھا، نشہ میں دھت

رہتا تھا، ریشمی لباس پہنتا تھا، مطبورہ بجاتا تھا۔

(الإمام الصادق علیہ السلام لأبي زهرة مصري ص ۱۷۰)

شیخ ابو زہرہ مصری رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے بریلوی حکیم الامت کے خیالات کی کافی تردید ہو چکی ہے، لیکن شیخ کے کلام سے جو یہ تاثر ابھرتا ہے کہ معاویہ کی یہ حرکت اس لیے ناپسندیدہ تھی کہ جس یزید کو انہوں نے اپنا ولی عہد بنایا تھا وہ برا آدمی تھا۔ میں کہتا ہوں: اگر یزید خبیث مکمل متقی اور پرہیزگار بھی ہوتا تو تب بھی معاویہ کا بحیثیت باپ اُس کو ولی عہد بنانا جائز نہ ہوتا، کیونکہ خلفاء اربعہ علیہم السلام بھی صاحبانِ اولاد تھے مگر اُن میں سے کسی نے بھی اپنی اولاد کو اپنا جانشین نہیں بنایا تھا، اور اُمت پر خلفاء راشدین علیہم السلام کی سنت کو لازمی فرمایا گیا ہے، بلکہ قرآن مجید نے تو اکثر مہاجرین و انصار علیہم السلام کی اتباع بھی لازم فرمائی ہے اور چاروں خلفاء علیہم السلام جہاں خلفاء راشدین تھے وہیں مہاجر بھی تھے۔

کیا فکرِ صدیق اور فکرِ طلیق برابر ہیں؟

شیخ ابو زہرہ مصری رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں یہ بات بہت اچھی ہے کہ سنتِ ابی بکر علیہ السلام کو دلیل بنانے والا اگر بقول تمہارے سیدنا ابو بکر علیہ السلام نے اپنا ولی عہد بنایا تھا تو دیکھو تو سہی کہ کس کو بنایا تھا؟ ایک طرف اُن کے پسند فرمودہ ولی عہد میں وہ خوبیاں تھیں جو زبانِ نبوی پر جاری ہوئیں تو دوسری طرف وہ اُن کے بیٹے یا رشتہ دار بھی تو نہیں تھے؟ اس پر راقم الحروف کہتا ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تو دیکھا جائے کہ سیدنا عمر علیہ السلام کو پسند فرمانے والا خود کون تھا؟ وہ ابو بکر علیہ السلام تھے جو غیر اہل بیت کرام میں سب سے بڑے صدیق تھے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ بعض لوگ طلیق کی پسند کو صدیق کی پسند پر قیاس کرتے ہیں۔ کیا ایسے لوگوں کے پاس غور و فکر کے لیے اتنی عقل بھی نہیں تھی کہ انہیں صدیق علیہ السلام اور طلیق کی فکر، نیت اور اقدام میں فرق نظر آتا؟ کیا ایسے لوگوں کے نزدیک سب کچھ راہِ الہی میں لٹانے والے اور یکے از مؤلفۃ القلوب (پسے) کے ذریعے مائل بہ اسلام کیے جانے والے (شخص کی سوچ، نیت، فکر اور ہمت برابر ہیں؟ صدیق اور طلیق کی فکر یکساں، عمر علیہ السلام ایسے مدبر کو خلیفہ بنانے کا مشورہ دے جانا اور یزید پلید کو ولی عہد نام زد کر کے مسلط کر جانا کیا یہ دونوں عمل برابر ہیں؟ واہ حکیم الامت واہ!

کیا خلیفہ اول نے بلا مشورہ اپنا ولی عہد بنایا تھا؟

خیال رہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق ؓ نے باقاعدہ سیدنا عمر ؓ کی جانشینی کا حکم نہیں فرمایا تھا بلکہ انہوں نے تو اپنی عمر کے آخری ایام میں ان کی خلافت کے لیے ایک رائے پیش فرمائی تھی، اور اس میں بھی ان کے مد نظر محض خطاب کا بیٹا عمر نہیں تھا بلکہ وہ احادیث نبویہ تھیں جو سیدنا عمر ؓ کی شان میں وارد ہوئیں، جن میں سے بعض کا ذکر شیخ ابوزہرہ کی تحریر میں آچکا ہے، جبکہ ابویزید نے یزید پلیدی کی ولی عہدی کا عمل اپنے مرنے سے تقریباً دس برس قبل شروع کر دیا تھا۔ بتائیے ابویزید کے مد نظر یزید خبیث کی شان میں کون سی احادیث نبویہ تھیں؟

بعض طلقاء کے اقدام کو صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما ایسی بے غرض ہستیوں کے اقدامات پر قیاس کرنے والوں کو شرم کرنا چاہیے۔ یہ وہ ہستیاں تھیں جن کی نگاہ انتخاب محض انسان کی طرف نہیں جاتی تھی بلکہ نبی ﷺ کے فرمان کی طرف جاتی تھی، مثلاً ایک مرتبہ سیدنا عمر ؓ نے فرمایا:

”اگر میرا آخری وقت آگیا اور اس وقت ابوعبیدہ زندہ ہوا تو میں اس کو خلیفہ بنا دوں گا، پھر اگر اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پوچھا کہ تو نے اس کو امت محمدیہ پر کیوں خلیفہ بنایا تو میں عرض کروں گا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا تھا کہ ہر نبی کا ایک امین ہوتا ہے اور میرا امین ابوعبیدہ بن الجراح ہے۔“

(الریاض النضرۃ، باب فی مناقب ابی عبیدہ، ج ۴ ص ۳۴۹)

ایسا ہی اظہار خیال وہ سیدنا علی ؓ کے بارے میں بھی فرماتے تھے، اس کی تفصیل ہماری کتاب ”شرح اسنی المطالب فی مناقب علی بن ابی طالب ؓ“ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ خود فرمائیے! سیدنا عمر ؓ کے مد نظر محض سیدنا ابوعبیدہ ؓ کی شخصیت تھی یا سید الانبیاء ﷺ کا ارشاد تھا؟ پھر اسی تناظر میں انصاف و ایمان سے بتائیے کہ یزید کی تقرری کے وقت اس کے باپ کے مد نظر کیا تھا؟

لیکن ایسی سب احادیث کے باوجود بھی سیدنا ابوبکر صدیق ؓ نے سیدنا عمر ؓ کو بلا مشورہ جبراً اور دشوت وغیرہ کے ذریعے اپنا ولی عہد نہیں بنایا تھا بلکہ انہوں نے بھرپور طریقے سے مشورہ کیا تھا۔ چنانچہ

مولانا ثناء اللہ امرتسری لکھتے ہیں:

”جب حضرت ابو بکرؓ نے محسوس فرمایا کہ وقت قریب ہے تو مدینہ اور اس کے قرب و جوار کے ارباب بے ست و کشادگی رائے معلوم کرنا شروع کیا، معتد صحابہ سے مشورہ فرمایا، اس کے بعد ایک تحریری اعلان کے ساتھ حضرت عمرؓ کا نام پیش فرمایا، یہ نامزدگی خلیفہ اولؓ کی کئی دنوں کی محنت کا نتیجہ تھی، علالت کے ایام میں حضرت ابو بکرؓ کا یہ بہترین مشغلہ رہا، یہ نامزدگی کئی دنوں کے گہرے غور و خوض اور ارباب حل و عقد کے مخلصانہ مشوروں کا نتیجہ تھی۔ اسے انتخاب کہیے یا نامزدگی لیکن اس کے پیچھے شوریٰ کی مقدس قوتیں پنہاں تھیں اور اس مقدس شوریٰ کی نامزدگی سے امت کو بے حد فائدہ پہنچا۔ تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نامزدگی کے لیے حضرت ابو بکرؓ نے بچوں اور عورتوں تک کی رائے دریافت فرمائی۔“

(فتاویٰ ثنائیہ ج ۲ ص ۵۸۶)

حافظ ابن عساکر حضرت عمرؓ کی سوانح میں اور امام سیوطی سیدنا ابو بکرؓ کے حالات میں ”فصل فی مرضه ووفاته ، ووصيته واستخلافه عمر“ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

”جب سیدنا ابو بکرؓ بیمار ہوئے تو کھڑکی سے لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: لوگو! میں نے تمہارے ساتھ ایک عہد کیا ہے کیا تم اس پر راضی ہو؟ لوگوں نے کھڑے ہو کر کہا: ہم راضی ہیں، اس پر سیدنا علی بن ابی طالبؓ نے فرمایا: اگر وہ حضرت عمرؓ نہ ہوں تو پھر ہم راضی نہیں ہیں۔ انہوں نے فرمایا: وہ عمر ہی ہیں۔“

(تاریخ دمشق ج ۴ ص ۲۵۳؛ تاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۱۷۰)

ابن عساکر کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ سیدنا ابو بکرؓ نے فرمایا:

وَاللّٰهُ مَا آلَيْتُ ، وَلَا تَوَلَّيْتُ مِنْ جُهْدٍ رَأْيٍ ، وَلَا أَلَيْتُ قَرَابَةً .

”اللہ کی قسم! میں نے اس سلسلے میں کوئی سستی کی ہے، نہ اپنی رائے ٹھوسی ہے اور نہ ہی

میں نے رشتہ داری کے طور پر ولی عہد بنایا ہے۔“

(تاریخ دمشق ج ۴۴ ص ۲۵۳)

حتیٰ کہ ایک روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ خلیفہ اول نے اپنی آخری بیماری کے ایام میں لوگوں کو فرمایا:

”اللہ تعالیٰ نے میری بیعت کے متعلق تمہاری قسموں کو آزاد کر دیا ہے، میرے ساتھ تمہارے عہد کو ختم کر دیا ہے اور تمہارا معاملہ تم پر لوٹا دیا ہے، لہذا تم جس کو چاہو اپنا امیر بنالو، سو اگر تم میری حیات میں کوئی امیر مقرر کر لو تو یہ بہت مناسب ہوگا تا کہ تم میرے بعد اختلاف میں نہ پڑو۔ پس لوگوں نے اس معاملہ میں گفتگو شروع کی اور ان کی مجلس سے چلے گئے، لیکن جب وہ کسی رائے پر مستقیم نہ ہو سکے تو دوبارہ ان کی طرف لوٹ آئے اور کہنے لگے: اے رسول اللہ کے خلیفہ! آپ بھی کوئی رائے دیں۔ فرمایا: شاید تم میری رائے سے اختلاف کرو؟ انہوں نے کہا: نہیں کریں گے۔ فرمایا: کیا پھر تم اللہ تعالیٰ سے وعدہ کرتے ہو کہ تم راضی رہو گے؟ انہوں نے عرض کیا: ہاں۔ فرمایا:

فَأَمْهَلُونِي أَنْظُرَ لِلَّهِ وَلِدِينِهِ وَلِعِبَادِهِ.

پھر مجھے مہلت دوتا کہ میں اللہ تعالیٰ، اُس کے دین اور اُس کے بندوں کے لیے غور و فکر کر لوں۔“

(تاریخ دمشق ج ۴۴ ص ۲۴۸)

مولانا ابوالکلام آزاد ایک مقام پر انتخاب خلیفہ کے طریقے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

”ان تصریحات میں تم دیکھتے ہو کہ انتخاب خلیفہ کے لیے انتخاب عام و مشورہ اہل حل و عقد کے ساتھ خلیفہ سابق کی تعیین کو بھی ایک شکل صحیح قرار دیا ہے۔ دراصل اس میں حضرت عمرؓ کے انتخاب کی مثال پیش نظر ہے، لیکن غور کیجئے تو حضرت عمرؓ کے لیے گو حضرت ابوبکرؓ نے تحریک کی لیکن اُس پر تمام ارباب حل و عقد اور پھر

عامۃ المسلمین نے پسندیدگی کا اظہار کیا، اس لیے وہ بھی تعین شخص نہیں بلکہ بمنزلہ انتخاب عام کے تھا۔

(اسلام اور جمہوریت ص ۴۱)

قارئین کرام! خود ہی انصاف فرمائیں کہ جو لوگ یزید کی غیر اسلامی، غیر شرعی اور غیر جمہوری ولی عہدی میں عمل طلق کو عمل صدیق علیہ السلام کے مشابہ قرار دینے کی ناکام کوشش میں مبتلا ہیں ان کا شمار عقل، علم، انصاف اور دیانت کے کس کھاتے میں ہو سکتا ہے؟ آپ بھی سوچ کر بتائیے گا لیکن اس مشابہت کو بعض درویشانِ امت مسلمہ نے کیا نام دیا ہے، درج ذیل سطور میں ذرا اُس میں بھی غور فرمالیجئے۔

مولانا حامد انصاری غازی کی فکرِ اسلام

مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب کے نواسے، قاری محمد طیب صاحب کے داماد فاضل دارالعلوم دیوبند مولانا حامد انصاری غازی لکھتے ہیں:

”اسلام میں پہلی نظیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے اختیار کو باقی رکھا اور اپنے اختیار سے نامزدگی نہیں فرمائی۔ یہ نظیر امت کے لیے پہلی شے ہے، اس کو ہر حال میں باقی رکھنے پر زور دینا قانونِ سنت کا اولین منشاء ہے۔ دوسری طرف صدیق اکبر کا تعامل ہے، انہوں نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا نام تجویز کیا، اس تجویز کو ولایتِ عہد یا ولی عہدی قرار دینا ایک غیر قانونی جسارت ہے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے ایک نام کی جگہ چند نام تجویز کیے، لیکن یہ دونوں تجویزیں شخصی اختیار سے زیادہ امت کے اختیار پر مبنی تھیں، مطلق ولی عہدی سے ہم آہنگ نہ تھیں۔

اس قسم کی تجویز ثانوی درجہ میں قانونی حیثیت رکھتی ہے، مگر یہ اہمیت چند لازمی شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔

پہلی شرط یہ کہ جو شخص نامزد کیا جائے وہ پیشرو امام کی پشتینی اولاد نہ ہو، خلافت راشدہ کے چاروں دور اس پر گواہ ہیں۔ صدیق اکبرؓ کے سامنے ان کے صاحبزادے کا

نام تھا مگر تجویز نہیں کیا۔ فاروق اعظمؓ نے جب شوریٰ کا حکم دیا تو ایک گوشہ سے عبداللہ بن عمر کا نام پیش ہوا مگر انہوں نے تصریح کر دی کہ حکومت میں اُن کا کوئی حصہ نہیں، بعد کے دو انتخاب بھی اسی اصول پر مبنی تھے۔

حضرت معاویہؓ نے اپنے اثر، قوت اور تدبیر سے یزید کی ولی عہدی کو منظور کرایا اس انتخاب کے خون آشام نتائج یہ کہتے ہیں کہ یہ تقریر امت کے لیے دلیل نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ حضرت معاویہؓ یورپین شہنشاہوں کے پڑوس میں مسلمانوں کا اقتدار قائم کر رہے تھے۔ ان کا یہ قول بھی دماغ میں رہنا چاہیے ہم نے شہنشاہیت اور سلطنت پر قناعت کر لی ہے اس قول کے بعد راہ صاف ہو جاتی ہے۔ ایک ایسی عالمگیر قوم جو انسانیت کو نبوت، قانون رحمت اور خلافت راشدہ کے طرز پر منظم کرنا چاہتی ہے شہنشاہیت پر قناعت نہیں کر سکتی۔ بعد کے زمانہ میں بنی امیہ اور بنی عباس کے اقتدار میں اسلام کے لیے جو پرجوش کارنامے انجام پائے اُس سے انکار کیے بغیر ولی عہدی کے رواج کو جائز تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔“

(اسلام کا نظام حکومت ص ۲۵۲، ۲۵۳)

موصوف ایک اور مقام میں لکھتے ہیں:

”آنحضرت (ﷺ) نے گیارہ سال تک امامت کبریٰ کی پیغمبرانہ ذمہ داریوں کو پورا کیا، آپ ﷺ کے بعد صدیق اکبر نے دو برس، فاروق اعظمؓ نے دس برس، عثمان غنیؓ نے گیارہ برس، علی المرتضیٰؓ نے چھ برس۔ امامت شوریٰ اور خلافت راشدہ کو زندہ رکھا۔ تاریخ عالم کے یہ چاروں بڑے اصحاب صاحب اولاد تھے مگر انہوں نے خدا کی حکومت کی حکم برداری میں شاہی تاج و تخت کو نگاہ غلط سے بھی نہ دیکھا۔

آخر اسلامی تاریخ کا سب سے زیادہ مکروہ واقعہ رونما ہوا۔ یہ روشنی جلد تاریکی سے بدل گئی اور فرمان ”لَا نَبِیَّ وَ لَا نَوْبَیَّ“ کے خلاف امارت شوریٰ کی جگہ پھر

مطلق العنان شاہی نے لے لی۔ دن ڈوب گیا پھر رات آئی، وہی جو ہر جوہر بادشاہوں کے تاج سے بھی زیادہ قیمتی تھا مٹی ہو گیا۔ وہ لوگ جو خدا کے حکم پر حیر کی طرح گئے، بجلی کی طرح گرے اور قیصر و کسریٰ کے تاج چھین کر ہوا کی طرح واپس آئے، اُن کے جانشین رومیوں کے ایک چھوٹے سے پایہ تخت (دمشق) میں پہنچ کر قیصر کی شہنشاہیت کا شکار ہو گئے۔

(اسلام کا نظام حکومت ص ۴۵۶)

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی فکرِ اسلام

اس سے قبل مفتی محمد شفیع عثمانی صاحب کا جو طویل کلام نقل کیا گیا ہے، یہاں اُسے بھی مد نظر رکھا جائے۔ نیز یہاں فاضل دیوبند علامہ سعید احمد اکبر آبادی کے درج ذیل کلام میں غور و فکر کرنا بھی بہت مفید ثابت ہوگا، اُن کے کلام میں دورِ اسلام کے ساتھ ساتھ مشورہ سے انحراف کی وجہ سے امت جس دائمی نحوست کا شکار ہوئی، اُس کا ذکر انہوں نے انتہائی کرب و اضطراب کے ساتھ کیا ہے۔ چنانچہ وہ ”یزید کے لیے بیعت لینا“ عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

”یہ واقعہ اپنی حیثیت میں معمولی سا واقعہ ہے لیکن اس سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ اسلام کے اجتماعی نظام کو اُس کی اصل شکل و صورت سے منتقل کر کے کسی دوسری اور غیر واقعی شکل سے متشکل کر دینے کے باعث تدریجی طور پر ذہنیت میں اور طرز فکر و خیال میں کیسی کچھ تبدیلیاں پیدا ہو جاتیں ہیں اور وہ رفتہ رفتہ کس طرح بنیادوں کو ہی متزلزل کر دینے کا باعث بن سکتی ہیں، چنانچہ اس طرز حکومت کا سب سے زیادہ الناک نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان ہمیشہ کے لیے خلافت کے تصور سے ہی محروم ہو گئے۔ جمہور کا حق انتخاب، اربابِ حل و عقد کی اس باب میں مشاورت اور اس خدمت جلیلہ کے لیے امت کے کسی صالح اور موزوں ترین فرد کی تلاش و جستجو، یہ سب باتیں ایسی خواب و خیال ہو گئیں کہ آج تک اسلام کی چشمِ تمنا پھر اُسی نظارۂ روح پرور کی باز

دید کے انتظار میں زمیں کی طرح داہے، مگر وہ منظر لوٹ کر نہیں آتا اور سالوں بلکہ قرون کے ایسے تاریک پردے درمیان میں حائل ہو گئے ہیں کہ نگاہ اشتیاق رہ رہ کے ماضی کے اُن نقوشِ جمال و عظمت کی طرف اٹھتی ہے مگر دیکھ نہیں سکتی۔

امیر معاویہؓ نے اپنی زندگی میں ہی اپنے بیٹے یزید کے لیے بیعتِ خلافت لے کر اُس طرزِ حکومت کو ایسا استوار کر دیا کہ آج تک اُس کی بنیادیں قائم ہیں۔ اُس وقت صحابہ میں اور اُن کے علاوہ تابعین میں بعض ایسے افراد موجود تھے کہ حضرت معاویہؓ اُن میں سے حضرت عمرؓ کی طرح چند حضرات کا یا حضرت ابو بکرؓ کی طرح کسی ایک شخص کا انتخاب فرما کر بطور وصیت اُن کے حق میں خلافت کی سفارش کر جاتے تو بے شبہ وہ فساد پیدا نہ ہوتا جو یزید کو خلیفہ بنانے سے پیدا ہوا اور جس کے باعث بادشاہت محض ایک خاندانی ورثہ ہو کر رہ گئی۔ خلیفہ کے لفظ میں دینی اقتدار کا مفہوم بھی شامل تھا، اس لیے ہوامیہ نے اُس لقب کو ترک نہیں کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ خلافت تو اب ختم ہو چکی تھی اور یہ جو کچھ بھی تھا ایک فریبِ اصطلاح سے زیادہ اور کوئی وقعت نہیں رکھتا تھا۔

امیر معاویہؓ نے جس طرح حکومت بحیر حاصل کی تھی اسی طرح یزید کی بیعتِ خلافت بھی بحیر لی گئی، جو حضرات اس کو دل سے پسند نہیں کرتے تھے ان کو بھی بیعت کے لیے ہاتھ بڑھا دینا ہی پڑا، ملوکیت یا شخصی حکومت کا سب سے زیادہ بُرا اثر یہ ہوتا ہے کہ عوام میں حریتِ فکر اور آزادیِ بیان کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور قہر و غلبہ اور استبداد و تشدد کی فراوانی ہو جاتی ہے، ہوامیہ میں ملوکیت کے یہ تمام جراثیم پائے جاتے تھے۔

(مسلمانوں کا غروج و زوال ص ۵۲، ۵۳)

مولانا محمد اسماعیل روپڑی کی فکر اسلام

اہل حدیث عالم مولانا محمد اسماعیل روپڑی لکھتے ہیں:

”خلفاء راشدین خلیفہ کے انتخاب میں بہت محتاط تھے۔ حضرت ابو بکرؓ کے

انتخاب میں تو احادیث نبوی کے اشارات و کنایات سے کام لیا گیا اور حضرت عمرؓ کی نسبت بھی قریباً یہی چیز کام آئی، بعدہ شوریٰ سے انتخاب ہوتا رہا لیکن یزید کی امارت کے متعلق اس اصول کی پابندی نہ کی گئی۔

(شہید کربلا ص ۱۱)

مولانا شبلی نعمانی کی فکرِ اسلام

مولانا اسماعیل روپڑی کا مختصر اور نرم الفاظ میں یہ لکھنا کہ یزید کی امارت کے متعلق اس اصول کی پابندی نہ کی گئی بہت گہرا جملہ ہے، کیونکہ مطہاء تو نہیں مگر عقل مند خوب جانتے ہیں کہ اصول کی پابندی نہ کرنے کا انجام انتہائی بھیانک ہوتا ہے، اس اصول کی پابندی نہ کرنے سے اسلام کو کتنا نقصان پہنچا؟ اس کو انتہائی مختصر مگر جامع الفاظ میں مولانا شبلی نعمانی نے یوں بیان کیا ہے:

”یزید تخت نشین ہوا، اور یہی اسلام کے سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور روحانی اِدبار و کبکیت کی اولین شب ہے۔“

(سیرۃ النبی للشبلی نعمانی ج ۲ حصہ سوم ص ۳۹۸)

”اِدْبَار“ کا معنی ہے اقبال اور نیک بختی کا پشت پھیر جانا اور ”لُکْبَة“ کا معنی ہے راہِ مستقیم سے ہٹنا۔ مولانا شبلی نعمانی نے چار لحاظ سے اِدبارِ اسلام کی بات کی ہے: سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور روحانی۔ یزید کی تخت نشینی سے ان چاروں کے اِدبار و کبکیت کا آغاز ہو گیا تھا۔ اب یہ ہر عقل مند خود ہی غور کر سکتا ہے کہ اس اِدبار و کبکیت کا اصل سبب کون تھا؟ اگر یزید از خود تخت نشین ہوا تو پھر اِدبارِ اسلام کے جرم کا تمام تر بوجھ اُسی پر ہوگا اور اگر وہ کسی اور کی مدد سے تخت پر پہنچا تو پھر وہ سارا بوجھ اُسی مددگار پر آئے گا، لہذا معلوم کیا جانا چاہیے کہ تقریباً ۵۰ھ سے لے کر ۶۰ھ تک یزید کو تخت تک پہنچانے کے لیے کون پاؤں بیلتا رہا اور رشوت، دھونس و دھمکی وغیرہ کے ذریعے کون راہ ہموار کرتا رہا؟

اسلام میں استبداد کا آغاز کب ہوا؟

اہل حدیث عالم شیخ ثناء اللہ امرتسری اسلام میں مشورہ کی اہمیت پر بحث کے دوران لکھتے ہیں:

”اسلام میں شوریٰ کی اہمیت قرآن و سنت سے ظاہر ہے، ابتداءً امرائے بنو امیہ نے استبدادی حکومت کی داغ بیل ڈالی، اور خلافت موروثی ہو گئی، اُس وقت علماء نے اس کی مخالفت کی، استبداد اور دہشت کو ناپسند کیا، لیکن عباسی حکومت میں یہ استبداد بڑھا اور پرانا ہو گیا کہ علماء کی زبانیں بند ہو گئیں، اور عام طور پر یہی سمجھا جانے لگا کہ اسلام میں آمریت اور ملوکیت ہے، شوریٰ اور رائے عامہ کی اہمیت ذہنوں سے ناپید ہو گئی، ”فَصَارَتْ بَلِیَّةً، فَاِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاٰجِعُوْنَ“، اور آج تک ذہن اس غلطی میں مبتلا ہے کہ اسلام کے نظام میں ملوکیت اور شخصی اقتدار کو اہمیت حاصل ہے۔“

(فتاویٰ ثنائیہ ج ۲ ص ۵۸۹)

بنو امیہ کی حکومت غیر اسلامی تھی

قرآن و سنت میں جو مشورہ کی اہمیت بیان کی گئی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے، اُس کو پس پشت ڈال کر ”اِسْتَبْدَاد“ کی داغ بیل بنو امیہ نے ڈالی، ”اِسْتَبْدَاد“ کا معنی ہے خود غرض ہونا اور اپنی ذات کو دوسروں پر ترجیح دینا۔ علماء اسلام نے ”اِسْتَبْدَاد“ کو ”اِمْتِشَار“ (مشورہ حاصل کرنا) کے مقابل بیان کیا ہے، اور ظاہر ہے کہ ”استبداد“ کا اسلام میں کوئی تصور نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقت شناس اور اسلام کا درد رکھنے والے علماء اسلام نے بنو امیہ کی حکومت کو غیر اسلامی حکومت قرار دینے میں کوئی تاثر نہیں کیا۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

”بنی امیہ کی حکومت ایک غیر شرعی حکومت تھی، کوئی حکومت جس کی بنیاد جبر و شخصیت پر ہو کبھی بھی اسلامی حکومت نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے اسلام، روح حریت و جمہوریت کو غارت کیا اور مشورہ و اجتماع امت کی جگہ محض غلبہ جابرانہ اور مکر و خدع پر

اپنی شخصی حکومت کی بنیاد رکھی، اُن کا نظام حکومت شریعتِ الہیہ نہ تھا۔

(شہادت حسین للابی الکلام آزاد ص ۵۸)

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ﴾ کی شانِ والی ہستی قطعاً مشورہ کی محتاج نہیں تھی لیکن اُن کے رب ﷻ نے انہیں بھی مشورہ کا حکم فرمایا۔ مشورہ کی اہمیت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ قرآن مجید میں ایک سورت کا نام ہی ”الشُّورٰی“ ہے۔ اسلام میں مشورہ کی اس حد تک اہمیت ہے کہ اگر خدا نخواستہ مشورہ کے بعد اٹھایا جانے والا قدم غلط بھی ہو جائے تو پھر بھی وہ بلا مشورہ اقدام سے زیادہ پسندیدہ ہوتا ہے۔ چنانچہ شیخ شہاب الدین عمر النوری لکھتے ہیں:

الْخَطَا مَعَ الْاِسْتِشَارَةِ اَحْمَدُ مِنَ الْاِصَابَةِ مَعَ الْاِسْتِغْنَاءِ.

”مشورہ حاصل کرنے کے بعد خطا کھانا استبداد سے (بغیر مشورہ کے) بھلائی پر رہنے

سے زیادہ قابلِ تعریف ہے۔“

(نہایۃ الأرب فی فنون الأدب: الباب السابع، من الفن الثاني فی المشورة واعمال الرأي والاستعداد، ج ۶ ص ۶۴)

باب دار الحکمتہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بھی یہ حقیقت اسی طرح منقول ہے، چنانچہ یہی عالم دین ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں:

وَقَالَ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ: نِعَمَ الْمَوَازَرَةُ الْمَشَاوَرَةُ، وَبُخْسَ الْاِسْتِغْنَاءُ الْاِسْتِغْنَاءُ.

”سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بہترین وزارت مشاورت ہے اور بری استعداد استبداد (مشورہ سے روگردانی) ہے۔“

(نہایۃ الأرب فی فنون الأدب ج ۶ ص ۶۴)

جب استبداد (مشورہ نہ کرنے) کے ساتھ بھلائی کو پالینا بھی قابلِ تعریف نہیں ہے تو پھر جہاں ہو ہی استبداد اور اُس کا نتیجہ بھی خون آشام حالات، ظلم اور فساد پر مبنی ہو تو پھر وہ کتنا قابلِ مذمت ہوگا؟ مذکورہ بالا

استبداد کے نتیجہ میں موروثیت و ملوکیت کا آغاز ہوا، پھر اُس کی نحوست سے اہل اسلام کے دلوں سے مشورہ کی اہمیت ناپید ہوئی۔ خود انصاف فرمائیے! یہ سب کچھ جرم، ظلم اور گناہ ہے یا نہیں؟ اور اگر یہ جرم و گناہ ہے تو پھر اسلام میں اس کے موجد کے بارے میں شیخ ثناء اللہ امرتسری کے کلام میں وضاحت آچکی ہے کہ وہ کون تھا۔ سوجب اسلام میں اس استبداد اور خود غرضی کی ابتدا کرنے والا شخص واضح ہو گیا تو پھر کسی بھی برائی کے موجد کے بارے میں سید الانبیاء ﷺ کا یہ ارشاد بھی سن لیجئے:

مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ
بَعْدِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يُنْقَصَ مِنْ أَوزَارِهِمْ شَيْءٌ.

”جس شخص نے اسلام میں کوئی براطریقہ نکالا اُس کا وبال اُسی پر ہوگا اور جنہوں نے اُس کے بعد اُس پر عمل کیا اُن کا وبال بھی اُس پر ہوگا، اس کے بغیر کہ بعد والوں کے وبال میں کچھ کمی کی جائے۔“

(صحیح مسلم: کتاب الزکاة، باب الحث علی الصدقة ولو بشق تمر أو كلمة طيبة، ص ۴۵۱)
حدیث (۱۰۱۷)

جو لوگ اس حدیث کو صحیح مانتے ہوں تو اُن سے عرض ہے کہ اگر کوئی شخص قرشی ہونے، اموی ہونے، کاتب وحی ہونے، جرنیل اسلام ہونے، جلیل القدر ہونے، صحابی ہونے اور ہادی و مہدی ہونے کی بنا پر اس ارشاد نبوی ﷺ سے مستثنیٰ ہو تو ازراہ کرم وہ استثنائی صورت ضرور سامنے لائیے۔

یہاں شیخ ثناء اللہ امرتسری کے گزشتہ الفاظ میں ایک مرتبہ پھر غور فرما لیجئے:

”آج تک ذہن اُس غلطی میں مبتلا ہے کہ اسلام کے نظام میں ملوکیت اور شخصی اقتدار کو اہمیت حاصل ہے۔“

شیخ نے بالکل صحیح کہا ہے، مسلم قوم کے لاشعور میں یہی بات بیٹھ چکی ہے، یہی وجہ ہے کہ عرب ہو یا عجم بالعموم ہر جگہ آزادی رائے پر قدغن ہے، چنانچہ عرب میں کوئی اختلاف رائے کا اظہار کرے تو اُسے غدار قرار دے کر دنیا بدر کر دیا جاتا ہے اور عجم میں ایسا کرنے والے انسان کو ملک بدر ہونا پڑتا ہے، لیکن تعجب ہے

کہ اس قسم کے استبداد پر غیر مسلم ممالک میں تو احتجاج ہوتا ہے مگر مسلم ممالک کی پبلک کے حلقوں سے صدائے احتجاج ہی بلند نہیں ہوتی۔ یقیناً ایسی ہی صورت حال کے لیے مفکر اسلام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہوگا:

تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

(ضربِ کلیم: زیر عنوان: "تن بہ تقدیر ص ۱۶)

ہو امیہ خصوصاً ابنِ حجر کے استبداد، مشورہ سے استبعاد اور آزادی اظہار رائے پر قدغن وغیرہ امور پر میرے سامنے اس وقت تمام مکاتبِ فکر کی مزید آراء بھی موجود ہیں، اُن سب کو یہاں قلم بند کرنا طوالت کا باعث ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ ایسی تمام عبارات کو ہم اپنی کتاب "مسندنا إمام الحسین علیہ السلام" میں جمع کریں گے۔ یہاں ہم آپ کو علماء اسلام کی مذکورہ بالا مختلف عبارات میں فرق اور اُس کی وجوہ میں غور و فکر کرنے کی زحمت دیتے ہیں۔

عبارات علماء میں فرق اور اُس کی وجہ

اربابِ دانش سے گزارش ہے کہ پہلے تو سطوری بالا میں درج شدہ تمام حضرات کی عبارات کو بغور اور بار بار پڑھیں اور ان میں فرق تلاش فرمائیں اور پھر اس فرق کی وجہ بھی تلاش فرمائیں۔

مجھ عاجز کی فہم کے مطابق اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ جو علماء اسلام (خواہ اُن کا تعلق کسی بھی مکتبِ فکر سے ہو) اہل اسلام کی ترقی اور ترقی کے اسباب و علل پر گفتگو فرماتے ہیں وہ دونوں انداز میں بیان کر دیتے ہیں کہ اسلام کو کب، کیوں اور کس سے نقصان پہنچا، اُن کے برعکس جو علماء روافض و شیعہ کی تردید میں یا دفاعِ معاویہ میں لکھتے ہیں تو وہ اسلام کو پس پشت ڈالتے ہوئے محض شخصیات کے دفاع کے جذبہ کی رو میں اس قدر آگے نکل جاتے ہیں کہ موروثیت و ملوکیت کو جواز فراہم کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ یوں تو ایسے غیر معتدل لکھاری ہر مکتبِ فکر میں موجود ہیں مگر یہاں یہ عاجز اپنے ہی مکتبِ فکر کے بعض حکماء امت کی مثال پیش کر چکا ہے کہ جس حکومت اور ولی عہدی کو دوسرے مکاتبِ فکر کے اکثر علماء نے استبداد، خون آشام، مکروہ، اندھیری رات، قیصریت، اسلام کی بنیادیں متزلزل کرنے والی، جمہور کے انتخابِ حق کی نفی کرنے

والی، مجلس شوری کی بنج کنی کرنے والی، فساد، خاندانی ورثہ، جبر، ملوکیت، شخصی حکومت، حریت فکر کی دشمن، آزادی بیان پر قدغن، قہر، غلبہ اور باعث تشدد قرار دیا، اُسے ہمارے بریلوی حکیم الامت نے فقط شخصی دفاع میں قرآن کے مطابق اور سنتِ انبیاء ثابت کرنے کی ناکام کوشش کر ڈالی۔

حکیم الامت کی فکرِ ملوکیت

سطور بالا میں ہم نے متعدد علماء اسلام کی آراء نقل کر دی ہیں، اب ہم انصاف کی امید رکھتے ہوئے قارئین کرام کی عدالت میں مقدمہ لے جاتے ہیں کہ وہ یومِ محشر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انصاف فرمائیں کہ کس کا موقف حق ہے، آیا دلاءِ اسلام کا موقف حق ہے یا دلاءِ طلقاء کا؟ راقم الحروف اپنے اندر یہ جرأت نہیں رکھتا کہ ان میں سے کسی کو حق کی نمائندگی کرنے والا اور دوسرے کو باطل کی نمائندگی کرنے والا کہہ سکے، البتہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہر ایک نے اپنی اپنی تصنیف کا حق ادا کر دیا ہے۔ ہمارے حکیم الامت چونکہ ایک عظیم بادشاہ ابنِ آکلۃ الاکباد کے دفاع میں لکھ رہے تھے اس لیے انہوں نے اپنے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے، اور دوسرے حضرات چونکہ نظامِ اسلام اور مسلمانوں کے عروج و زوال کے اسباب و علل پر لکھ رہے تھے اس لیے انہوں نے بھی اپنے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ بادشاہ کا دفاع کرنے والے نے بھی حق ادا کر دیا ہے اور اسلام کا دفاع کرنے والوں نے بھی حق ادا کر دیا ہے۔

دیے ہمارے حکیم الامت کی حکمت بروقت کام کرتی تھی، اُن کی حکمت میں کتاب و سنت کو ضرورت کے مطابق ڈھالنے کی مکمل صلاحیت تھی۔ چنانچہ انہوں نے ”کنز الایمان“ کے حاشیہ ”سورۃ المعوفان“ میں اور اسی طرح اپنی ایک اور کتاب ”شان حبیب الرحمن من آیات القرآن“ میں نبی کریم ﷺ کے کسی بھی سال کے لیے خال المومنین ہونے کی نفی کی ہے لیکن جب انہوں نے امیر شام کے دفاع میں ”امیر معاویہؓ“ نامی (۱) رسالہ لکھا تو اُن کی حکمت یکا یک بیدار ہو گئی اور انہوں نے اُس میں حسبِ ضرورت معاویہ بنِ صخر کو خال المومنین لکھ دیا۔

(۱) اس کتاب کا اصل نام ہے ”امیر معاویہ پر ایک نظر“ جیسا کہ خود مفتی احمد یار نعیمی صاحب نے سورۃ الانفال کی آیت نمبر ۵ کی تفسیر میں حاشیہ نمبر ۳ میں لکھا ہے۔ نامعلوم بعد کے لوگوں نے نام میں ترمیم کیوں کی؟

حکیم الامت کی انوکھی حکمت

سطور بالا میں راقم الحروف نے جو اپنے مکتب فکر کے حکیم الامت اور اُن کے مقابلہ میں دوسرے حضرات کے اقتباسات نقل کیے ہیں، امید ہے کہ اُن کے مابین محاکمہ اور موازنہ اکثر قارئین کرام نے اپنے اپنے ذہن میں کر لیا ہوگا، لیکن جو لوگ مجھ ناکارہ کی طرح محاکمہ اور موازنہ کی قوت نہ رکھتے ہوں تو اُن کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ مذاہب اربعہ پر کلام کرنے والے مشہور فقیہ و فلسفی امام ابن رشد کے اُس کلام میں ہی غور فرمائیں جو ہم عبارات علماء کے آغاز میں نقل کر چکے ہیں۔

یہاں ہم قارئین کرام کو اپنے حکیم الامت صاحب کی ایک اور حکمت بالغہ میں غور و فکر کی زحمت دینا چاہیں گے۔ پیچھے لکھا جا چکا ہے کہ حکیم الامت نے اپنی کتاب ”امیر معاویہ“ کے صفحہ نمبر ۸۱، ۸۲ پر یزیدی ولی عہدی کو قرآن، حدیث اور خلفاء راشدین علیہم السلام کی سنت کی مانند ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے، جبکہ وہ اپنی اسی کتاب میں دو صفحے آگے چل کر ایک ضروری نوٹ کے ضمن میں یوں بھی لکھتے ہیں:

”جب امیر معاویہ علیہ السلام کا وقت وفات قریب آیا تو یزید نے پوچھا کہ ابا جان! آپ کے بعد خلیفہ کون ہوگا تو آپ نے کہا کہ خلیفہ تو تو ہی بنے گا مگر جو کچھ میں کہتا ہوں اُسے غور سے سن۔ کوئی کام امام حسین علیہ السلام کے مشورہ کے بغیر نہ کرنا (یعنی وہ تیرے وزیر اعظم ہیں) انہیں کھلائے بغیر نہ کھانا انہیں پلائے بغیر نہ پینا، سب سے پہلے اُن پر خرچ کرنا پھر کسی اور پر، پہلے انہیں پہنانا پھر خود پہنانا۔ میں تجھے امام حسین علیہ السلام، اُن کے گھروالوں، اُن کے کنبے بلکہ سارے بنی ہاشم کے لیے اچھے سلوک کی وصیت کرتا ہوں۔“

اے بیٹے! خلافت میں ہمارا حق نہیں، وہ امام حسین علیہ السلام، اُن کے والد اور اُن کے اہل بیت کا حق ہے، تو چند روز خلیفہ رہنا پھر جب امام حسین علیہ السلام پورے کمال کو پہنچ جاویں تو پھر وہی خلیفہ ہوں گے یا جسے وہ چاہیں تاکہ خلافت اپنی جگہ پہنچ جائے۔ ہم سب امام حسین علیہ السلام اور اُن کے نانا کے غلام ہیں، انہیں ناراض نہ کرنا ورنہ تجھ پر اللہ

اور رسول اللہ ﷺ ناراض ہوں گے اور پھر تیری شفاعت کون کرے گا۔“

(امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ص ۸۵، ۸۶ مکتبہ اسلامیہ، میان مارکیٹ، بیسمنٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور)

حکیم الامت کی یہ حکمت مجھ ایسے غریب اہل سنت کی سمجھ سے بالاتر ہے، شاید اس کو کوئی امیر اہل سنت سمجھے اور پھر آگے سمجھا سکے، یا پھر حکیم الامت کی سطح کے دوسرے حکماء اہل سنت ہی سمجھ اور سمجھا سکیں گے، البتہ میں اپنی طرح کے غیر حکماء اہل سنت قارئین کرام کے لیے عرض کیے دیتا ہوں کہ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ جو معاویہ یا ہمارے حکیم الامت کے بقول ابھی کمال کو نہیں پہنچے تھے وہ یزید پلید سے عمر میں ۲۳ یا ۲۴ برس بڑے تھے، کیونکہ اُن کی ولادت ۳ ہجری میں ہوئی تھی۔

(البدایۃ والنہایۃ ج ۱۱ ص ۴۷۳)

جبکہ یزید ۲۵، ۲۶، یا ۲۷ ہجری میں پیدا ہوا تھا۔

(البدایۃ والنہایۃ ج ۱۱ ص ۶۳۷)

اگر آپ امام پاک اور یزید پلید دونوں کے سال پیدائش میں غور و فکر کریں گے تو آپ کو ہمارے حکیم الامت کی حکمت کا اعتراف کرنا ہی پڑے گا، کیونکہ جب یزید اپنے باپ کا جانشین ہوا تھا تو اُس وقت اُس کی عمر ۳۶ یا ۳۷ برس تھی اور وہ اس عمر میں کمال کو پہنچ چکا تھا جبکہ ہمارے امام سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی عمر مبارک ۵۴ برس تھی اور وہ معاویہ اور ہمارے حکیم الامت کے مطابق ابھی کمال کو نہیں پہنچے تھے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ جس طرح آج پی پی پی اور ”ن“ کے بچے ۳۰ یا ۳۵ برس کی عمر میں کمال کو پہنچ کر ولی عہد بن چکے ہیں جبکہ ابھی تک چوہدری اعجاز احسن صاحب (جن کی عمر تادم تحریر [۲۰۱۹ء] ۷۳ برس ہے) اور راجہ ظفر الحق صاحب (جن کی عمر بوقت تحریر ۸۳ برس ہے) وغیرہ کمال کو نہیں پہنچ سکے۔ صرف یہی نہیں بلکہ جنہوں نے اقتدار پر اپنے بچے گاڑ لیے ہیں، اُن کے نزدیک اُن کے بچوں کے علاوہ ملک کے باقی تمام اہل علم و ادب و دانش خواہ اُن کی عمر کتنا ہی ہو لیکن وہ کمال کو پہنچے ہیں اور نہ ہی پہنچ سکتے ہیں، الایہ کہ کوئی صحیح انقلاب آجائے۔ یہاں سے ارباب فہم و دانش بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ آخر کیوں عرب و عجم کے بعض اسلامی ممالک کے

سربراہان اُن ملاؤں کو سپورٹ کرتے ہیں جو معاویہ اور ہوامیہ کے گیت گاتے ہیں۔ فَعْتَبِرُوا

حاکم اگر صحابی ہو تو مواخذہ سے مستثنیٰ ہوتا ہے؟

یاد رکھنا چاہیے کہ اہل بیت کرام علیہم السلام اور حق پرست علماء کرام میں سے جس نے بھی معاویہ کی افراط و تفریط اور خلاف شریعت معاملات پر طعن و تشنیع کی ہے تو محض اسلام کی خاطر کی ہے، شیعیت و سنیت کی خاطر نہیں کی، کیونکہ معاویہ بن صحر شیعیت و سنیت کے مابین حد فاصل نہیں ہیں؟ وہ تو محض طلقاء میں سے ایک فرد تھے، جو لوگ انہیں صحابی مانتے ہیں انہیں یہ دھیان نہیں رہتا کہ وہ بیس سال تک بادشاہ بھی تو رہے، ورنہ طلقاء تو دوسرے لوگ بھی تھے، لہذا غور کرنا چاہیے کہ دوسرے طلقاء کی نسبت اُن کا مثنیٰ ذکر زیادہ کیوں ہوتا ہے؟ اگر وہ صحابی بھی تھے تو جتنا طویل عرصہ وہ اقتدار میں رہے اتنا کوئی دوسرا شخص نہیں رہا، سوا اگر صحابہ، تابعین اور اکابرین اسلام نے انہیں مورد طعن بنایا ہے تو نقطہ اُن کی اُس افراط و تفریط کی وجہ سے بتایا ہے جو کتاب و سنت کے خلاف تھی، جس کو امام ابن رشد نے انہدامِ خلافتِ راشدہ سے، علامہ ابوالکلام آزاد نے غیر اسلامی حکومت سے، علامہ حامد انصاری غازی نے مطلق العنانی سے اور علامہ سعید احمد اکبر آبادی نے شخصی حکومت، موروثی حکومت، جبر، قہر اور فساد و استبداد سے تعبیر کیا ہے۔

خود ہی سوچئے کہ اگر کوئی شخص اُن کی شانانہ افراط و تفریط، منافی کتاب و سنت معاملات اور خلفاء راشدین علیہ السلام کے تعامل کے خلاف امور پر طعن کرے تو اُسے صحابیت پر حملہ سمجھنا کہاں کی عقل مندی ہے؟ شانانہ اور غیر عادلانہ معاملات پر طعن کو صحابیت پر طعن سمجھنا تو ایسا ہے جیسا کہ پاکستان کے کرپٹ علماء کے خلاف بولنے کو اسلام کے خلاف بولنے کے مترادف سمجھا جاتا ہے، کرپٹ حکمرانوں کے خلاف آواز بلند کرنے کو جمہوریت کے خلاف سازش سمجھا جاتا ہے اور بادشاہیت اور سعودی حکومت کے خلاف آواز حق بلند کرنے کو حرمین شریفین کے خلاف سازش سمجھا جاتا ہے۔ ذرا اپنی مکمل عقل و علم کو بروئے کار لاتے ہوئے ایمان سے بنائیے گئے کیا کوئی صحابی کہا جانے والا شخص کتاب و سنت کے اوامر و نواہی سے ہالا اور عند اللہ اور عند الناس جو ابد ہی سے مبرا ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں اور ہرگز نہیں تو پھر کتاب و سنت کے منافی اقدامات پر آواز بلند کرنے کو ایک بادشاہ کے خلاف آواز بلند کرنے کی بجائے صحابی کے خلاف آواز بلند کرنا کیوں تصور کیا

جاتا ہے؟ اور پھر دیدہ دلیری یہ کہ کہا جاتا ہے کہ یہ صحابہ کرام علیہ السلام کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے، لہذا یہ صحابہ کرام کی گستاخی ہے۔ تنہا کوئی ظلیق اور جائز حاکم صحابہ کرام کیسے ہو گیا؟ کیا تنہا کسی کرپٹ ملاں پر طعن و تشنیع کو تمام علماء کرام پر طعن کہا جاسکتا ہے؟

نبوت کے علاوہ کوئی چیز گناہ پر وف نہیں

بلاشبہ جن دانس کے لیے صحابیت شرف و عظمت کا ایک عظیم ٹائٹل ہے مگر گناہ پر وف کوئی چیز نہیں۔ صحابیت کا ٹائٹل انسان کو ارتداد، شراب نوشی، زنا، بغاوت، بدعت، ضلالت، حسد، عناد، ظلم، جور، فساد، سب و شتم اور قتل ناحق وغیرہ اعمال سے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ چنانچہ امام سعد الدین تفتازانی سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے اعترافاً لکھتے ہیں:

يَعْنِي أَنَّ مَا وَقَعَ بَيْنَ الصَّحَابَةِ مِنَ الْمُحَارَبَاتِ وَالْمُشَاجَرَاتِ عَلَى
الْوَجْهِ الْمَسْطُورِ فِي كُتُبِ التَّوَارِيخِ ، وَالْمَذْكُورِ عَلَى أَلْسِنَةِ الْبِقَاةِ يَدُلُّ
بِظَاهِرِهِ عَلَى أَنَّ بَعْضَهُمْ قَدْ حَادَ عَنْ طَرِيقِ الْحَقِّ ، وَبَلَغَ حَدَّ الظُّلْمِ
وَالْفُسْكِ . وَكَانَ الْبَاعِثُ لَهُ الْحَقْدُ وَالْعِنَادُ ، وَالْحَسَدُ وَاللِّدَادُ ، وَطَلَبُ
الْمَالِ وَالرِّيَاسَةِ وَالْمِيلَ إِلَى اللَّذَاتِ وَالشَّهَوَاتِ . إِذْ لَيْسَ كُلُّ صَحَابِيٍّ
مَعْصُومًا ، وَلَا كُلُّ مَنْ لَقِيَ النَّبِيَّ ﷺ بِالْخَيْرِ مُوسُومًا .

”یعنی صحابہ کے مابین جو مشاجرات اور جنگیں ہوئیں جیسا کہ تاریخ میں مرقوم اور ثقہ حضرات کی زبانوں پر مذکور ہے، یہ سب کچھ اپنے ظاہر سے دلالت کر رہا ہے کہ بعض صحابہ راہ حق سے ہٹ گئے تھے اور ظلم و فسق کی حد کو پہنچ گئے تھے، اور اس کا سبب کینہ، عناد، حسد، سخت جھگڑا لوہین، مال اور ریاست کی طلب اور لذتوں اور شہوتوں کی طرف میلان تھا، کیونکہ ہر ایک صحابی معصوم ہے اور نہ ہی نبی کریم ﷺ سے ملاقات کرنے والا ہر شخص خیر سے موسوم ہے۔“

سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کا تدبر

جب خلفاء راشدین علیہ السلام نے خود کو جوابدہی اور مواخذہ سے مبرا نہیں سمجھا تھا تو پھر اگر کوئی صحابی خلیفہ نہیں بلکہ فقط بادشاہ ہو تو وہ کیونکر مبرا ہو سکتا ہے؟ سو جب کتاب وسنت کے اوامر و نواہی سے کوئی مبرا نہیں ہے تو جوابدہی اور مواخذہ سے بھی کوئی مبرا نہیں ہو سکتا، یہی وجہ ہے کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے امور حکومت معاویہ کو سونپتے ہوئے شرائط طے فرمائیں کہ اُسے کتاب وسنت پر قائم رہنا ہوگا اور وہ مسلمانوں کی مجلس شوریٰ کے بغیر اپنے بعد کسی کو ولی عہد نہیں بنائے گا۔ ظاہر ہے کہ جب معاہدہ میں یہ شرائط لکھی گئیں تو اب اُن پر پھر بھی دیا جائے گا کہ پوری کی گئیں یا نہیں؟ اگر پوری کی گئیں تو قیامت تک مدحت ورنہ قیامت تک مذمت۔ اس لحاظ سے یہ سیدنا امام حسن علیہ السلام کی دوراندیشی، اعلیٰ فراست اور مخصوص فہم کی دلیل ہے۔

اب آپ ہی بتلائیے کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی عائد فرمودہ شرائط کو معاویہ کا اُن کے رو برو تسلیم کرنا اور بعد میں انہیں پورا نہ کرنا، کیا کتاب وسنت کی خلاف ورزی نہیں؟ اگر خلاف ورزی ہے تو کیا اُس خلاف ورزی پر فقط اس لیے کلام نہیں کیا جاسکتا کہ جس بادشاہ سے وہ خلاف ورزی ہوئی وہ صحابی تھا؟ کیا کتاب وسنت میں ایسی کوئی تصریح ہے کہ اگر کوئی صحابی حاکم ہو تو کسی بھی قسم کی افراط و تفریط پر اُس کا مواخذہ ہوگا اور نہ ہی وہ دنیا میں جواب دہ ہوگا اور نہ ہی اُس کی افراط و تفریط پر لب کشائی جائز ہوگی؟

بادشاہ پھر اعتراضات و مواخذہ سے مستثنیٰ؟

صحابہ کرام علیہم السلام نے تو خلفاء راشدین علیہم السلام کو بھی اعتراضات و مواخذہ سے مستثنیٰ نہیں سمجھا تھا جبکہ کچھ احمق لوگ بادشاہوں کو بھی اعتراضات و مواخذہ سے مستثنیٰ سمجھتے ہیں، اور یہ کھلی گمراہی ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ جس قدر بھی فقہاء اور علماء اسلام نے معاویہ کی افراط و تفریط پر کلام کیا ہے، اُس کلام کا رخ فقط معاویہ کی بادشاہت و اقتدار کی طرف ہے۔ اگر وہ اقتدار نہ سنبھالتے تو اُن کا منفی ذکر تو کجا مثبت ذکر بھی نہ ہوتا، اور وہ دوسرے طلقاء کی مانند طاق نسیاں میں پڑے ہوتے۔ آپ اپنے ہی دور میں غور و فکر کر کے دیکھ لیجئے! جو علماء کرام سیاست میں آتے ہیں تو اُن کا چہ منہ ہو یا مثبت اُن علماء سے زیادہ ہوتا ہے جو سیاست سے دور

رہتے ہیں۔ الیکٹرانک یا پرنٹ میڈیا پر تبصرے، کارٹون اور ڈمی وغیرہ فقط اُن علماء کی بنتی ہے جو کلمی یا جزوی اقتدار کے مزے لوٹتے ہیں۔ سو خود ہی بتلائیے کہ اگر کوئی عالم دین سیاست میں آکر بالواسطہ یا بلاواسطہ ناجائز طریقے سے فوائدِ مالیہ حاصل کرے اور اُس پر دیدہ و حضرات تبصرہ کریں تو ایسے کسی بھی تبصرہ کو اسلام کے خلاف سازش یا تنہا اُس عالم کے خلاف آواز بلند کرنے کو تمام علماء اسلام کی تنقیص یا توہین قرار دینا کہاں کا انصاف ہے؟ سو جب کسی ایک عالم دین کی بے اعتدالیوں پر کلام کرنے کو تمام علماء کرام کی بے ادبی نہیں سمجھا جاتا تو پھر کسی صحابی کہلانے والے واحد شخص کی بے اعتدالیوں پر کلام کرنے کو تمام صحابہ کرام کی بے ادبی کیونکر تصور کیا جاتا ہے؟

سب و شتم نہ کرنے کی شرط دھجیاں

پانچویں شرط یہ تھی کہ مولا علیؑ پر سب و شتم نہیں کیا جائے گا۔ اس کی دھجیاں یوں اڑائی گئیں کہ اسی دن سے ہی پھر سے سب و شتم کا سلسلہ شروع کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ ابو القداء عماد الدین بن اسماعیل شافعی متوفی ۷۳۲ھ لکھتے ہیں:

كَانَ خُلَفَاءُ بَنِي أُمَيَّةَ يَسُبُّونَ عَلِيًّا ؑ مِنْ سَنَةِ إِحْدَى وَأَرْبَعِينَ ،
وَهِيَ السَّنَةُ الَّتِي خَلَعَ الْحَسَنُ فِيهَا لِقَاءَهُ مِنَ الْخِلَافَةِ إِلَى أَوَّلِ سَنَةِ
بِسْعٍ وَتِسْعِينَ ، آخِرَ أَيَّامِ سُلَيْمَانَ بْنِ عَبْدِ الْمَلِكِ ، فَلَمَّا وَلَّى عُمَرُ
أَبْطَلَ ذَلِكَ .

”خلفاء بنو امیہ نے سیدنا علیؑ پر ۴۱ھ سے، جب امام حسن مجتبیٰؑ خلافت سے دست بردار ہوئے تھے (زور و شور سے) سب و شتم شروع کیا اور یہ سلسلہ ۹۹ھ سلیمان بن عبد الملک کے آخری ایام تک جاری رہا، پھر جب سیدنا عمر بن عبد العزیزؑ نے خلافت سنبھالی تو انہوں نے اس کو ختم کیا۔“

(المختصر فی أخبار البشر ج ۱ ص ۲۰۱)

اس مسئلہ کی مکمل اور مدلل تفصیل ہماری کتاب ”لَا تَسُبُّوا أَصْحَابِي“ (میرے صحابہ کو برا نہ کہو)

میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

صلح حسن کی رٹ لگانے والوں سے سوال

یہاں اُن لوگوں سے سوال ہے جو صلح امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام سے اہلیت و معاویہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ کیا وہ یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ جس شخص کے ساتھ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے معاہدہ کرتے ہوئے یہ شرط لکھوانا ناگزیر سمجھا کہ جب وہ مکمل اقتدار سنبھالے تو اُن کے بابا کو سب و شتم کرنے سے باز آجائے، ایسی شرط لکھوانے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی اور کیا اس قسم کی شرط کسی راشد، ہادی اور مہدی شخص کے ساتھ طے کرنے کی ضرورت ہوتی ہے؟

اس مقام پر میں تمام اہل دل مسلمانوں سے حق کا واسطہ دے کر غور و فکر کرنے کی اپیل کرتا ہوں کہ وہ ذرا اُس منظر کو چشم تصور میں لائیں کہ جب دل ربائے مرتضیٰ، جگر گوشہ زہرا اور شبیہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرائط لکھوائی ہوں گی اور بزبان قلم معاویہ سے مخاطب ہوئے ہوں گے کہ تحفظِ خونِ مسلمین کی خاطر ہم مملکت اسلامیہ تو تمہارے سپرد کر دیتے ہیں مگر تم وعدہ کرو کہ ہمارے بابا کو سب و شتم کرنے سے باز آ جاؤ گے۔ خود سوچئے ایسی شرط لکھواتے وقت امام پاک کے قلبِ اقدس کی کیفیت کیا ہوگی؟ وہ کیا سوچ رہے ہوں گے کہ کیسے شخص کو اقتدار سونپنا پڑ گیا ہے؟ کیا وہ یہ نہیں سوچتے ہوں گے کہ کیا وقت آ گیا ہے کہ ایک مسلمان کہلانے والے شخص کے ساتھ معاہدہ کرتے ہوئے یہ لکھوانا ناگزیر ہو گیا ہے کہ وہ شخص اپنی حکومت میں محبوبِ خدا و مصطفیٰ علی المرتضیٰ علیہ السلام و الرضا پر سب و شتم نہیں کرے گا؟ خدا را فرما سوچئے تو سہی! اہل بیت کرام علیہم السلام پر کیسے کیسے وقت آئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

چھٹی شرط کا حلیہ کیسے بگاڑا؟

چھٹی شرط یہ تھی کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو فہ کے بیت المال سے پانچ لاکھ درہم لیں گے اور دارا بجز دکانِ خراج اُنہی کے لیے ہوگا۔ اس شرط کا حلیہ یوں بگاڑا گیا کہ ایک طرف تو معاویہ نے اس شرط کو قبول کر لیا مگر دوسری طرف اہل بصرہ کو سمجھا دیا کہ وہ دارا بجز اپنے پاس ہی رکھیں۔ چنانچہ ابن اثیر جزی لکھتے ہیں:

وَأَمَّا خِرَاجُ دَارِ أَبِجَرْدَ ، فَإِنَّ أَهْلَ الْبَصْرَةِ مَتَعُوهُ مِنْهُ وَقَالُوا : هُوَ قَيْمُنَا لَا نُعْطِيهِ أَحَدًا ، وَكَانَ مِنْهُمْ بِأَمْرِ مُعَاوِيَةَ أَيْضًا .

”اور رہا دارا بجر کا خراج تو اُسے اہل بصرہ نے امام پاک سے روک لیا اور کہا: یہ ہمارا حصہ ہے، ہم یہ کسی کو نہیں دیں گے، اور اُن کا یہ منع کرنا بھی معاویہ کے حکم سے تھا۔“

(الکامل فی التاریخ ج ۳ ص ۶)

حافظ ابن عساکر لکھتے ہیں:

وَدَسَّ مُعَاوِيَةَ إِلَى أَهْلِ الْبَصْرَةِ فَطَرَدُوا وَكَيْلَ الْحَسَنِ وَقَالُوا: لَا تُحْمَلُ قِيَامُنَا إِلَى غَيْرِنَا .

”اور معاویہ نے اہل بصرہ کو چال سمجھائی تو انہوں نے سیدنا امام حسن علیہ السلام کے نمائندہ کو دھتکار دیا اور کہا: ہمارا حصہ کسی اور کی طرف نہیں لے جایا جاسکتا۔“

(تاریخ دمشق ج ۱۳ ص ۲۶۶)

اس سے دو باتیں نکلتی ہیں: ایک تو یہ کہ امیر شام وعدہ کر کے مکر گئے اور دوسری یہ کہ اہل بصرہ سے یہ کہلوا کر کہ یہ اُن ہی کا حصہ ہے، نہ صرف یہ کہ امام پاک کی طرف ناحق مطالبہ کی نسبت کی بلکہ انہیں غلط ثابت کرنے کی کوشش بھی کی۔ خود سوچئے! جن ہستیوں پر صدقات و زکوٰۃ تک حرام تھی اور جن کی ایسی تربیت کی گئی تھی کہ انہوں نے بچپن میں بیت المال کی کھجور کا ایک دانہ اپنے منہ میں لے لیا تھا تو آقا علیہ السلام نے گُخْ گُخْ فرماتے ہوئے وہ دانہ اُن کے منہ مبارک سے نکلوا دیا تھا، اُن کے بارے میں یہ کیونکر تصور کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے کسی ناجائز مال کا مطالبہ کیا ہوگا؟

کیا کوئی ایک شرط پوری بھی ہوئی؟

متعدد کتب تاریخ میں ہے کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام از خود صلح کے خواہاں ہوئے اور معاویہ کی طرف شرائط صلح لکھ بھیجیں، جبکہ اُن کتب میں یہ بھی مذکور ہے کہ ابن مسعر نے ہی صلح کی پیش کش کی اور مہرزادہ ایک سادہ کاغذ امام حسن علیہ السلام کی طرف بھیجا اور کہا کہ آپ اس میں جو چاہیں شرائط لکھ دیں، مجھے قبول ہوں گی۔

حدیث کی کتب صحاح سے دوسرے قول کی تائید ملتی ہے۔ کتب تاریخ میں سے جس کتاب میں یہ دونوں قول مذکور ہیں وہاں یہ تطبیق دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک شرائط نامہ امام پاک کی طرف سے روانہ کروایا گیا تھا اور اُس میں مرقوم شرائط کو معاویہ نے تسلیم کر کے واپس روانہ کر دیا تھا، جبکہ اُس نے اپنی طرف سے مہر زدہ ایک سادہ کاغذ بھی امام پاک کی طرف ارسال کیا ہوا تھا جو ابھی امام پاک تک نہیں پہنچا تھا۔ جب وہ کاغذ امام پاک کو موصول ہوا تو اُس کے ساتھ دوسرے کاغذ پر لکھا ہوا تھا کہ اس میں آپ جو چاہیں شرائط لکھ دیں ہمیں قبول ہوں گی۔ امام پاک نے اُس میں پہلے سے دو گنا زیادہ شرائط لکھ دیں، پھر جب امام پاک کی معاویہ سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے اُن شرائط کو پورا کرنے کا مطالبہ فرمایا تو معاویہ نے کہا: پہلی مرتبہ جو آپ نے شرائط لکھ کر بھیجی تھیں بس وہی منظور ہیں دوسری نہیں۔ چنانچہ مورخین ۴۱ھ کے حالات میں لکھتے ہیں:

فَلَمَّا اتَّفَقَ مُعَاوِيَةُ وَالْحَسَنُ عَلَيْهِ السَّلَامُ سَأَلَهُ الْحَسَنُ أَنْ يُعْطِيَهُ
الشَّرْوَطَ الَّتِي شَرَطَ فِي السَّجْلِ الَّتِي خَتَمَ مُعَاوِيَةُ فِي أَسْفَلِهِ ، فَأَبَى
مُعَاوِيَةُ أَنْ يُعْطِيَهُ ذَلِكَ ، فَقَالَ : لَكَ مَا كُنْتَ كَتَبْتَ إِلَيَّ أَوْ لَا تَسْأَلْنِي
أَنْ أُعْطِيَكَ ، فَبِإِنِّي قَدْ أُعْطِيتُكَ حِينَ جَاءَ بِي كِتَابُكَ . قَالَ الْحَسَنُ
عَلَيْهِ السَّلَامُ : وَأَنَا قَدْ اشْتَرَطْتُ حِينَ جَاءَ بِي كِتَابُكَ ، وَأُعْطِيتَنِي الْعَهْدَ
عَلَى الْوَفَاءِ بِمَا فِيهِ . فَاخْتَلَفَا فِي ذَلِكَ ، فَلَمْ يَنْفُذْ لِلْحَسَنِ عَلَيْهِ السَّلَامُ
مِنَ الشَّرْوَطِ شَيْئًا .

”پھر جب معاویہ اور امام حسن ؓ کی ملاقات ہوئی تو امام پاک نے اُن سے اُن شرائط کو پورا کرنے کا مطالبہ کیا جو انہوں نے اُس کاغذ پر لکھی تھیں جس کو معاویہ نے مہر لگا کر بھیجا تھا تو معاویہ نے وہ شرائط پوری کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا: جو کچھ آپ نے اولاً میرے پاس لکھ کر بھیجا تھا اور مانگا تھا تو وہ میں نے اُسی وقت دے دیا تھا جب آپ کی تحریر میرے پاس پہنچی تھی۔ سیدنا امام حسن ؓ نے فرمایا: میں نے تو آپ کے ساتھ اُس وقت شرائط طے کیں جس وقت آپ کی تحریر میرے پاس پہنچی

اور جو کچھ میں نے اُس میں لکھا اُس کو پورا کرنے کا آپ نے میرے ساتھ وعدہ کیا۔
پس اس بات پر دونوں میں اختلاف ہو گیا تو معاویہ نے شرائط میں سے کچھ بھی سیدنا
امام حسن علیہ السلام کے لیے جاری نہ کیا۔

(تاریخ الطبری ج ۵ ص ۱۶۲، ۱۶۳؛ تاریخ دمشق ج ۱۳ ص ۲۷۲؛ مرآة الزمان لسبط ابن
الجوزی ج ۷ ص ۹؛ الكامل فی التاريخ ج ۳ ص ۶۶۵؛ تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص ۶۴۸، ۶۴۹،
و مترجم اردو ج ۳ ص ۳۴۶)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی لکھا ہے:
فَلَمْ يَنْقُذْ لِلْحَسَنِ مِنَ الشَّرْطَيْنِ شَيْءًا.
”پس اُس نے امام حسن کے لیے دونوں شرطوں میں سے کچھ بھی پورا نہ کیا۔“

(فتح الباری ج ۱۶ ص ۵۳۲)

اُس دور کے بعض جہاندیدہ حضرات نے تو یہاں تک کہا ہے کہ سادہ کاغذ پر مہر لگا کر بھیجتا ہی ایک
چال تھی۔ چنانچہ علامہ سبط ابن الجوزی لکھتے ہیں:

قَالَ الزُّهْرِيُّ: وَلَا مَعْنَى لِيَخْتِمَ مُعَاوِيَةُ عَلَى أَسْفَلِ الصَّحِيفَةِ الْبَيْضَاءِ إِلَّا
مُكَايَدَةُ الْحَسَنِ وَمُعَادَاةً وَمُغَالَطَةً.

”امام زہری فرماتے ہیں: معاویہ کا سفید کاغذ کے نچلے حصہ پر مہر لگا کر بھیجنا امام حسن
مجتبیٰ علیہ السلام کے ساتھ فریب، دھوکہ اور مغالطہ آفرینی کے علاوہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔“

(مرآة الزمان ج ۷ ص ۹)

خیال رہے کہ بعض کتب میں شرائط کے ذکر کے بعد یہ الفاظ بھی آئے ہیں:
فَأَجَابَهُ مُعَاوِيَةُ، وَأَعْطَاهُ مَا سَأَلَ.

”تو معاویہ نے اُن کی بات قبول کی اور جو انہوں نے مانگا وہ انہیں دے دیا۔“

(تاریخ دمشق ج ۱۳ ص ۲۶۴؛ سیر أعلام النبلاء ج ۳ ص ۲۶۴)

اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ فی الفور معاویہ نے مثبت جواب دیا اور شرائط تسلیم کیں، ورنہ آگے چل کر کسی بھی شرط کو پورا نہیں کیا تھا، جیسا کہ ہم ایک ایک شرط پر تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔

یہاں قارئین کرام کو یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ یہ وہی صاحب تھے جنہوں نے صفین میں قرآن نيزوں پر آویزاں کر کے امام حسن مجتبیٰ کے بابا کریم علیہما السلام کے ساتھ ایک معاہدہ کیا تھا، جو حکیم کے نام سے مشہور ہے، مگر اُسے نبھایا نہیں تھا، اسی لیے سیدنا علیؑ پھر سے اُن کی بغاوت کو کچلنے کی تیاریوں میں مشغول تھے کہ انہیں شہید کر دیا گیا، سیدنا امام حسنؑ اپنے بابا کریمؑ کے اُسی جمع کردہ لشکر کو لے کر میدان میں آئے تھے تو معاویہ بن ابی سفیان نے اُن کے ساتھ بھی اُسی طرح معاہدہ کیا تھا اور اُسی طرح ہی نبھایا تھا۔ **لَا فُتُوهُمْ وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِينَ۔**

تنبیہ

خبردار! یہاں یہ مت سمجھا جائے کہ یہ قدسی صفت ہستیاں لوگوں کی چال بازیوں کو سمجھنے سے قاصر تھیں۔ نہیں بلکہ وہ ہستیاں سب چالاکیاں سمجھتی تھیں مگر حالات کی مجبوری کو مد نظر رکھتے ہوئے تمام لوگوں کے سامنے شرائط طے کر کے معاہدہ کرتی رہیں، تاکہ ایک طرف وہ خود عند اللہ سرخرو ہوں اور دوسری طرف فریق مخالف کی عند اللہ اور عند الناس اصلیت بھی ظاہر ہو جائے۔ غالباً یہ مولیٰ علیؑ ہی کا قول ہے کہ کم ظرف لوگوں کو منصب نہیں بدلتا بلکہ اُن کی اصلیت عیاں ہو جاتی ہے۔ یعنی **Expose** ہو جاتے ہیں۔ سونا، سونا ہی رہتا ہے اگرچہ وہ کچڑ میں ہی کیوں نہ پڑا ہو، اور تانبا تانبا ہی رہتا ہے اگرچہ اُسے ماتھے پر ہی کیوں نہ سجایا ہو۔ اسی لیے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا:

النَّاسُ مَعَادِنٌ كَمَعَادِنِ الْفِضَّةِ وَالذَّهَبِ ، خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ.

”لوگ سونے چاندی کی کانوں کی مانند کانیں ہیں، جو زمانہ جاہلیت میں اچھے تھے وہ زمانہ اسلام میں بھی اچھے ہیں۔“

(صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب الأرواح جنود مجنونة، ص ۱۲۱۸ حدیث ۲۶۳۸)

عہد شکن کے بارے میں حکم

قارئین کرام! معاہدہ صلح میں جو شرائط طے ہوئی تھیں اُن میں سے جن موٹی موٹی شرائط پر اب تک ہم کلام کر چکے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

- ۱۔ خلافت پھر امام حسن کو لوٹا دی جائے گی
- ۲۔ معاویہ کو کتاب و سنت کے مطابق چلنا ہوگا
- ۳۔ خلفاء راشدین ؓ کے طریقے پر چلنا ہوگا
- ۴۔ معاویہ کے بعد خلافت کا معاملہ شورشی طے کرے گی
- ۵۔ مولا علی ؓ پر سب و شتم نہیں کیا جائے گا
- ۶۔ کچھ مالی شرائط

ان میں سے اول الذکر پانچ شرائط کی تو سراسر خلاف ورزی کی گئی، اور چھٹی شرط کو بھی حسب تحریر پورا نہیں کیا گیا، البتہ اگر دوسرے اہل اسلام کی طرح حسنین کریمین علیہما السلام کو بھی اُن کا حصہ دیا جاتا رہا ہو تو وہ معاہدہ سے الگ معاملہ ہے، اور اس پر ہم آئندہ سطور میں بات کریں گے۔ یہاں ہم پہلے وہ احادیث پیش کر رہے ہیں جو عہد شکن لوگوں کے بارے میں آئی ہیں اور پھر ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ کیا قرآن اول سے لے کر اب تک ایسی احادیث کے حکم سے مسلمانوں کا کوئی طبقہ مستثنیٰ بھی ہے؟ مثلاً ایک حدیث میں ہے:

لَا يُثْمَانُ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ وَلَا دِينَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ.

”وہ شخص ایمان دار نہیں جو امانت دار نہیں اور وہ دین دار نہیں جو عہد کا پاس دار نہیں۔“

(صحیح ابن حبان ج ۱ ص ۴۲۲، ۴۲۳ حدیث ۱۹۴؛ الجامع الصغیر حدیث ۹۶۸۵)

ایک اور حدیث اِن الفاظ سے بھی آئی ہے:

آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ ، وَإِذَا

اتَّخَذَ خِيَانًا.

”منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو

اُس کے خلاف کرے اور جب اُسے امانت دی جائے تو وہ خیانت کرے۔“

(بخاری ص ۱۱ حدیث ۳۳)

صحیح مسلم میں یہ الفاظ بھی ہیں:

وَإِنْ صَامَ وَصَلَّى وَزَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ.

”اگر چہ روزے رکھے، نماز پڑھے اور خود کو مسلمان سمجھے۔“

(صحیح مسلم ص ۴۷ حدیث ۱۰۹، ۱۱۰؛ مشکاة المصابیح ج ۱ ص ۲۳ حدیث ۵۵)

ایک اور حدیث میں ”وَزَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ“ کی بجائے یہ الفاظ ہیں:

وَقَالَ: إِنِّي مُسْلِمٌ.

”اور وہ کہے: میں مسلمان ہوں۔“

(مسند ابی یعلیٰ ج ۷ ص ۱۳۶ حدیث ۴۰۹۸)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

أَرْبَعُ خِلَالٍ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا: مَنْ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ،

وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا عَاهَدَ خَدَرَ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ، وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ

خُصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيهِ خُصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتَّى يَدْعَاهَا.

”جس شخص میں چار باتیں پائی جائیں تو وہ پکا منافق ہے: وہ شخص کہ جب بات

کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے، معاہدہ کرے تو دھوکہ

دے اور جب جھگڑا کرے تو بدکلامی کرے، اور جس شخص کے اندر ان میں سے کوئی

ایک خصلت ہو تو اُس میں نفاق کی ایک خصلت باقی رہے گی یہاں تک کہ وہ اُسے

چھوڑ دے۔“

(بخاری ص ۴۳۱ حدیث ۳۱۷۸؛ مسلم ص ۴۶ حدیث ۱۰۶)

میں نے بہت تلاش کیا کہ کتاب و سنت کی کوئی ایسی تصریح مل جائے جس میں یہ مذکور ہو کہ کسی صحابی،

فقیر اور مجتہد انسان میں مذکورہ بالا چاروں باتیں یا اُن میں سے بعض باتیں پائی جائیں تو وہ صحابیت، نقاہت اور اجتہاد کی بدولت اس حکم سے مستثنیٰ ہو، مگر مجھے ایسی کوئی صراحت نہیں ملی۔ اگر مستند، معتبر، ماہر، کہنہ مشق اور جید علماء کرام کو کوئی ایسی استثنائی صورت مل جائے تو ضرور آگاہ فرمائیے گا۔

مالکان کو شرمحتاج اور طلقاء ذوالعطاء؟

چونکہ شرائط صلح حسن مجتبیٰ (علیہ السلام) میں چھٹی شرط کا تعلق مالی معاملہ سے ہے، جس کو اُس کی اصل صورت میں پورا نہ کیا گیا، تاہم بعض کتب میں جہاں یہ مذکور ہے کہ موصوف نے خراج دارا بجز کی شرط کو تسلیم کرنے کے باوجود پورا نہ کیا اور ابن عساکر وغیرہ کی روایت کے مطابق دھوکہ کیا، وہیں یہ بھی مذکور ہے:

فَأَجْرِي مُعَاوِيَةَ عَلَى الْحَسَنِ كُلَّ مِئَةِ أَلْفٍ دِرْهَمٍ ، وَعَاشَ الْحَسَنُ
بَعْدَ ذَلِكَ عَشْرَ سِنِينَ .

”پھر معاویہ نے امام حسن (علیہ السلام) کے لیے ہر سال دس لاکھ درہم جاری کر دیے، اور اُس کے بعد امام حسن (علیہ السلام) دس سال حیات رہے۔“

(تاریخ دمشق ج ۱۳ ص ۲۶۶؛ سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۲۶۴)

اقتدار پر براجمان یا اقتدار حاصل کرنے والے شخص کے ساتھ مالی معاملات کی اس قسم کی جتنی بھی شرائط طے کی جاتی ہیں اُن کی نوعیت ایسے حقوق کی ہوتی ہے جیسا کہ وفاق پر صوبوں کا حق، لہذا ایسی کسی بھی مالی صورت کو منصب پر براجمان شخص کی فیاضی، سخاوت اور عطا نہیں کہا جاسکتا۔ مثلاً اگر ملک کا بادشاہ یا وزیر اعظم کسی صوبہ کے چیف منسٹر یا منسٹر کو کوئی فنڈ دے تو اُسے بادشاہ کی سخاوت یا عطا نہیں کہا جاسکتا، ہاں اگر بادشاہ اپنے ایسے ذاتی مال سے لوگوں پر خرچ کرے جس کو اُس نے خود کمایا تھا یا اُس کو اُس کے ماں باپ کی طرف سے وراثہ ملا تھا تو اُسے عطا، فیاضی اور سخاوت کہنا درست ہے۔

خلفاء راشدین (علیہم السلام) یا اوائل اسلام کی بادشاہت میں ملک کے گورنروں، سربراہان و درجہ شخصیتوں یا حامی مسلمانوں کو جو مال دیا جاتا تھا وہ اُن کا حق تھا۔ مال دینے کی ایسی صورت کو جس طرح عطاء، صدیقی، عطیہ فاروقی، سخاوت عثمانی اور ایثار مرتضوی نہیں کہا جاسکتا اسی طرح معاویہ کے ہاتھوں سے جو مال نکلتا تھا اُسے

بھی عطیہ اموی اور سخاوت معاویہ نہیں کہا جاسکتا۔ ہاں اقتدار سے قبل خلفاء راشدین ؓ اپنی اپنی استطاعت کے مطابق اسلام اور اہل اسلام پر جو کچھ خرچ کرتے رہے وہ اُن کا جو دعو عطا تھا، مثلاً سیدنا ابو بکر صدیق ؓ کا پورا مال خرچ کرنا، سیدنا عمر ؓ کا آدھا مال خرچ کرنا، سیدنا عثمان غنی ؓ کا غزوہ تبوک وغیرہ مواقع پر خرچ کرنا اور سیدنا مولیٰ علی ؓ کا حالت نماز میں انگوشی فقیر کو دینا، آقا ؐ کے ساتھ سرگوشی کرنے سے قبل بعض ضرورت مندوں کو خیرات دینا اور مسلسل تین دن تک افطار کے وقت اپنا کھل کھانا مسکین، یتیم اور اسیر کو دے دینا، ایسے تمام انفاقات کا شمار یقیناً خلفاء اربعہ ؓ کے جو دعو عطا میں ہوتا ہے۔

معاویہ کی طرف سے بھی اگر اقتدار سے قبل اسلام اور اہل اسلام پر خرچ کرنا ثابت ہو جائے تو یقیناً وہ بھی اُن کا جو دعو عطا سمجھا جائے گا مگر ایسی کسی صورت کا ہونا مشکل ہے، کیونکہ معاویہ بن ابی سفیان تنگ دست آدمی تھے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو اُن کے شوہر نے طلاق دے دی تو وہ عدت گزارنے کے بعد بارگاہ نبوی ﷺ میں مشورہ کے لیے حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ انہیں دو شخصوں نے نکاح کا پیغام بھیجا ہے، جن میں سے ایک معاویہ بن ابی سفیان اور دوسرے ابو جہم ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

أَمَّا مُعَاوِيَةُ فَصُغْلُوكَ لَا مَالَ لَهُ.

”رہا معاویہ تو وہ محتاج ہے، اس کے پاس کوئی مال نہیں۔“

(مسلم: کتاب الطلاق، باب المطلقۃ ثلاثاً لا نفقة لہا، ص ۶۸۶ حدیث ۱۴۸۰)

فتح مکہ کے موقع پر جب وہ، اُن کے ماں باپ اور بھائی مجبوراً اسلام میں داخل ہوئے تو مال لیتے تو رہے مگر خرچ نہیں کیا حتیٰ کہ اقتدار پر جا پہنچے۔ پھر جب وہ اقتدار پر براجمان ہوئے تو اُن کا ملکی وسائل سے کسی مسلم یا غیر مسلم کو کچھ دینا جو دوسخا نہیں تھا بلکہ وہ مسلمانوں اور دوسرے انسانوں کا وہ حق تھا جو اُن کے دستِ تصرف میں چلا گیا تھا۔

کیا رعایا کا حق رعایا کو دینا سخاوت ہے؟

بعض لوگوں کی سادگی یا سفاہت کی حد ہے کہ ابنِ محرز پر مملکتِ اسلامیہ کے سربراہ کی حیثیت سے

رعایا کے جو حقوق تھے اور جنہیں ادا کرنا اُن کے فرائض منصبی میں شامل تھا، اُسے وہ عام رعایا پر ہی نہیں بلکہ اہل بیت کرام علیہم السلام پر بھی سخاوت معاویہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں، حالانکہ لفظ سخاوت بولتے ہوئے جہاں ایک طرف سخی کا تو دوسری طرف ضرورت مند یا محتاج کا تصور ابھرتا ہے۔ خود غور فرمائیے! جب یوں کہا جائے کہ فلاں نے فلاں پر سخاوت کی تو ذہن میں کیسا تصور آتا ہے؟ یاد رکھئے! حکمرانوں کے دست تصرف میں جو رعایا کے مالی حقوق ہوتے ہیں اُن کی ادائیگی کو حکمرانوں کا جو دوسخا تو کیا نذرانہ بھی نہیں کہا جا سکتا مگر افسوس کی بات ہے کہ معاویہ کی جانب سے اُن حقوق کی ادائیگی کو دکلاء و طلقاء تمام اہل اسلام پر تو کیا سید بن حسنین کریمین علیہ السلام پر بھی معاویہ کے جو دوسخا اور فیاضی سے تعبیر کرتے ہیں۔ بعض لوگ حقوق کی اس ادائیگی کو نذرانے کا نام بھی دیتے ہیں۔ گویا ایسے سب لوگوں کے نزدیک معاویہ بن ابی سفیان معطی، محسن اور نذرانہ پیش کرنے والا، جبکہ حسنین کریمین محتاج، ممنون اور بنوامیہ کے نذرانوں پر گزارا کرنے والے تھے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔

میرے سامنے دکلائے ملوکیت کی ایسی متعدد بے ڈھنگی تصریحات موجود ہیں مگر میں ایسے تمام اقتباسات سے صرف نظر کرتے ہوئے یہاں شاہی مال کی ادائیگی کی حقیقت کو آپ کے سامنے رکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ امام ابو بکر احمد بن علی بھاص رازی حنفی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۳۷۰ھ نے پہلے مشہور (نام نہاد خلیفہ) عبدالملک اور حجاج کا ظالم ہونا بیان کیا پھر اُن کے ہاتھوں سے صلحاء لوگ جو مالی حصے (جنہیں بعض احمق لوگ عطائیں قرار دیتے ہیں) قبول کرتے رہے، اُس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ یہ اُن صلحاء کے حقوق تھے جو اُن ظالم بادشاہوں کے ہاتھوں میں چلے گئے تھے، سو وہ صلحاء کرام اپنے ہی حقوق وصول فرماتے رہے۔ اس کے بعد امام بھاص نے بعض حکمرانوں کا نام لے کر انہیں بھی ظالموں کی اُسی فہرست میں شامل رکھا ہے۔ ذرا غور سے پڑھئے! وہ لکھتے ہیں:

وَكَذَلِكَ كَانَ سَبِيلُ مَنْ قَبْلَهُمْ مَعَ مُعَاوِيَةَ حِينَ تَقَلَّبَ عَلَى الْأَمْرِ
بَعْدَ قَتْلِ عَلِيٍّ عليه السلام، وَقَدْ كَانَ الْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ يَأْخُذَانِ الْعَطَاءَ،
وَكَذَلِكَ مَنْ كَانَ فِي ذَلِكَ الْعَصْرِ مِنَ الصَّحَابَةِ، وَهُمْ غَيْرُ مَوْتَلَيْنِ

لَهُ بَلْ مُتَبَرِّؤُونَ مِنْهُ عَلَى السَّبِيلِ الَّتِي كَانَ عَلَيْهَا عَلِيُّ عَلَيْهِ السَّلَامُ إِلَى أَنْ تَوَفَّاهُ
اللَّهُ تَعَالَى إِلَى جَنَّتِهِ وَرَحْوَاتِهِ ، فَلَيْسَ إِذَا لَبِيَ وَلَا يَتَى الْقَضَاءِ مِنْ قِبَلِهِمْ
وَلَا أَخَذَ الْعَطَاءِ مِنْهُمْ دَلَالَةً عَلَى تَوَلَّيْتِهِمْ وَاعْتِقَادِ إِمَامَتِهِمْ۔

”اور یہی طریقہ اُن سے ما قبل لوگوں کا معاویہ کے ساتھ رہا، جب اُس نے سیدنا
علیؑ کی شہادت کے بعد حکومت پر غلبہ پایا تو سیدین حسنینؑ کریمین علیہما السلام حصہ
وصول فرماتے رہے، اور اسی طرح اُسی زمانے کے صحابہ اور دوسرے حضرات کا طریقہ
رہا، وہ معاویہ سے محبت کرنے والے نہیں بلکہ اُس سے اُسی طرح نفرت کرنے والے
تھے جس طرح سیدنا علیؑ نفرت کرتے تھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں
وفات دی اور اپنی جنت و رضا میں جگہ دی۔ پس اُن حکمرانوں سے قضا کے عہدہ کو قبول
کرنا اور اُن سے وظیفہ وصول کرنا اُن سے محبت اور اُن کی خلافت کی حقانیت کی دلیل
نہیں ہے۔“

(احکام القرآن للجصاص الرازی ج ۱ ص ۸۸)

دربار معاویہ میں اُس کی سخاوت کا پول

بعض لوگ امام جصاص رازی رحمۃ اللہ علیہ کی ایسی عبارات پر چسبیں بچھیں ہوتے ہیں، ایسے لوگوں کو
جاننا چاہیے کہ جس طرح وہ اپنے ممدوح کی فیاضی اور سخاوت کے جھوٹے ڈھنڈورے پیٹتے ہیں، ایسے
ڈھنڈورے اُن کے ممدوح کو اُن کی زندگی میں محبوب رہے ہیں اور اُسی طرح بعد کے لوگوں تک پہنچے ہیں۔
موصوف حق داروں کو اُن کا حق دے کر اپنی تعریف چاہتے تھے۔ اکثر عوام نثر و نظم میں اُن کی تعریف کر دیتے
تھے مگر بعض حقیقت شناسوں سے موصوف کو بھری مجلس میں کھری کھری بھی سننا پڑ جاتی تھی۔ چنانچہ علامہ
بلاذریؒ ”ولد ابو سفیان بن حرب“ عنوان کے تحت معاویہ بن ابی سفیان کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

”علماء سیر نے ذکر کیا ہے کہ ایک مرتبہ معاویہ نے بنو ہاشم کی جانب متوجہ ہو کر کہا: اے

بنو ہاشم! میری عطا تمہارے لیے مسلسل ہے اور میرا دروازہ تم پر کھلا ہوا ہے، سو تم میری

عطا کو اپنے آپ سے منقطع نہ کرو، اور میرے دروازہ کو خود پر بند نہ کرو۔ میں اپنے اور تمہارے معاملہ میں مضطرب ہوں، تم سمجھتے ہو کہ جو کچھ میرے ہاتھ میں ہے تم اُس کے مجھ سے زیادہ حق دار ہو، اور میں سمجھتا ہوں کہ میں تم سے زیادہ حق دار ہوں۔ پس جب میں تمہیں کچھ دیتا ہوں جس سے تمہارا حق پورا ہو جاتا ہے تو تم کہتے ہو کہ ہم نے اپنے حق سے کم لیا ہے اور ہمیں ہمارے حصہ کے مطابق نہیں دیا گیا۔ سو میری حالت تو اُس شخص کی طرح ہے جس سے کچھ لیا جاتا ہے تو اُس کی تعریف نہیں کی جاتی۔ میں تم میں برا بھوس گیا ہوں: دیتا ہوں تو میرا شکر یہ ادا نہیں کیا جاتا اور روکتا ہوں تو مجھے معذور نہیں سمجھا جاتا، جبکہ تم ہر حال میں اچھائی پر ہو: تمہارا احتجاج کرنے والا انصاف پر سمجھا جاتا ہے اور مطالبہ کرنے والے کو مل جاتا ہے۔ اس پر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حیرا مال کبھی بھی ہمیں اُس وقت تک نہیں ملا جب تک کہ ہم نے مطالبہ نہیں کیا اور حیرا دروازہ ہم پر اُس وقت تک نہیں کھلا جب تک کہ ہم نے دستک نہیں دی۔ اگر تم نے ہم سے اپنی خیر کو روک لیا تو ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی خیر تمہاری خیر سے بہتر ہے، اور اگر تم نے ہم پر اپنا دروازہ بند کر دیا تو ہم خود کو تم سے روک لیں گے۔ خدا کی قسم! ہم نے تجھ سے سوال کرنے میں ٹکرا نہیں کیا اور نہ ہی ہم نے تجھے مشقت میں ڈالا۔ "فَأَمَّا هَذَا فَبَلِّغْ لَكَ مِنْهُ إِلَّا لِزَجَلٍ مِنَ الْمُسْلِمِينَ" (باقی اس مال میں تمہارا حصہ بھی ایک عام مسلمان سے زیادہ نہیں ہے) جبکہ کتاب الہی کی رو سے ہمارے لیے مال میں دو حق ہیں۔ ایک غنیمت کا حق اور دوسرا مال فنی کا حق۔ پس مال غنیمت میں ہم پر غلبہ پایا گیا اور مال فنی کو ہم نے لیا نہیں۔ پس اب تو صورت حال یہ ہے کہ کسی بھی طریقہ سے ہمیں تمہاری طرف سے کوئی چیز پہنچتی ہے تو ہم لے لیتے ہیں اور اُس پر اللہ تعالیٰ کی حمد بجالاتے ہیں، پھر جو خیر تمہارے ہاتھ سے جاری ہوتی ہے اُس پر ہم تمہیں بھی شکر یہ سے محروم نہیں رکھتے "وَلَوْلَا حَقُّنَا لِي هَذَا

الْمَالِ مَا آتَاكَ مِنَّا زَائِرٌ يَجْعَلُهُ خُفٌّ وَلَا خَافِرٌ“ (اور اگر اس مال میں ہمارا حق نہ ہوتا تو ہم میں سے کوئی بھی تمہارے پاس پیدل یا سوار آتا ہی نہ) جو کچھ میں نے کہا آیا یہ تمہیں کافی ہے یا حریذ بھی کہوں؟ اس پر معاویہ نے کہا: اے ابوالعباس! بس یہی کافی ہے، آپ ٹالکا لگاتے ہیں اور غلطی نہیں کرتے۔“

(أنساب الأشراف للبلاذري ج ۵ ص ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲ مرآة الزمان لسبط ابن الجوزي ج ۸ ص ۱۵۲، في ترجمة ابن عباس؛ العقد الفرید ج ۴ ص ۹۵)

اس سے معلوم ہوا کہ حسنین کریمین یا دوسرے بنو ہاشم پر معاویہ کا باب جو دعو عطا نہیں کھلا ہوا تھا بلکہ انہیں ان کے استحقاق سے بھی کم ملتا تھا، جبکہ موصوف خود اپنے لیے اپنے حق سے زیادہ رکھ لیتے تھے، اسی لیے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کھلے بندوں فرمادیا تھا کہ اس مال میں تمہارا حصہ بھی ایک عام مسلمان سے زیادہ نہیں ہے۔ بعض زائقین حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب قول کا سہارا لیتے ہوئے معاویہ کو ”أَمْرٌ مِنْ عَمْرٍ“ (سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر سردار) ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، انہیں چاہیے کہ وہ یہاں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے قیص والے واقعہ کو ذہن میں لا کر ذرا غور تو کریں کہ کس کا مقابل کس سے کر رہے ہیں؟ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے اپنا حصہ اتنا محدود مقرر کر رکھا تھا کہ روزمرہ حصہ سے ان کے گھر میں سادہ سالن روٹی کے علاوہ الگ سے میٹھی چیز پکانا مشکل تھا جبکہ موصوف دن میں سات سات مرتبہ انواع و اقسام کے کھانے کھاتے کھاتے تھک جاتے تھے مگر میر نہیں ہوتے تھے، لیکن حیرت ہے کہ اس کے باوجود روایات موضوعہ کے ولد ادہ لوگوں کے مطابق وہ پھر بھی شخین کریمین رضی اللہ عنہما سے بڑے سردار اور بڑے سیاست دان تھے۔ فَاغْتَبِرُوا يَا أُولِيَ الْأَبْصَارِ

انصار رضی اللہ عنہم سے ترجیحی سلوک کا اولین مرتکب

موصوف نہ صرف یہ کہ بنو ہاشم کو ان کے مکمل حصہ سے محروم رکھتے تھے بلکہ انصار رضی اللہ عنہم کو بھی ان کے اصل حق سے محروم رکھتے تھے اور ان پر دوسرے طلقاء اور بنو امیہ کو ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے انصار رضی اللہ عنہم کو پہلے ہی آگاہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

إِنَّكُمْ سَتَلْقَوْنَ بَعْدِي أَثَرَهُ ، فَاصْبِرُوا حَتَّى تَلْقَوْنِي وَمَوْعِدُكُمْ الْحَوْضُ .
 ”عنقریب تم میرے بعد ترجیحی سلوک کا سامنا کرو گے، لہذا مجھ سے ملاقات تک صبر
 کرنا اور ہمارے تمہارے ملنے کی جگہ حوض ہے۔“

(بخاری: کتاب مناقب الأنصار، باب قول النبي ﷺ للأنصار: اصبروا حتى تلقوني على
 الحوض، حدیث ۳۷۹۳)

علامہ ابن سید الناس بھری لکھتے ہیں:

إِنَّكُمْ سَتَلْقَوْنَ بَعْدِي أَثَرَهُ ، فَكَانَتْ زَمَنَ مُعَاوِيَةَ .
 ”عنقریب تم میرے بعد ترجیحی سلوک کا سامنا کرو گے، تو یہ ترجیح معاویہ کے زمانے میں تھی۔“

(عیون الأثر فی فنون المغازی والشمال والسيرج ۲ ص ۳۷۶؛ نور العیون فی تلخیص سیرة
 الامین المؤمن ص ۱۲۴)

شیخ شمس، ملا علی قاری اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہما لکھتے ہیں:

قَالَ الْيَعْمَرِيُّ: كَانَ هَذَا الْأَثَرُ فِي زَمَنَ مُعَاوِيَةَ .
 ”علامہ بھری فرماتے ہیں: یہ ترجیحی سلوک معاویہ کے زمانے میں ہوا۔“

(مزيل الخفاء عن ألفاظ الشفاء ج ۱ ص ۲۱۰؛ شرح الشفاء لعبي القاري ج ۱ ص ۶۹۶؛ مدارج
 النبوة ص ۲۵۳)

علامہ خفاجی لکھتے ہیں:

قَالَ ابْنُ سَيِّدِ النَّاسِ: كَانَ إِبْتِدَاءُ هَذَا فِي زَمَنَ مُعَاوِيَةَ .
 ”ابن سید الناس نے کہا ہے: اس ترجیحی سلوک کا آغاز معاویہ کے زمانے میں ہوا۔“

(تسميم الرياض ج ۴ ص ۱۸۶)

انصار ﷺ کو اس ترجیحی سلوک سے کتنا متاثر اور پریشان ہوتے تھے؟ اس کی کچھ تفصیل ہماری کتاب
 ”الاحادیث الموضوعة فی فضائل معاویة“ میں دیکھی جائے۔ ویسے خدا لگتی بات ہے کہ انصار ﷺ

نے جو نبی کریم ﷺ کو اپنی طرف ہجرت کرنے کی دعوت دی اور آپ پر اپنا تن من دھن قربان کرنے کا جو وعدہ کیا اور پھر تمام مشکلات و غزوات میں اُس وعدہ کو نبھایا بھی، اُس جرم کی سزا انہیں تادم حیات ملتی رہی۔ غزوات میں ایک طرف وہ دادِ شجاعت دیتے تھے تو دوسری طرف سیدنا علیؑ قریش مکہ کی تکہ بوٹی کرتے تھے، اور پھر جب انہی قریش کی اولاد کسی طرح اقتدار کے ایوانوں تک پہنچ گئی تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ سیدنا علیؑ اور انصارؓ کو اُن کے جرمِ جہاد کا حزرہ نہ چکھاتے؟ یہی وجہ ہے کہ احادیث صحیحہ میں جہاں ایک طرف سیدنا علیؑ سے بغض رکھنے کو منافقت فرمایا گیا تو دوسری طرف جماعتِ انصارؓ سے بغض کو بھی منافقت فرمایا گیا۔ اس قسم کی احادیث کے لیے صحیح مسلم میں ”کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان حب الانصار وعلیؑ من الایمان وعلاماتہ، وبغضہم من علامات النفاق“ کا مطالعہ فرمائیے اور سوچئے کہ آخر نبی کریم ﷺ نے ایسا کیوں فرمایا، آپ کی نگاہوں میں مستقبل کا آخر کیا منظر ہوگا؟

خلاصہ یہ ہے کہ حسنین کریمین، دوسرے بنو ہاشم اور انصارؓ کو حکومت و معاویہ میں جو کچھ ملتا تھا وہ اُن کے حصہ سے بھی کم ہوتا تھا اور وہ بھی مطالبہ کے بغیر نہیں ملتا تھا، لہذا اس کو معاویہ کا جو دو عطا، سخاوت، تحائف اور نذرانہ قرار دینا حقیقت کے خلاف ہے۔ بعض لوگ کچھ غیر معتبر روایات درج کرنے کے بعد اُن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”نیز حضرت سیدنا امام حسن و حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا آپ کی طرف سے پہنچنے

والے تحائف کا قبول فرمالینا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کے درمیان ادب

و محبت کا رشتہ قائم تھا۔“

(فیضان امیر معاویہ ص ۹۷)

یہ جھوٹ پر مبنی لغاضی ہے، حقیقت وہ ہے جو سیدنا ابن عباسؓ اور امام ہشامؓ رازی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے ذکر ہو چکی ہے۔ کیا ادب و محبت اسی کو کہتے ہیں کہ موصوف نے سیدنا امام حسن مجتبیٰؑ کی اچانک شہادت کو مصیبت ہی نہ سمجھا اور اُن کے روبرو ایک بد بخت اسدی شخص نے امام پاک کو ”جسمِ رقتہ“ (النگارہ) کہہ دیا تو موصوف نے اُس بد زبان شخص پر برہم ہونے کی بجائے اُسے انعام سے نوازدیا، جیسا

کہ ہم اس سے قبل ”معاویہ کو امام پاک کیوں ناپسند تھے؟“ کے عنوان کے تحت سنن ابی داؤد وغیرہ کے حوالہ سے لکھ چکے ہیں۔

خیال رہے کہ جس طرح کسی صحابی کی شان میں وارد شدہ سچی احادیث کا عمدہ انکار کرنا بدبختی اور جہنمی ہونے کی دلیل ہے اسی طرح جھوٹی روایات بیان کرنا اور ان سے استدلال کرنا بھی بدبختی اور جہنمی ہونے کی دلیل ہے۔

کچھ دے کر اترانا بھی تو واضح؟

بعض لوگوں نے لکھا ہے:

”ایک مرتبہ حضرت سیدنا امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تشریف لائے تو حضرت سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: آج میں آپ کو وہ نذرانہ پیش کروں گا جو کبھی کسی نے دوسرے کو نہ دیا ہوگا۔ چنانچہ آپ نے حضرت سیدنا امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں چار لاکھ درہم پیش فرمائے۔“

(فیضان امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ص ۸۹)

بعض حکماء امت نے بھی بلا تاویل ایسے الفاظ نقل کر دیے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

”ایک بار فرمایا کہ آج میں آپ کو وہ نذرانہ دیتا ہوں جو کبھی کسی نے کسی کو نہ دیا ہو۔“

(مرآۃ المناجیع ج ۸ ص ۴۶۱)

ان روایات کی صحت و عدم صحت سے قطع نظر اہل عقل و فہم سے سوال ہے کہ کسی کو کچھ دیتے ہوئے یوں کہنا کہ آج میں آپ کو وہ نذرانہ پیش کروں گا جو کبھی کسی نے دوسرے کو (پیش) نہ کیا ہوگا۔ کیا یہ جملہ تو واضح پر مبنی ہے؟ اعلیٰ ظرف لوگوں کے نزدیک تو اس بات میں بھی جاتی ہے کہ کسی سفید پوش انسان کو بھی اگر زیادہ سے زیادہ مال دیا جائے تو یوں کہا جاتا ہے: اگرچہ یہ حقیر سا نذرانہ جناب کی شایان شان نہیں ہے، تاہم قبول فرمائیے! پھر خود سوچئے کہ اگر کوئی انسان عام شخص کو نہیں بلکہ اپنے نبی کے لخت جگر اور نو جوانان

اہل جنت کے سردار کو کچھ دیتے ہوئے مذکورہ بالا الفاظ کہے تو کیا اس انداز کو تو واضح کہا جاسکتا ہے؟

تنبیہ:

قارئین کرام! ان دونوں عبارتوں میں سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی توہین کا پہلو پایا جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ ان دونوں عبارتوں میں لکھا گیا ہے ”معاویہ نے امام حسن علیہ السلام کو ”فرمایا“ حالانکہ لکھنا چاہیے تھا کہ اُس نے ”عرض کیا“ گویا کہ ان نام نہاد باادب لوگوں کے نزدیک سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام غلام یا مقبول ہیں اور معاویہ سردار اور افضل ہے، جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو مطلقاً ”سید“ (سردار) فرمایا ہے۔

اعلیٰ ظرف ہستیوں کا انداز

دل پر ہاتھ رکھ کر بتلائیے! اگر بادشاہ وقت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کو ڈھیروں مال دیتے ہوئے ایسے الفاظ استعمال کرتا کہ ”آج میں آپ کو وہ نذرانہ دیتا ہوں جو کبھی کسی نے کسی کو نہ دیا ہو“ تو کیا اُسے ادب و تواضع پر محمول سمجھا جاتا؟ ہرگز نہیں۔ آئیے اس سلسلے میں ہم آپ کے سامنے تواضع اور انسانی ادب کا صحیح نمونہ پیش کرتے ہیں۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوری نے سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی فیاضی کا ایک طویل واقعہ لکھا ہے، جس کا دوسرا نصف حصہ یوں ہے کہ امام پاک نے سائل کو فرمایا:

”اگر آپ اس بات کے لیے تیار ہوں کہ جو میرے پاس موجود ہے اُس کو آپ خوشی سے قبول کریں اور مجھے اس پر مجبور نہ کریں کہ میں وہ مقدار پیش کر دوں جو آپ کے مرتبہ کے مناسب ہو اور آپ کا جو حق مجھ پر واجب ہو گیا ہے وہ مقدار اُس کو پورا کر سکے تو میں بخوشی حاضر ہوں۔ اُس سائل نے کہا: اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے! جو کچھ آپ دیں گے میں اُسی کو قبول کر لوں گا اور اُس پر شکر گزار ہوں گا اور اُس سے زیادہ نہ کرنے میں آپ کو معذور سمجھوں گا۔ اس پر حضرت حسن علیہ السلام نے اپنے خزانچی سے فرمایا کہ اُن تین لاکھ درہموں میں سے (جو تمہارے پاس رکھوائے تھے) جو بچے

ہوں لے آؤ۔ وہ پچاس ہزار درہم لائے (کہ اُس کے علاوہ سب خرچ ہو چکے تھے) حضرت حسن ؓ نے فرمایا کہ پانچ سو دینار (اشرفیاں) اور بھی تو کہیں تھے؟ خزانچی نے عرض کیا کہ وہ بھی موجود ہیں۔ آپ نے فرمایا: وہ بھی لے آؤ۔ جب یہ سب کچھ آگیا تو اُس سائل سے فرمایا: کوئی مزدور لے آؤ جو اس سب کچھ کو تمہارے گھر تک پہنچا دے، وہ دو مزدور لے آئے۔ حضرت حسن ؓ نے وہ سب کچھ اُن کے حوالے کر دیا اور اپنے بدن مبارک سے چادر اُتار کر مرحمت فرمائی کہ اُن مزدوروں کی مزدوری بھی تمہارے گھر تک پہنچانے کی میرے ہی ذمہ ہے، لہذا یہ چادر فروخت کر کے اُن کو مزدوری میں دے دینا۔ حضرت حسن ؓ کے غلاموں نے عرض کیا کہ ہمارے پاس تو اب کھانے کے لیے ایک درہم بھی باقی نہیں رہا، آپ نے سب کا سب ہی دے دیا۔ حضرت حسن ؓ نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ شانہ کی ذات سے قوی امید ہے کہ وہ اپنے فضل سے مجھے اس کا بہت ثواب دے گا۔ سب کچھ دے دینے کے بعد جب کہ اپنے پاس کچھ باقی نہ رہا اور مقدار بھی اتنی زیادہ تھی پھر بھی آپ کو اس بات کا قلق اور ندامت رہی کہ سائل کا حق ادا نہ ہو سکا۔“

(فضائل صدقات (بتسہیل قلیل) ص ۵۴۰، ۵۴۱)

یہ ہے اعلیٰ ظرفی کی عمدہ مثال کہ گھر میں جو کچھ موجود تھا سب کا سب خرچ کر دیا مگر سمجھایہ کہ ہم نے کچھ بھی نہیں دیا۔ پھر قابل غور بات یہ ہے کہ سب کچھ لٹانے کے باوجود دل کا غناء قائم رہا اور حدیث پاک میں ہے:

خَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنَى.

”بہترین خیرات وہ ہے جس کے پیچھے غنی موجود ہو۔“

(بخاری ص ۱۹۳ حدیث ۱۴۲۶)

کیا حق دار کو اُس کا اپنا مال دینا سخاوت ہے؟

ہمارے بعض حکماء امت اور اُمراء اہل سنت نے معاویہ بن ابی سفیان کی جس نام نہاد فیاضی، دریا دلی، سخاوت، عطایا اور نذرانوں کا ذکر کیا ہے، وہ نہ تو اُس کے آباؤ اجداد کا مال تھا اور نہ ہی وہ اُس مال میں سے تھا جو انہیں اپنے حصہ سے ملتا تھا۔ وہ تو اہل اسلام کے حقوق میں سے انہیں کچھ نہ کچھ دے کر اُس پر اترا تے تھے اور دیتے وقت کہتے تھے: ”اَنَا ابْنُ الْهِنْدِ“ (میں فرزند ہند ہوں) اور باقی مال اپنے لیے اور اپنے اہل و عیال کے لیے ذخیرہ کر لیتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے لخت جگرِ زید پلید کے لیے یوں پیغامِ وصیت چھوڑا تھا:

يَا بُنَيَّ اِنِّي لَدُ كَفَيْتُكَ الشُّدَّ وَالْبَرَحَالَ ، وَطَاطُ لَكَ الْاُمُورَ ،
وَذَلَّلْتُ لَكَ الْاَعْدَاءَ ، وَاخْضَعْتُ لَكَ رِقَابَ الْعَرَبِ ، وَجَمَعْتُ لَكَ
مَا لَمْ يَجْمَعُهُ اَحَدٌ .

”پیارے بیٹے! میں نے تیرے لیے کافی تنگ و دو کی ہے، میں نے تیرے لیے تمام اُمور آسان کر دیے ہیں، میں نے تیری خاطر دشمنوں کو ذلیل کر دیا ہے، میں نے تیری خاطر عرب کی گردنوں کو جھکا دیا ہے اور میں نے تمہاری خاطر وہ کچھ جمع کر دیا ہے جو کسی نے بھی جمع نہیں کیا۔“

(السکامل فی التاریخ، سنة ستین، ذکر وفاة معاوية ج ۳ ص ۱۱۹؛ تاریخ الطبری، ذکر عهد

معاوية لابنه يزيد، ج ۵ ص ۳۲۲)

اس کلام میں دو باتیں قابلِ غور ہیں: اولاً یہ کہ موصوف نے اس وصیت میں اپنے لختِ جگر کو مخاطب کرتے ہوئے متعدد بار ”لَكَ لَكَ“ (تیری خاطر، تیرے لیے) تو کہا لیکن پوری وصیت میں ایک بار بھی ”لِاسلامِ اسلام“ (اسلام کے لیے) نہیں کہا۔ ثانیاً یہ کہ وہ ساری زندگی اپنے اہل و عیال کے لیے مال جمع کرتے رہے اور آخری وصیت میں اُسی کا تذکرہ کرتے رہے۔ فی الجملہ یہ کہ وہ اپنے مال سے نہیں بلکہ اہل اسلام پر اُن ہی کے مال میں سے کچھ خرچ کرتے تھے، لہذا اس کو ہمارے حکماء امت اور اُمراء اہل سنت کا

فیاضی اور سخاوت باور کرانا ایسا ہی ہے جیسا کہ دورِ حاضر میں سرکاری خرچ پر کچھ بنا کر بعض وزراءِ اعظم کے نام کی تختی لگانا۔ ہاں اگر ایسا ہوتا کہ وہ قسط سالی میں سیدنا عمرؓ کی طرح خود فاقہ کشی کرتے یا پھر بیت المال کا سارا مال خرچ کرنے کے بعد اُس میں جھاڑو پھیر کر وہاں دو گانہ نفل ادا کر کے شکرِ الہی بجالاتے اور کہتے کہ یا اللہ تیرا شکر ہے کہ حقِ حقداروں تک پہنچ گیا اور پھر اپنے ذاتی حصہ میں سے حسنین کریمین یا دوسرے اہل اسلام پر خرچ کرتے تو ایسے اقدام کو اُن کی فیاضی اور سخاوت کہنا یقیناً سچی اور عقل مندی کی بات ہوتی۔

حُبِ دنیا میں مبتلا سخی کیونکر؟

معاویہ بن صخر ساری زندگی اپنے اہل اعیال کے لیے مال جمع کرنے میں لگے رہے اور آپ نے ابھی پڑھا کہ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں جو وصیت کی وہ بھی مال کے متعلق تھی۔ ظاہر ہے کہ انسان کو اُس کے آخری وقت میں اُسی بات کی فکر زیادہ ہوتی ہے جو اُس کی زندگی کا محور رہی ہو، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ”كُلُّ إِنْسَانٍ لِّنَفْسِهِ عَيْنٌ“ (ہر برتن اُسی چیز سے چمکتا ہے جو اُس کے اندر ہو) اسی لیے اسلافِ کرام اور صوفیہ میں سے مسلم ہستیوں نے اعتراف کیا ہے کہ وہ حُبِ دنیا میں مبتلا تھے۔ چنانچہ مشہور ترین صوفی بزرگ حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

كَانَ مِنَ الْعُلَمَاءِ الْكِبَارِ ، مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ وَلَكِنْ اِهْتَلَى بِحُبِّ الدُّنْيَا .
 ”وہ اصحابِ نبی ﷺ کے اکابر علماء میں سے تھے لیکن دنیا کی محبت میں مبتلا ہو گئے تھے۔“

(تاریخ دمشق ج ۵۹ ص ۲۱۳؛ البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۲۰۳)

شاید یہاں بعض ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہو کہ فضیل بن عیاض اعتراف کرنے والے کون ہوتے ہیں؟ ایسے لاکھوں کروڑوں صوفیہ کسی صحابی کی گروہ کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ ایسے عقل مندوں کے لیے عرض ہے کہ بات صحابی اور غیر صحابی کے تقابل کی نہیں ہو رہی بلکہ یہاں بات ہو رہی حُبِ دنیا میں مبتلا ہونے کی، اور حُبِ دنیا میں کوئی عالم مبتلا ہو جائے یا غیر عالم، صحابی مبتلا ہو جائے یا غیر صحابی، جو کوئی بھی جتنا حُبِ دنیا میں مبتلا ہو جائے وہ اتنا ہی دین سے دور ہو جاتا ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیات نمبر ۷۵، ۷۶، ۷۷ وغیرہ میں بعض صحابہ کا ذکر ہے کہ وہ حُبِ دنیا میں مبتلا ہوئے تھے تو دین سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے تھے، اسی لیے ارشاد فرمایا گیا

دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے۔

کیا صحابی بھی حُبِ دنیا میں مبتلا ہو سکتا ہے؟

پھر بھی اگر کسی کے دل میں خلش ہو کہ حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ کا نہ کوثر الصدق قول ایک صحابی کے بارے میں غیر صحابی کا قول ہے، لہذا قابلِ قبول نہیں تو ہم اُس کے سامنے سابقون اولون میں سے ایک ایسے صحابی کا قول پیش کرتے ہیں جنہیں شیطان سے محفوظ دمامون فرمایا گیا ہے، جیسا کہ ہم صحیح بخاری کے حوالے سے لکھ چکے ہیں، انہوں نے اپنی زندگی کی آخری تقریر میں جامِ شہادت نوشِ جاں کرنے سے قبل قسم کھا کر فرمایا تھا کہ ”ان لوگوں کے دلوں میں کوئی خبیث الہی نہیں بلکہ یہ دنیوی لذتوں اور حُبِ جاہ میں مبتلا ہو چکے ہیں۔“ اُس عظیم صحابی کی یہ تقریر ہم اپنی کتب ”شرح خصائص علیؑ“ وغیرہ میں نقل کر چکے ہیں۔ جن حضرات کو اصل کتب کی طرف رجوع کرنے کا شوق ہو تو وہ کتب سیر و تاریخ میں ۳۷ ہجری کے حالات میں سیدنا عمار بن یاسرؓ کے احوال کا مطالعہ فرمائیں، خصوصاً ابن کثیر کی ”البدایہ والنہایہ ج ۵ ص ۳۶۷، وط: ج ۷ ص ۴۵۵، وط: ج ۱۰ ص ۵۲۷، ملاحظہ فرمائیں۔

اگر کچھ لوگوں کے ذہن میں پھر خیال پیدا ہو کہ سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما تو تھے ہی سیدنا علیؑ کی پارٹی کے آدمی تو اُن کی یہ بات کیونکر تسلیم کی جاسکتی ہے؟ تو ایسے لوگوں کے لیے ہم حدیث نبوی ﷺ پیش کر دیتے ہیں۔ بخاری شریف میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کو مخاطب کرتے ہوئے اُن کے دنیا میں مبتلا ہونے کا خدشہ یوں ظاہر فرمایا تھا:

وَلَيْتِي لَسْتُ أَخْشَى عَلَيْكُمْ أَنْ تُشْرِكُوا، وَلَكِنِّي أَخْشَى عَلَيْكُمْ الدُّنْيَا أَنْ تَنَافَسُوهَا.

”مجھے تم پر یہ خدشہ نہیں کہ تم شرک کرو گے لیکن مجھے تم پر دنیا کا خدشہ ہے کہ تم

اس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو گے۔“

(بخاری: کتاب المغازی، باب غزوة أحد، ص ۵۵۱ حدیث ۴۰۴۲؛ مسلم: کتاب الفضائل،

باب إثبات حوض نبينا ﷺ وصفاته، ص ۱۰۸۸ حدیث ۲۱ [۲۲۹۶])

پھر اگر کسی شخص کو صحیحین کی اس حدیث پر بھی اعتماد نہ ہو تو ہم اُس کے سامنے قرآن مجید کی آیت پیش کر دیتے ہیں، یقین فرمائیے اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیت میں صحابہ کو ہی خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ.

”بعض تم میں سے طلبگار ہیں دنیا کے اور بعض تم میں سے طلبگار ہیں آخرت کے۔“

(آل عمران: ۱۵۲)

امام سیوطی نے سند صحیح کے ساتھ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

مَا كُنْتُ أَرَى أَنَّ أَحَدًا مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ يُرِيدُ الدُّنْيَا حَتَّى نَزَلَ فِينَا يَوْمَ أُحُدٍ: ﴿مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ﴾.

”میں رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے کسی کو نہیں سمجھتا تھا کہ وہ دنیا کا ارادہ رکھتا ہے، حتیٰ کہ اُحد کے دن ہمارے بارے میں نازل ہوا ﴿بعض تم میں سے طلبگار ہیں دنیا کے اور بعض تم میں سے طلبگار ہیں آخرت کے﴾۔“

(الدر المنثور للسيوطي ج ۴ ص ۷۰)

سوا اگر کسی شخص کو قرآن و حدیث کی تصریح کے مطابق سابقین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بعض صحابہ کا حُب دنیا میں مبتلا ہونا تسلیم ہو تو پھر اُسے یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ بعض طلقاء اور مؤلفۃ القلوب بدرجہ اتم حُب دنیا میں مبتلا تھے اور سونا چاندی کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ متعدد کتب حدیث و سیر وغیرہ میں حضرت حکم بن عمرو غفاری رضی اللہ عنہ کی سوانح میں آیا ہے کہ زیاد بن ابیہ جب معاویہ کی طرف سے کوفہ کا گورنر تھا تو اُس نے خراسان کی طرف ایک لشکر بھیجا اور اُس کا سربراہ صحابی رسول سیدنا حکم بن عمرو غفاری رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا۔ انہوں نے خراسان کو فتح کر لیا اور کثیر مال غنیمت حاصل کیا۔ زیاد نے انہیں ایک خط روانہ کیا، جس کا مضمون یہ تھا:

أَمَّا بَعْدُ: فَإِنَّ أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ كَتَبَ إِلَيَّ أَنَّ اصْطَفِيَ لَهُ الصَّفْوَاءُ وَالْبَيْضَاءُ، فَلَا تَقْسِمُ بَيْنَ النَّاسِ ذَهَبًا وَلَا فِضَّةً.

”اما بعد: امیر المومنین نے میری طرف ایک خط لکھا ہے کہ سونا چاندی اُن کے

لیے الگ کر لیا جائے، لہذا سونا چاندی مجاہدین میں تقسیم نہ کیا جائے۔“

جواباً سیدنا حکم بن عمرو الغفاری رحمہ اللہ نے اُس کی طرف یوں لکھ بھیجا:

”تمہارا خط مجھے پہنچ چکا ہے، تم نے اُس میں امیر المومنین کی کتاب (خط) کا ذکر

کیا ہے، جبکہ میرے پاس امیر المومنین کی کتاب (خط) سے قبل اللہ کی کتاب موجود

ہے، اور اللہ کی قسم! اگر زمین و آسمان کسی بندے کو کچلنے کے لیے باہم جُوجائیں اور وہ

بندہ خوفِ الہی رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اُس کے نکلنے کی سبیل پیدا فرمادے گا، والسلام۔ پھر

سیدنا حکم بن عمرو الغفاری رحمہ اللہ نے لوگوں میں اعلان کر دیا کہ وہ مال غنیمت آپس میں

تقسیم کر لیں۔ معاذیہ نے چونکہ سیدنا حکم بن عمرو کو تقسیم کے متعلق ایک حکم کیا تھا، انہوں

نے اس حکم کی تعمیل نہ کی تو انہیں قید کر دیا گیا اور وہ اسی قید ہی میں انتقال فرما گئے۔“

بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ جب اُن کے پاس یہ خط پہنچا اور انہوں نے اس کی تعمیل نہ کی تو اس

موقع پر اُن کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے:

”اے اللہ! اگر میرے لیے تیرے پاس کوئی خیر ہے تو مجھے اپنے پاس بلا لے،

پھر وہ اسی عرصہ میں خراسان کے علاقہ مرو میں انتقال فرما گئے۔“

(المستدرک: کتاب معرفة الصحابة، ذکر مناقب الحكم بن عمرو الغفاري رحمہ اللہ ج ۳ ص ۴۴۲،

وط: ج ۳ ص ۵۰۱ حدیث ۵۸۶۹؛ الطبقات الکبریٰ لابن سعد ج ۹ ص ۲۸؛ تاریخ الطبری ج ۴

ص ۲۷؛ الاستیعاب (قدیم) ص ۳۵۷، ۳۵۸؛ الکامل فی تاریخ لابن اثیر ج ۳ ص ۳۲۴؛ أسد

الغابة ج ۲ ص ۵۲؛ معرفة الصحابة لأبي نعیم ج ۲ ص ۷۰۸؛ المنتظم لابن الجوزي ج ۵ ص

۲۳۰؛ صفة الصفوة ج ۱ ص ۶۷۲؛ مرآة الزمان لسبط ابن الجوزي ج ۷ ص ۱۷۹؛ تهذیب الکمال

للمزني ج ۷ ص ۱۲۷؛ تهذیب تهذیب الکمال للذهبي ج ۲ ص ۴۱۶؛ سیر أعلام النبلاء ج ۲

علامہ ذہبی نے اس حدیث پر سکوت اختیار کیا ہے۔

فقہاء احناف میں سے امام ابن مازہ حنفی، امام برہان الدین مرغینانی حنفی، قاضی خاں اور جندی حنفی، امام برہان الدین ابوالعالی حنفی، امام ابن الہمام حنفی، زین الدین ابن نجیم مصری حنفی، سراج الدین ابن نجیم حنفی، امام اکمل الدین بایرقی حنفی، امام عینی حنفی، امام فخر الدین زیلعی حنفی، امام شہاب الدین شلی حنفی، امام ابن الشنہ حنفی، ملا جیون حنفی اور علامہ عبداللہ لکھنوی حنفی وغیرہم نے بھی ادب القاضی کی بحث میں معاویہ کو جائز اور غیر عادل قرار دیتے ہوئے یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

(شرح أدب القاضي لابن مازة ج ۱ ص ۱۳۰، ۱۳۲؛ الهدایة ج ۲ ص ۱۰۲؛ فتاویٰ قاضی خان ج ۲ ص ۲۸۶؛ الدیسیط البرہانی ج ۸ ص ۶؛ فتح القدیر ج ۷ ص ۲۴۵؛ البحر الرائق ج ۶ ص ۴۶۰؛ النہر الفائق ج ۳ ص ۶۰۳؛ العنایة فی شرح الہدایة للبابرتی مع فتح القدیر ج ۷ ص ۲۶۰؛ البناية فی شرح الہدایة للعینی ج ۹ ص ۱۴؛ تبیین الحقائق ج ۴ ص ۱۷۷؛ حاشیة الشلبی علی تبیین الحقائق علی هامشہ ج ۴ ص ۱۷۷؛ لسان الحکام لابن شحنہ حنفی ص ۳؛ التفسیرات الاحمدیة ص ۱۹۳؛ شرح الہدایة للکنوی ج ۵ ص ۳۵۹)

سو جو شخص خود مال دنیا کا اس حد تک دلدادہ ہو کہ جائز و ناجائز کا بھی خیال نہ کرتا ہو اور دوسروں کے حق سے بھی اپنے لیے رکھ لیتا ہو تو وہ حسنین کریمین یا کسی بھی شخص کے لیے نجی کیونکر ہو سکتا ہے؟

اُمّ یزید کے ساتھ شادی پر شاہ خرچیاں

داشته بکار آید، چونکہ موصوف نے سیم وزر اور مال و جواہر جمع کر رکھے تھے اس لیے خوشی کے اہم مواقع پر خوب خرچ کرتے تھے۔ چنانچہ جب موصوف نے عیسائی عورت میسون بنت بحدل (اُمّ یزید) سے شادی کرنا چاہی تو سیم وزر کا خوب مظاہرہ کیا، جیسا کہ مشہور مناظر اہل سنت حضرت علامہ مولانا منظور احمد فیضی کے تلمیذ اور غزالی زماں علامہ سید احمد سعید شاہ صاحب کاظمی محدث ملتانی رحمۃ اللہ علیہما کے مرید سراج اہل سنت علامہ سراج احمد سعیدی ”حیۃ الحیوان ج ۲ ص ۲۱۲“ کے حوالہ سے اُس شادی کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”قبیلہ بنی کلب کی میسون بنت بحدل جو یزید بن معاویہ کی والدہ ہے، بے حد حسن و جمال رکھتی تھی، جب حضرت معاویہ کے حرم میں داخل ہوئی تو اُن کی منظور نظر ہو گئی، آپ نے اُس کے لیے ایک اونچا محل تیار کرایا جس سے غوطہ دمشق کا سرسبز و شاداب باغ نظر آتا تھا، اور قسم و قسم کے نقش و نگار سے اُس محل کو مزین کرایا، زیب و زینت کے لیے سونے چاندی کے برتن کمروں کے رنگ کے مشابہ اُس میں رکھے، رومی ریشم کے رنگین اور پھول دار پردے لٹکائے (قالین بچھوائے) پھر آپ نے اُسے حوروں کی مانند خوب صورت باندیوں کے ہمراہ اُس محل میں ٹھہرایا۔

ایک دن میسون نے اپنا بہترین سوٹ پہن کر بناؤ سنگھار کیا، عطریات لگائے اور اپنے زیورات اور ہیروں کو جن کا مثل اب نہیں پایا جاتا زیب تن کیا، پھر اپنے گھر کے بالا خانہ میں جا بیٹھی، جبکہ اُس کے ارد گرد کنیریں تھیں، وہاں سے اُس نے غوطہ پر نظر ڈالی اور اُس کے درختوں کا نظارہ کرنے لگی، گھونسلوں سے پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں اُسے سنائی دے رہی تھیں، پھولوں اور کلیوں کی مہک اُس کے مشام جان کو معطر کر رہی تھی تو اُسے (اُس کا سرسبز و شاداب وطن) نجد یاد آ گیا اور اُسے اپنی سہیلیوں اور اپنے لوگوں کی یاد آنے لگی، پھر اُسے اپنی پیدائش کی جگہ یاد آئی تو وہ رو پڑی اور سسکیاں بھرنے لگی، تو اُس کی ایک چہیتی کنیر نے پوچھا: آپ کے رونے کی وجہ کیا ہے؟ جبکہ آپ ملکہ بلقیس کے ملک کی مانند ملک کی ملکہ ہیں۔

تو اُس نے ایک لمبی آہ بھر کر کہا: (اُس کے اشعار کا ترجمہ)

۱۔ اُس گھر کے لیے (رور ہی ہوں) جس میں ہواؤں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں، مگر جو مجھے بلند و بالا محل سے زیادہ پسند ہے۔

۲۔ اور مجھے وہاں آنکھوں کی ٹھنڈک حاصل ہونے کے ساتھ موٹا لباس پہننا (یہاں کے) نرم و نازک اور شفاف مہین لباس سے زیادہ پسند ہے۔

۳۔ اور اپنے (اُس) گھر کے ٹوٹے ہوئے حصے میں روٹی کا ٹکڑا کھا لینا مجھے (عہدہ اور مکمل) روٹی کھا لینے سے زیادہ پسند ہے۔

۴۔ اور (وہاں کی) ہرپک ڈنڈی پر ہواؤں کی آوازیں مجھے (یہاں کی) ڈھولکیوں کی تھاپ سے زیادہ پسند ہے۔

۵۔ اور وہاں کا کتا جو میرے سواہر رات کو آنے والے کو بھونکتا تھا مجھے یہاں کے (مانوس اور) بہت محبت کرنے والے بٹے سے زیادہ پسند ہے۔

۶۔ اور وہاں کا سخت مزاج اونٹ جو ڈاچی (اونٹنی) سوار عورتوں کے پیچھے پیچھے چلتا تھا مجھے بنے سنورے خچر سے زیادہ پسند ہے۔

۷۔ اور میرے چچا کے بیٹوں میں سے دُبلّا پٹکانی جوان مجھے سخت گیر موٹے کافر، جنگلی گدھے سے زیادہ پسند ہے۔

پس جب حضرت معاویہ آئے تو ایک باندی نے آپ کو اُس کی اس بات سے آگاہ کیا، اور ایک روایت یہ ہے کہ جب وہ یہ اشعار پڑھ رہی تھی تو حضرت معاویہ نے انہیں خود سن لیا تھا تو آپ نے فرمایا کہ بحدل کی بیٹی مجھے ”علج عنوف“ وغیرہ قرار دے کر ہی راضی ہوئی، اُسے میری طرف سے تین طلاقیں ہیں۔ (پھر اُسے یہ پیغام بھیجا کہ) اُسے میری طرف سے کہہ دو کہ اس محل میں لایا گیا سارا سامان اُسی کا ہے، پس وہ اُسے لے لے، پھر آپ نے اُسے نجد میں اُس کے سیکے (گھر) پہنچوا دیا، جبکہ یزید اُس کے حمل میں تھا۔

(القول السدید فی حکم یزید ص ۸۶، ۸۷، ۸۸)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ شادی کی یہ ٹھاٹھ باٹھ اور دُلبہن پر سونے چاندی کے زیورات کی بھرمار ہی نہیں بلکہ محل کے رنگ کے مطابق سونے چاندی کے برتن کیسے جمع ہو گئے تھے، جبکہ حکم بن عمرو غفاری رحمہ اللہ نے تو حکم عدوی کی تھی اور بادشاہ سلامت کے لیے زروسم کو الگ نہیں کیا تھا؟ جواباً عرض ہے کہ اگر خراسان کے

گورز و نیاداری کے رنگ ڈھنگ سے کورے، شاہی آداب سے عاری اور رنگ میں بھنگ ڈالنے والے نرے صوفی صافی تھے تو دوسرے علاقوں کے گورز تو سلیقہ شعار، رمز آشنا اور فرمانبردار تھے۔ اگر سب لوگ ہی حکم بن عمروؓ کی طرح شاہی مزاج سے نا آشنا ہوتے تو شاہی ایوان کی رونق اور کاروبار سلطنت کیونکر چلتا؟ ممکن ہے کچھ لوگ اس حقیقت کو تاریخ کہہ کر رد کرنے کی کوشش کرنا چاہیں تو عرض ہے کہ یہ حقیقت سنن ابی داؤد وغیرہ کی صحیح حدیث میں بھی مذکور ہے کہ کاشانہ معاویہ میں سونے، ریشم اور درندوں کی کھالوں کا عام استعمال ہوتا تھا، یہی وجہ ہے کہ سیدنا مقدم بن معدی کربؓ نے غضب ناک ہو کر معاویہ کو فرمایا تھا کہ تمہارے گھر میں سونے چاندی، ریشم اور درندوں کی کھالوں کا استعمال ہے تو وہ انکار نہیں کر سکے تھے۔ یہ حدیث متعدد حوالہ جات کے ساتھ پہلے گزر چکی ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت مقدمؓ کی معلومات کے مطابق ایوان معاویہ میں سونے چاندی وغیرہ کے استعمال کی ناجائز صورتیں تھیں، اگر معاویہ ایسی ناجائز صورتوں سے اپنے اہل خانہ کو منع کرتے تو انہیں حضرت مقدم بن معدی کربؓ سے یہ طعن نہ سننا پڑتا۔ مولانا خلیل احمد سہارنپوری لکھتے ہیں:

قَالَ الْمَقْدَامُ: قَوْلَ اللَّهِ لَقَدْ رَأَيْتُ هَذَا كُلَّهُ فِي بَيْتِكَ يَا مُعَاوِيَةُ أَيُّ عَلَى أَهْلِكَ، فِيهِ أَنْ مَا فِي بَيْتِ الْأَدَمِيِّ مِنْ مَكْرُوهٍ أَوْ حَرَامٍ مَنُوبٌ إِلَيَّ مَا لَكُمْ فِي كَوْنِهِ لَا يُنْكِرُهُ.

”حضرت مقدمؓ نے فرمایا: خدا کی قسم! اے معاویہ! میں یہ سب کچھ تمہارے گھر میں دیکھتا ہوں، یعنی تمہارے گھر والوں پر، اس حدیث میں دلیل ہے کہ آدمی کے گھر میں مکروہ یا حرام جو کچھ بھی ہو وہ گھر کے سربراہ کی طرف منسوب ہوگا، کیونکہ وہ اس سے منع نہیں کرتا۔“ (۱)

(بذل المجہود فی حل سنن ابی داؤد ج ۱۳ ص ۱۶۱)

(۱) اس تشریح سے ضمنی بات بھی معلوم ہوئی کہ یا تو معاویہ کے حق میں مشہور دعائے نبوی ”اللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مُّهْدِيًا وَاهْدِيْهِ“ قبول نہیں ہوئی، یا پھر ماننا پڑے گا کہ یہ حدیث موضوع ہے۔

بتائیے! جس شخص نے دوسروں کے حقوق و وسائل سے اپنے محلات کو مال و زر سے بھر رکھا ہو، اور پھر وہ اُسی مال میں سے کچھ دوسروں پر بھی خرچ کر دے تو وہ فیاض و نخی کیونکر ہو گیا؟ کیا دورِ حاضر میں عرب و عجم کے جن سلاطین و وزراء کے محلات سونے چاندی سے مزین ہیں حتیٰ کہ اُن کے بیت الخلاء وغیرہ مقامات پر بھی زروسیم کا استعمال ہے اور وہ حفظِ مآقدم کے طور پر اپنی پارٹی کے دوسرے لیڈران یا اپوزیشن لیڈرز پر بھی کبھی کبھی خزانے کا دروازہ کھول دیتے ہیں تو کیا اُن کے اس خرچ کو اُن کی عطا اور سخاوت سمجھا جائے؟ اس قسم کے خرچ کو بدعوام تو سخاوتِ سلطانی سمجھتے ہیں مگر اصل حقائق سے آگاہ اور دیدہ درحضرات اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ سلطان کا اصل حق کتنا ہے اور عوام کا کتنا، یہی وجہ ہے کہ اُس دور کے عوام تو معاویہ بن صخر کی طرف سے تھوڑا بہت مال ملنے پر اُس کی مدح و ثنا میں زمین و آسمان کے قلابے ملا تے ہوئے اُس کی شان میں منظوم کلام اور قصیدے لکھ ڈالتے تھے مگر خواص سمجھتے تھے کہ یہ اونٹ کے منہ زیرہ کے برابر مال دے کر عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک مرتبہ موصوف اپنی داد و دہش پر اظہارِ تشکر اور تحسین کے خواہاں ہوئے تو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے انہیں بھری مجلس میں دوسری کھری کھری باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرما دیا تھا:

فَإِنَّمَا هَذَا الْمَالُ فَلَيْسَ لَكَ مِنْهُ إِلَّا لِرَجُلٍ مِنَ الْمُسْلِمِينَ.

”اے معاویہ! اس مال میں تمہارا حصہ ایک عام مسلمان سے زیادہ نہیں ہے۔“

(أنساب الأشراف ج ۵ ص ۱۲۰-۱۲۱)

تعجب کی بات یہ ہے کہ زیادہ اپنے لیے رکھ لینے اور تھوڑا بہت مسلمانوں کو دینے پر بھی وہ اپنا احسان

سمجھتے تھے۔ چنانچہ علامہ بلاذری لکھتے ہیں:

قَالَ مُعَاوِيَةُ: الْأَرْضُ لِلَّهِ وَأَنَا خَلِيفَةُ اللَّهِ فَمَا أَخَذْتُ لِي، وَمَا تَرَكَتُ

لِلنَّاسِ فَبِالْفَضْلِ مِنِّي، فَقَالَ صَفْصَعَةُ بْنُ صَوْحَانَ: مَا أَنْتَ وَأَقْصَى الْأُمَّةِ

فِي ذَلِكَ سِوَاءٍ وَلَكِنْ مِنْ مَلِكٍ اسْتَأْثَرَ، فَقَضِبَ مُعَاوِيَةُ وَقَالَ:

لَهَمَمْتُ، قَالَ صَفْصَعَةُ: مَا كُلُّ مَنْ هُمْ لَعَلَّ، قَالَ: وَمَنْ يُحُولُ بَيْنِي

وَبَيْنَ ذَلِكَ ؟ قَالَ : أَلَيْدِي يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ .

”زمین اللہ کی ہے اور میں اللہ کا خلیفہ ہوں، سو جو میں نے لے لیا تو وہ میرا ہے اور جسے میں نے لوگوں کے لیے چھوڑ دیا تو وہ میرا احسان ہے۔ اس پر سیدنا مصعب بن صوحانؓ نے کہا: تم اور ایک اجنبی ترین امتی اس معاملہ میں برابر ہیں، لیکن جو بادشاہ بنتا ہے تو وہ اپنے لیے مخصوص کر لیتا ہے۔ اس پر معاویہ نے غضبناک ہو کر کہا: میں چاہتا ہوں، اس پر مصعب بولے: ہر شخص جو چاہتا ہے کہ نہیں گذرتا۔ معاویہ نے کہا: میرے اور اس چاہت کے درمیان کیا رکاوٹ ہے؟ انہوں نے کہا: وہی ذات رکاوٹ ہے جو انسان اور اس کے قلب کے مابین رکاوٹ ہے۔“

(أنساب الأشراف للبلاذري ج ۵ ص ۲۷، ۲۸)

اسی خام خیالی کی وجہ سے وہ خود کو سیاہ و سفید کا مالک گردانتے تھے اور پھر جس کسی کو اس کے حق میں سے کچھ دیتے تھے تو اپنا احسان سمجھتے تھے اور ”أَنَا اِهْنُ الْهَنْدُ“ کا نعرہ لگاتے تھے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔ حیرت کی بات ہے کہ کچھ سنہاء قسم کے لوگ اب تک اسی باطل خیال میں مبتلا ہیں اور معاویہ بن ابی سفیان کو حسنین کریمین علیہما السلام کا فیاض، سخی اور داتا گردانتے ہیں۔ پٹھی (الٹی) کھوپڑی سے خدایٰ محفوظ رکھے۔

امام حسن علیہ السلام پر الزام کیوں آئے گا؟

بعض متاخرین ہند نے معاویہ کی اہلیت و صلاحیت کو ثابت کرتے ہوئے لکھا ہے:

”اگر امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ العیاذ باللہ کافریا قاسق تھے یا ظالم جابر تھے یا غاصب جابر تھے تو الزام امام حسن پر آتا ہے کہ انہوں نے کاروبار مسلمین و انتظام شرع دین باختیار خود ایسے شخص کو تفویض فرمادیا اور خیر خواہی اسلام کو معاذ اللہ کام نہ فرمایا۔“

(فتاویٰ رضویہ ج ۲۹ ص ۳۷۸)

خدا جانے کہ بعض متاخرین ہند معاویہ کے احوال سے اس حد تک کیوں ناواقف تھے؟ اگر ان کی

توجہ کتب حدیث، کتب سیر و تاریخ اور شروح حدیث کی طرف نہیں ہو سکی توفیق تو ان کا خاص موضوع تھا اور کتب فقہ میں معاویہ کو، ظالم، جائز اور غیر عادل وغیرہ صاف صاف کہا گیا ہے۔ کفر کے علاوہ معاویہ کی طرف ان تمام الفاظ کی نسبت کی گئی ہے جو بعض متاخرین ہند نے ذکر کیے ہیں۔ امام حسن ؓ بھی موصوف کی ان تمام خرابیوں سے آگاہ تھے مگر وہ مجبور تھے، انہوں نے باختیار خود ایسے شخص کو ملک تفویض نہیں فرمایا کہ ان پر الزام آئے۔ آئیے اہم آپ کے سامنے موصوف کے بارے میں باری باری مذکورہ بالا تمام الفاظ پیش کر دیتے ہیں۔

امام البغاة اور فسق

مذکورہ جملہ میں بعض علماء ہند نے ان چھ الفاظ کی طرف متوجہ کیا ہے: کافر، فاسق، ظالم، جائز، غاصب اور جابر۔ موصوف جس شخص سے ان تمام الفاظ کی نفی کر رہے ہیں ان میں سے پہلے لفظ کے علاوہ باقی تمام الفاظ صحابہ کرام اور ائمہ عظام ؓ سے اُس شخص کے بارے میں منقول ہیں۔ ائمہ کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ ابن ہند سے جو بغاوت ہوئی اُس کی وجہ سے فقط ان کی تکفیر جائز نہیں لیکن باقی تمام الفاظ کی نسبت ان کی طرف کرنا جائز ہے۔ مثلاً مذکورہ بالا اقتباس میں لفظ کافر کے بعد لفظ فاسق ہے اور ائمہ سے معاویہ بن ابی سفیان اور اُس کے پیروکاروں کے بارے میں یہ لفظ ثابت ہے، مثلاً سیدنا عمار بن یاسر ؓ فرماتے ہیں:

لَا تَقُولُوا كَفَرُوا أَهْلُ الشَّامِ وَلَكِنْ قُولُوا فَسَقُوا أَوْ ظَلَمُوا.
”یہ نہ کہو کہ اہل شام نے کفر کیا، لیکن کہو کہ انہوں نے فسق یا ظلم کیا۔“

(المصنّف لابن أبي شيبة ج ۲۱ ص ۴۰۷ حدیث ۳۸۹۹۷، ۳۸۹۹۸؛ السنن الكبرى للبيهقي ج ۸ ص ۱۷۴، وط: ج ۸ ص ۳۰۲ حدیث ۱۶۷۲۱؛ تعظیم قدر الصلاة للمروزي ج ۲ ص ۵۴۶ حدیث ۶۰۰؛ تاریخ دمشق ج ۱ ص ۳۴۶، ۳۴۷؛ مختصر تاریخ دمشق ج ۱ ص ۱۳۱؛ منهاج السنة لابن تيمية ج ۵ ص ۶۴۲)

بعض علماء عقائد نے لکھا ہے کہ نواصب کے علاوہ اکثر اہل سنت کا مذہب یہی ہے۔ چنانچہ سید شریف

علی بن محمد جرجانی لکھتے ہیں:

وَالَّذِي عَلَيْهِ الْجَنَهُورُ مِنَ الْأَمَةِ وَهُوَ أَنَّ الْمُخْطِيَةَ قَتْلَةُ عُثْمَانَ وَ
مُحَارَبَةُ عَلِيٍّ لِأَنَّهُمَا إِمَامَانِ فَيَحْرُمُ الْقَتْلُ وَالْمُخَالَفَةُ قَطْعًا إِلَّا أَنْ
بَعْضُهُمْ كَالْقَاضِي أَبِي بَكْرٍ ذَهَبَ إِلَى أَنَّ هَذِهِ التَّخْطِئَةُ لَا تَبْلُغُ إِلَى حَدِّ
التَّفْسِيقِ وَمِنْهُمْ مَنْ ذَهَبَ إِلَى التَّفْسِيقِ كَالشَّيْخَةِ وَكَثِيرٍ مِنْ أَصْحَابِنَا.

”جمہور کا مذہب یہ ہے کہ حضرت عثمان ؓ کے قاتلین اور سیدنا علی ؓ سے
لڑنے والے خطا کار تھے، کیونکہ وہ دونوں امام برحق تھے، پس ان کا قتل اور ان کی
مخالفت قطعاً حرام ہے، مگر بعض اہل سنت جیسا کہ قاضی ابو بکر مالکی اس طرف گئے ہیں
کہ یہ خطا حد فسق کو نہیں پہنچتی اور بعض کا مذہب ہے کہ یہ خطا حد فسق کو پہنچتی ہے جیسا کہ
تمام شیعہ اور ہمارے کثیر اہل سنت۔“

(شرح المواقف ج ۸ ص ۴۰۶، ۴۰۷)

اس عبارت میں جس قاضی کا ذکر ہے، وہ قاضی ابن العربی مالکی متوفی ۵۴۳ھ ہے، جس نے اپنی
کتاب ”العواصم من القواصم“ وغیرہ میں سیدنا امام حسین ؓ کی شہادت کو خود امام عالی مقام ؓ کی
غلطی قرار دیا ہے، سیدنا علی ؓ کے حق میں وارد شدہ احادیث صحیحہ کی تکذیب کی ہے اور معاویہ کی شان میں
جھوٹی روایات اور جعلی اقوال کو تقویت دینے کی فریب کاری کی ہے۔ یہ اور ایسی دوسری باتوں کی وجہ سے
امام ابن وحید اور امام قرطبی مالکی نے اُسے غبی کہا ہے اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مولانا عبدالرشید نعمانی
دیوبندی اور دوسرے حضرات نے اُسے نواصب میں شمار کیا ہے۔

(فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۱۰۷؛ حادثہ کربلا کاپس منظر ص ۵۸)

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے بھی ”فتاویٰ عزیزی کامل ص ۴۱۳“ میں معاویہ بن ابی
سفیان کو فاسق لکھا ہے، شاہ صاحب کی مکمل عبارت پیچھے گزر چکی ہے۔ علاوہ ازیں شاہ صاحب نے اپنی
اُس معروف تصنیف جو خصوصاً ترویج و ردِ افس میں لکھی گئی ہے، میں اس سے بھی سخت لکھا ہے، وہاں انہوں
نے فسق اعتقادی تک کا شائبہ بھی ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

”اور علوٰ درجہ ایمان حضرت امیرؓ کا اور ہشتی ہونا اُن کا اور لائق خلافت پیغمبر کے ہونا از روئے احادیث بلکہ آیاتِ قطعیہ متواترہ سے ثابت ہے، پس منکرانِ امور کا کافر ہوگا، اور لڑنا اُن سے از راہِ شامتِ نفس یا محبتِ مرتبہ اور جاہ کے، یا از راہِ تادیلِ باطل اور شبہ فاسد کے، فسقِ عملی یا فسقِ اعتقادی ہے، یعنی بد عملی اور بد اعتقادی ہے نہ کہ کفر۔“

(تحفہ اثنا عشریہ ص ۸۱۴، ۸۱۵)

نیز حدیثِ پاک میں ہے کہ مسلمان کو سب و شتم کرنا فسق ہے اور احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ معاویہ اور اُن کے متبعین سیدنا علیؓ کو سب و شتم اور لعنت کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰؓ نے شرائطِ صلح میں باقاعدہ یہ شرط لکھوائی تھی کہ آئندہ تم ہمارے بابا کو سب و شتم نہیں کرو گے، لیکن وہ پھر بھی باز نہ آئے، وہ اپنے دورِ ملوکیت میں برابر اس قبیح طریقے پر قائم رہے اور بعد میں اُن کے متبعین بھی اس پر کار بند رہے حتیٰ کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؓ نے آکر اس بُرے تسلسل کو ختم کیا، جیسا کہ ہم گذشتہ صفحات میں باحوالہ لکھ چکے ہیں۔

امام البغاة اور ظلم

فتاویٰ رضویہ کے اقتباس میں لفظ فاسق کے بعد لفظ ظالم ہے۔ یہ لفظ بھی ہمارے ائمہ کرام نے معاویہ بن ابی سفیان کے بارے میں استعمال کیا ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے لائق ترین شاگرد امام محمد بن حسن شیبانیؒ نے معاویہ کو باغی اور متعدي کے ساتھ ساتھ ظالم بھی کہا ہے۔ چنانچہ امام عبدالقادر قرشی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

سَمِعْتُ عَمِّي (عَلِيَّ بْنَ مُوسَى الْقَمِي) سَمِعْنَا أَبَا سُلَيْمَانَ
الْجَوْزْجَانِي، سَمِعْتُ مُحَمَّدَ بْنَ الْحَسَنِ يَقُولُ: لَوْ لَمْ يُقَاتِلْ مُعَاوِيَةَ عَلِيًّا
ظَالِمًا مُتَعَدِيًا بَاغِيًّا كُنَّا لَا نَهْتَدِي لِقِتَالِ أَهْلِ الْبَغْيِ.

”میں نے اپنے چچا علی بن موسیٰؓ کی سے سنا، انہوں نے فرمایا: ہم نے ابوسلیمان جوزجانی سے سنا، انہوں نے کہا: ہم نے امام محمد بن حسن شیبانیؒ کو یہ فرماتے ہوئے سنا

کہ اگر موویہ ظلم کرتے ہوئے، حد سے بڑھتے ہوئے اور بغاوت کرتے ہوئے سیدنا علیؑ کے ساتھ جنگ نہ کرتا تو ہم اہل بغاوت کے ساتھ جنگ کی ہدایت نہ پاتے۔

(الجواهر المضیة للقرشی الحنفی ج ۳ ص ۷۱۰، ۷۰؛ حضرت علی اور قصاص عثمانؑ للعبد الرشید النعمانی الحنفی ص ۷۰)

امام قرطبی اور دوسرے متعدد علماء کرام نے مذاہب اربعہ کے محدثین اور متکلمین کی آراء جمع فرمائی ہیں اور جنگ صفین میں سیدنا علیؑ کے خلاف برسر پیکار آنے والوں کو، جماعاً باغی اور ظالم لکھا ہے، اُن کی طویل عبارت کے آخری الفاظ یہ ہیں:

وَقَالُوا أَيْضًا: بِأَنَّ الَّذِينَ قَاتَلُوهُ بَغَاةٌ ظَالِمُونَ لَهُ، وَلَكِنْ لَا يَجُوزُ تَكْفِيرُهُمْ بِبَغْيِهِمْ.

”نیز انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جنہوں نے اُن کے ساتھ جنگ کی وہ باغی ظالم تھے، لیکن اُن کی بغاوت کی وجہ سے اُن کی تکفیر جائز نہیں۔“

(التذکرۃ للقرطبی ج ۲ ص ۶۲۶، وط: ج ۳ ص ۱۰۸۸، ۱۰۸۹؛ الفرق بین الفریق للإسفرائینی ص ۲۷۲؛ فیض القلید ج ۱۲ ص ۳۶۳، وط: علمیہ ج ۶ ص ۴۷۴ حدیث ۹۶۴؛ شرح الزرقانی عی المواہب ج ۱۰ ص ۱۵۳، ۱۵۴)

اس عبارت سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ فقط اُن کی تکفیر جائز نہیں باقی بغاوت میں سب کچھ آجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کامل ترین احتیاط کے باوجود امام اعظم ابوحنیفہؒ جنگ جمل میں مولانا علیؑ کو دوسرے حضرات کے مقابلہ میں عدل پر سمجھتے تھے جبکہ صفین میں مولانا علیؑ کے مد مقابل آنے والوں کو باغی فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ اُن سے جنگ جمل کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے انتہائی جامعیت کے ساتھ جمل اور صفین دونوں جنگوں کے بارے میں اپنا موقف واضح فرما دیا۔ چنانچہ امام موفقؒ مکی اور امام کردری رحمۃ اللہ علیہما لکھتے ہیں:

سُئِلَ الْإِمَامُ عَنْ قِتَالِ يَوْمِ الْجَمَلِ، فَقَالَ: سَارَ عَلِيٌّ فِيهِ بِالْعَدْلِ، وَهُوَ

الَّذِي عَلَّمَ الْمُسْلِمِينَ السُّنَّةَ فِي قِتَالِ أَهْلِ الْبَغْيِ.

”امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے جنگِ جمل کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: سیدنا علی علیہ السلام اُس میں عدل کے ساتھ چلے، اور وہی ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو باغیوں کے خلاف جنگ کی سنت سکھائی ہے۔“

(مناقب ابی حنیفۃ للموفق المکی ج ۲ ص ۸۴؛ مناقب ابی حنیفۃ للکرمی ج ۲ ص ۷۲)
اس عبارت میں مولا علی علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا کہ وہ عدل کے ساتھ چلے، اور ظاہر ہے کہ عدل کی ضد ظلم ہے۔ یہی حقیقت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے بھی امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے۔ چنانچہ قاضی ابوالعلاء صاعد بن محمد حنفی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۷۸۵ھ لکھتے ہیں:

وَرَوَى عَنْ أَبِي يُوسُفَ رَحِمَهُ اللَّهُ أَنَّهُ قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا حَنِيفَةَ رحمۃ اللہ علیہ
يَقُولُ: عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ كَرَّمَ اللَّهُ وَجْهَهُ حُجَّتًا عِنْدَ اللَّهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ،
وَلَوْلَا عَلِيٌّ مَا عَلِمْنَا كَيْفَ قِتَالِ أَهْلِ الْبَغْيِ، أَوْ كَيْفَ لِقَائِ أَهْلِ الْقَبِيلَةِ.
”امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو فرماتے ہوئے سنا۔ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہماری دلیل ہیں، اور اگر سیدنا علی علیہ السلام نہ ہوتے تو ہم باغیوں کے خلاف جنگ کرنا کیسے جانتے یا اہل قبلہ کے ساتھ کیسے لڑتے؟“

(کتاب الاعتقاد للصاعد الحنفی ص ۱۹۲)

بعض علماء ہند کے بقیہ الفاظ پر ہم تبصرہ کرنا ضروری نہیں سمجھتے، کیونکہ نتیجہ کے لحاظ سے لفظ قاسق و ظالم کے ضمن میں اُن تمام الفاظ کا مفہوم بھی آجاتا ہے، سو جب کسی کا ظالم ہونا ثابت ہو گیا تو پھر اُس کے جائز و مباح ہونے کو ثابت کرنے کی چنداں ضرورت نہیں رہتی، تاہم لفظ ”جائز“ صاحبِ حدایہ کے علاوہ بہت سے فقہاء احناف نے استعمال کیا ہے، جیسا کہ ہم اپنی کتاب ”شرح خصائص علی علیہ السلام“ میں نقل کر چکے ہیں۔

اب آپ خود ہی انصاف فرمائیں کہ اتباع میں مقدم کون، فاضل بریلوی یا سیدنا عمار بن یاسر، امام اعظم ابو حنیفہ، امام محمد بن حسن شیبانی، امام ابو یوسف اور جمہور فقہاء و متکلمین رحمہم اللہ؟

معیارِ اہلیت میں صحابہ اور بعض علماء ہند میں اختلاف

بعض علماء ہند ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

”امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگر خلافت کے اہل نہ ہوتے (تو) امام مجتبیٰ ہرگز

انہیں تفویض نہ فرماتے۔“

(فتاویٰ رضویہ ج ۲۹ ص ۳۳۷)

بعض علماء ہند کا یہ قول عقلاً اور نقلاً دونوں لحاظ سے درست نہیں۔ عقلاً تو اس لیے درست نہیں ہے کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے دفع شر کے لیے خلافت سے دست برداری فرمائی تھی، جیسا کہ بعض علماء ہند نے خود مذکور الصدر عبارت سے دو سطریں قبل یوں لکھا ہے:

”اور اس سے صلح و بندش جنگ مقصود تھی۔“

(فتاویٰ رضویہ ج ۲۹ ص ۳۳۷)

خود امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے بھی واضح طور پر اپنی صلح کی وجہ یہی بیان فرمائی ہے، جیسا کہ اُن کے الفاظ: ”لِتَحْقِنَ دِمَاءَ الْمُسْلِمِينَ“ (تحفظِ خونِ مسلمین کی خاطر) سے ظاہر ہے، تو پھر اہلیت کا کیا سوال؟ تھوڑا سا غور و تدبر بھی کیا جائے تو عام عقل مند انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ وہ حالات اہلیت اور عدم اہلیت کو جانچنے کے نہیں تھے، اس لیے کہ اہلیت و عدم اہلیت کا تعلق انتخاب سے ہوتا ہے صلح سے نہیں، اور انتخاب کے لیے کم از کم ایک سے زائد افراد کا ہونا ضروری ہوتا ہے، کیونکہ فردِ واحد کا انتخاب تو نہیں ہوتا، لیکن صلح کے معاملہ میں اہل و نا اہل کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ صلح بہر حال اُسی شخص سے ہی کرنا ہوتی ہے جس سے تنازع ہو گیا ہو اور حالات کشیدہ ہو چکے ہوں۔ اب بھی اگر بات سمجھ نہ آئی ہو تو ہم امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے ایسے واضح الفاظ پیش کر دیتے ہیں جن کو پڑھنے کے بعد معمولی سی عقل والا آدمی بھی تذبذب کا شکار نہیں رہے گا۔ امام ابو العباس المبرد صلح کے احوال قلم بند کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

فَمَنْ خَرَجَ الْحَسَنُ يُرِيدُ الْمَدِينَةَ فَوَجَّهَ إِلَيْهِ مُعَاوِيَةُ وَقَدْ تَجَاوَزَ فِي طَرِيقِهِ يَسْأَلُهُ أَنْ يَكُونَ الْمُتَوَلَّى لِمُحَارِبَتِهِمْ ، فَقَالَ الْحَسَنُ : وَاللَّهِ لَقَدْ كَفَفْتُ عَنْكَ لِحَقْنِ دِمَاءِ الْمُسْلِمِينَ ، وَمَا أُخِيبُ ذَلِكَ يَسْعِي ، أَفَأَقَاتِلُ عَنْكَ قَوْمًا ، أَنْتَ وَاللَّهُ أَوْلَى بِالْقِتَالِ مِنْهُمْ .

”پھر امام حسن عازم مدینہ ہوئے تو معاویہ ان کے پیچھے گئے اور امام پاک کافی راستہ طے کر چکے تھے، انہوں نے امام پاک سے درخواست کی کہ وہ خوارج کے خلاف جنگ کے سپہ سالار بنیں تو امام حسن ؓ نے فرمایا: خدا کی قسم! میں نے تو تجھ سے بھی فقط مسلمانوں کے خون کی وجہ سے ہاتھ روکا ہے، میں اس کام کو مناسب نہیں سمجھتا، کیا میں تیری خاطر ایک قوم سے قتال کروں؟ اللہ کی قسم! ان کی بہ نسبت تجھ سے جنگ کرنا زیادہ بہتر ہے۔“

(الکامل فی اللغة والأدب ص ۵۷۷، وط: ج ۳ ص ۷۰؛ العقد الفريد ج ۱ ص ۱۸۱)

اسی بات کو امام ابن اثیر جزی نے ۳۱ھ کے احوال میں ”ذکر خروج الخوارج علی معاویہ“ کے عنوان کے تحت بیان کیا ہے کہ جب فردہ بن نوفل خارجی نے معاویہ کے خلاف لشکر کشی کی تو معاویہ نے امام حسن مجتبیٰ ؓ کو درخواست کی کہ وہ خوارج کے خلاف جنگ کے لیے نکلیں۔ وہ لکھتے ہیں:

فَكَتَبَ إِلَيْهِ مُعَاوِيَةُ يَدْعُوهُ إِلَى قِتَالِ قُرُوءَ ، فَلَحِقَهُ رَسُولُهُ بِالنَّصِيحَةِ أَوْ قَرِيبًا مِنْهَا ، فَلَمْ يَرْجِعْ وَكَتَبَ إِلَى مُعَاوِيَةَ : لَوْ أَثَرْتُ أَنْ أَقَاتِلَ أَحَدًا مِنْ أَهْلِ الْقِبْلَةِ لَهَذَا بِقِتَالِكَ ، فَإِنِّي تَرَكْتُكَ لِصَلَاحِ الْأُمَّةِ وَحَقْنِ دِمَائِهَا .

”پس معاویہ نے امام پاک کی طرف لکھا، انہیں فردہ کی طرف جنگ کے لیے بلایا تو اس کے قاصد نے امام پاک کو قاصد یا اس کے قریب جا کر پالیا تو امام پاک واپس تشریف نہ لائے اور معاویہ کی طرف لکھ بھیجا: اگر میں ترجیح دیتا کہ اہل قبلہ میں

سے کسی کے خلاف جنگ کروں تو میں جنگ کا آغاز تجھ سے کرتا، میں نے تجھے اُمت کی بھلائی اور اُس کے خون کی حفاظت کے لیے چھوڑ دیا ہے۔“

(الکامل فی التاریخ لابن اثیر الجزری ج ۳ ص ۹)

اب بھی اگر کسی شخص کو حالات کی سنگینی اور امام پاک کی مجبوری سمجھ نہ آئی ہو تو پھر خدا ہی حافظ ہے، مذہبی متعصب میں مبتلا شخص کو یہ حقیقت سمجھ آئے یا نہ آئے لیکن محلہ کا عام آدمی بھی سمجھتا ہے کہ صلح اور سمجھوتہ دفع مصیبت کے لیے ہوتا ہے جبکہ اہلیت کا تعلق انتخاب اور حصول مفاد سے ہوتا ہے۔ دفع مصیبت کے لیے مجبوراً کوئی فیصلہ کرنے میں اور مد مقابل کی اہلیت کو مد نظر رکھتے ہوئے کوئی فیصلہ کرنے میں فرق کو سمجھنے کے لیے یہاں اُس صحیح حدیث میں غور و فکر کرنا بہت مفید ثابت ہوگا جو پہلے بھی استنباطی تناظر میں کئی بار آچکی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”دو عورتیں تھیں، اُن میں سے ہر ایک کے ساتھ اپنا اپنا بچہ تھا۔ بھیڑیا آیا اور اُن میں سے ایک کے بچے کو کھا گیا۔ ایک نے دوسری سے کہا: بھیڑیے نے تمہارے بچے کو کھایا ہے، دوسری نے کہا: نہیں، بلکہ تمہارے بچے کو کھا یا ہے، دونوں حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس فیصلہ کے لیے گئیں تو انہوں نے بڑی کے حق میں فیصلہ دیا۔ پھر وہ دونوں سیدنا سلیمان بن داؤد علیہ السلام کے پاس گئیں اور انہیں ماجرا عرض کیا تو انہوں نے فرمایا: چھری لاؤ، میں اس بچے کے دو ٹکڑے کر دیتا ہوں۔ اس پر چھوٹی کہنے لگی: اللہ تعالیٰ آپ پر رحمت فرمائے، آپ ایسا نہ کریں: ”هُوَ أَبْنَاهَا، فَقَضَىٰ بِهِ لِلصَّغْرَىٰ“ (یہ اسی کا بیٹا ہے، تو انہوں نے چھوٹی کے حق میں فیصلہ دے دیا)۔“

(بخاری: کتاب أحادیث الأنبياء، باب قول الله تعالى: وَوَهَبْنَا لِذَاوُدَ سُلَيْمَانَ إلخ، حدیث ۳۴۲۷، و کتاب الفرائض، باب إذا ادعت المرأة ابناً، ص ۹۳۲ حدیث ۶۷۶۹؛ مسلم: کتاب الأقضية، باب بیان اختلاف المجتہدین، حدیث ۱۷۲۰؛ سنن النسائی: کتاب آداب القضاة، باب حکم الحاكم بعلمه ص ۸۱۲، ۸۱۳ حدیث ۵۴۰۳، ۵۴۰۴، ۵۴۰۵)

خود سوچئے! چھوٹی عورت اپنے حقیقی بیٹے کے حق سے دست بردار ہونے پر اور اپنا حق بڑی عورت کو دینے پر کیوں آمادہ ہو گئی تھی؟ آیا وہ بڑی عورت کی اہلیت کے پیش نظر اپنے لختِ جگر سے ہاتھ کھڑے کرنے پر تیار ہوئی تھی یا وہ اپنے بچے کے وجود کی سلامتی کے لیے یہ کڑوا گھونٹ پینے کو تیار ہوئی تھی؟ فَالْهَمُّ وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغَالِبِينَ!

نوٹ:

اس سے قبل ہم ابتدائی صفحات میں ”طلاقِ منصب کے اہل نہیں تھے“ عنوان کے تحت سیدنا عمر، سیدنا علی المرتضیٰ، اُم المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ، سیدنا عمار بن یاسر، سیدنا ابن عباس، سیدنا عبدالرحمان بن غنم اشعریؓ اور دوسرے حضرات کے اقوال نقل کر چکے ہیں کہ طلاق کسی بھی منصب کے اہل نہیں تھے، خصوصاً سیدنا عمرؓ تو اپنی حیاتِ مبارکہ کے آخری ایام میں پزید بن ابی سفیان اور معاویہ بن ابی سفیان کو منصب پر برقرار رکھنے پر نادم ہو گئے تھے، لہذا بتایا جائے کہ اہل اسلام ان اکابر صحابہ کرامؓ کے اقوال کی اتباع کریں یا پاک و ہند کے بعض علماء کی؟

معاذ اللہ، کیا اسلافِ کرام فاجر تھے؟

یوں محسوس ہوتا ہے کہ ابنِ صخر کے بارے میں بعض علماء ہند کی معلومات محدود تھیں اور وہ اس مسئلہ میں متقدمین فقہاء اور متکلمین کرام کے اقوال سے خاطر خواہ آگاہ نہیں تھے، یہی وجہ ہے کہ اُن کے قلم سے ایسے سخت ترین اقوال صادر ہوئے جن کی زد سے اسلافِ کرام بھی محفوظ نہیں رہ سکے۔ مثلاً وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

”فرقِ مراتب بے شمار اور حق بدستِ حیدرِ کرام، مگر معاویہ بھی ہمارے سردار، طعن اُن پر بھی کارِ بنار۔“

(فتاویٰ رضویہ ج ۱۰ ص ۲۰۱)

طعن سے اعلیٰ حضرت کی کیا مراد ہے؟ یقیناً جن صفاتِ ذمیرہ سے موصوف ابنِ صخر کو پاک سمجھتے تھے،

اُن صفات سے انہیں متصف سمجھنا ہی اُن کے نزدیک طعن ہوگا اور چند سطور قبل لکھا جا چکا ہے کہ وہ معاویہ بن ابی سفیان کو فسق، ظلم اور جور وغیرہ سے مبرا سمجھتے تھے۔ یقیناً اس کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ جن اسلاف کرام ؓ نے معاویہ کی طرف فسق، ظلم اور جور وغیرہ کی نسبت کی ہے تو وہ فاجر قرار پائیں گے، لامحالہ اس فتویٰ کی زد سے سیدنا عمار بن یاسر، امام اعظم ابوحنیفہ، امام محمد بن حسن شیبانی اور امام ابو یوسف بھی محفوظ نہیں رہ سکتے، بلکہ امام قرطبی وغیرہ کی عبارات کے مطابق مذاہب اربعہ کے جمہور فقہاء و متکلمین سب اس کی فتویٰ کی زد میں آتے ہیں۔ العیاذ باللہ!

اس فتویٰ کی زد میں آنے والے بطور نمونہ چند نمایاں شخصیات کے اسماء اور انہوں نے جس لفظ سے معاویہ پر نکیر یا طعن کیا ہے وہ بھی ملاحظہ فرمائیے:

- ✽ سیدنا عمار بن یاسر ؓ نے معاویہ کو فاسق، ظالم اور ضلالت پر کہا تھا۔
- ✽ سیدنا قیس بن سعد رضی اللہ عنہما نے معاویہ کو امام ضلالت کہا۔
- ✽ سیدنا خزیمہ بن ثابت ؓ نے اُس پورے گردہ کو گمراہ کہا۔
- ✽ سیدنا امام حسن مجتبیٰ ؓ نے حکومت معاویہ کو فتنہ کہا۔
- ✽ سیدنا امام حسین ؓ نے معاویہ کے اقتدار کو سب سے بڑا فتنہ کہا۔
- ✽ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اقتدار معاویہ کو اقتدار فرعون پر قیاس کیا۔
- ✽ ام المومنین سیدہ ام سلمہ اور سیدنا جابر بن عبد اللہ ؓ نے بیعت معاویہ کو بیعت ضلالت کہا۔
- ✽ امام اعظم ابوحنیفہ ؓ نے انہیں باغی اور غیر عادل کہا۔
- ✽ امام محمد بن حسن شیبانی ؓ نے انہیں ظالم، متعدي اور باغی کہا۔

الغرض متعدد صحابہ و تابعین، اکثر فقہاء احناف اور مذاہب اربعہ کے علماء کرام نے مذکورہ بالا الفاظ میں سے کوئی نہ کوئی ایسا لفظ اُن کے بارے میں استعمال کیا ہے جس کے استعمال کو بعض علماء ہند اُن پر طعن سمجھتے ہیں۔ پوچھنا یہ ہے کہ اگر صحابہ کرام اور علماء اسلام کے ایسے تمام الفاظ طعن کے زمرہ میں آتے ہیں تو پھر کیا بعض علماء ہند کی اتباع میں ان تمام صحابہ اور علماء اسلام کو فاجر سمجھا جائے؟

”وَمَنْ يَكُنْ يَطْعَنُ فِي مُعَاوِيَةَ“ کا جائزہ

اعلیٰ حضرت کے قلم سے بے دھیانی میں ایک اور بھی ایسا سنگین قول نقل ہو گیا جس کی زد سے نواصب کے علاوہ کوئی بھی نہیں بچ سکتا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

”علامہ شہاب الدین خفاجی نسیم الریاض شرح شفاۃ قاضی عیاض میں فرماتے ہیں: جو حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر طعن کرے وہ جہنم کے کتوں میں سے ایک کتا ہے۔“

(فتاویٰ رضویہ ج ۲۹ ص ۳۶۳)

ظاہر ہے کہ معاویہ بن ابی سفیان کی طرف ضلالت، بدعت، بغاوت، ظلم، فتن، جور، خطا اور فساد وغیرہ کی نسبت کرنا ان پر طعن کے زمرہ میں آئے گا، اور اس کا نتیجہ انتہائی خطرناک ہے، کیونکہ امام اعظم ابو حنیفہ نے معاویہ بن ابی سفیان کو باغی، امام ابو یوسف نے باغی، امام محمد بن حسن شیبانی نے باغی متعدی اور ظالم کہا ہے، اور امام برہان الدین مرغینانی حنفی، قاضی خاں اوزجندی حنفی، امام ابوالمعتز نسفی حنفی، امام برہان الدین ابوالمعالی حنفی، امام ابن الہمام حنفی، زین الدین ابن نجیم مصری حنفی، سراج الدین ابن نجیم حنفی، امام اکمل الدین بابر ترقی حنفی، امام عینی حنفی، امام فخر الدین زلیعی حنفی، امام شہاب الدین شمس حنفی، امام ابن الشیمہ حنفی، ملا حیون حنفی اور علامہ عبدالحی لکھنوی حنفی وغیرہم نے جائز اور غیر عادل لکھا ہے، جبکہ ملا علی قاری نے ظاہر اقصاء عثمان ؓ کا بہانہ کرنے والا اور باطناً باغی، طاغی اور کتاب و سنت کا تارک کہا ہے۔ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے مرتکب کبیرہ اور فاسق عملی اور اعتقادی کہا ہے۔ یہ فقط احناف ہیں باقی مذاہب کے فقہاء ان کے علاوہ ہیں۔ باحوالہ ان سب کے اقوال کے لیے مجھ عاجز کی کتاب ”الفئة الباغية“ کا انتظار فرمائیں، تاہم ان میں سے اکثر علماء اسلام کی عبارات مذاہب اربعہ کے حوالہ سے ”شرح خصائص علی ؓ“ میں بھی آگئی ہیں۔ فقہاء و متکلمین کے ایسے تمام اقوال کو مد نظر رکھتے ہوئے بتایا جائے کہ اہل سنت کس کی اتباع کریں؟ اگر بعض علماء ہند کے فتویٰ کی اتباع کریں تو معاذ اللہ مذکورہ بالا تمام علماء اسلام کو جہنم کے کتے ماننا پڑے گا، اور اگر بعض علماء ہند کے قول سے روگردانی کریں تو پھر سنیت سے خارج۔

امید ہے کہ اہل سنت کے ارباب عقد و حل اس مسئلہ کا کوئی حل ضرور نکالیں گے، کیونکہ مذکورہ بالا فقہاء کرام (بشمول امام اعظم اور صاحبین رحمہم) کے اقوال کو تو مجبوراً چھوڑا جاسکتا ہے مگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے جو معاویہ کو باطل پر کہا اور سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے ایک مقام پر ضلالت پر قرار دیا اور دوسرے مقام پر ظالم اور فاسق کہا۔ ذوالشہادتین سیدنا خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بھی گمراہ کہا، ان ہستیوں کے اقوال کا کیا کیا جائے؟ کیا معاذ اللہ انہیں بھی ”لذاک کلب من کلاب الهاویۃ“ کا مصداق سمجھا جائے؟

نیکی و بدی کی جزا و سزا کا تعین، کس کا منصب؟

بعض علماء ہند نے امام خفاجی کے حوالے سے جو یہ بات لکھی ہے:

”جو حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر طعن کرے وہ جہنم کے کتوں میں سے ایک کتا ہے۔“

(فتاویٰ رضویہ ج ۲۹ ص ۳۶۳)

یہ کسی مجہول شاعر کے شعر کا ترجمہ ہے جو امام خفاجی رحمۃ اللہ علیہ نے لفظ ”قَوْلَ“ سے نقل کیا ہے، انہوں نے اس کو نسیم الریاض ”فصل ومن توفیرہ وبرہ“ توفیر اصحابہ وبرہم، ج ۳ ص ۴۳۰، وط: ج ۴ ص ۵۲۵ پر نقل کیا ہے۔ اس شعر میں ایک بد عملی اور اُس پر عذاب کا ذکر ہے، اور اصول یہ ہے کہ کسی نیکی کی جزا اور کسی برائی پر سزا کا تعین کوئی غیر نبی انسان نہیں کر سکتا۔ کسی شخص کو کسی نیکی پر کتنا ثواب ملے گا اور کسی بدی پر کتنا عذاب ہوگا؟ اس کا علم عقل سے نہیں سماعت اور نقل سے ہے۔ چنانچہ امام مازری، قاضی عیاض اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہم لکھتے ہیں:

مَذْهَبُنَا أَنَّ إِثَابَةَ اللَّهِ تَعَالَى لِمَنْ أَطَاعَهُ وَلَمْ يَعْصِهِ تَفْضُّلٌ ، وَلَا تَقَبُّثٌ
إِلَّا بِالسَّمْعِ ، وَكَذَلِكَ إِنْتِقَامُهُ مِمَّنْ عَصَاهُ وَلَمْ يُطِيعْهُ عَذْلٌ ، وَلَا يُقَبُّثُ
مِنْهُ شَيْءٌ إِلَّا بِالسَّمْعِ .

”ہمارا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اُس شخص کو ثواب دینا جس نے اُس کی اطاعت کی اور نافرمانی نہ کی فضل ہے، اور یہ سماعت (نقلی دلیل) کے بغیر ثابت نہیں ہوتا، اور اسی طرح اُس کا اُس شخص کو سزا دینا جس نے اُس کی نافرمانی کی اور اطاعت

نہ کی عدل ہے، اور اس میں سے کوئی چیز ثابت نہیں ہوتی ماسوا سماعت کے۔

(المعلم بفوائد مسلم للمازري: كتاب صفة القيامة والجنة والنار، باب لن يدخل أحد الجنة بعمله، ج ۳ ص ۳۵۱؛ إكمال المعلم بفوائد مسلم للقاظمي عياض ج ۸ ص ۳۵۲؛ فتح الباري ج ۱ ص ۵۹۹ حدیث ۶۴۶۳؛ فتح المنعم للموسى شاهين لاشين ج ۱ ص ۴۳۱)

بتائیے! جس عادی شاعر نے ایک مخصوص شخص پر طعن کرنے کی معین سزا کا ذکر کیا ہے وہ اُس نے کس سے سنی؟ اس کے پاس کون سی آیت اور حدیث ہے؟ کسی بھی نیکی اور بدی کی جزا و سزا تعین کرنا شاعر کا نہیں بلکہ شارع کا منصب ہے اور جو شارع بیان فرماتا ہے وہ شریعت ہوتی ہے اور اُس کا تعلق عقل سے نہیں نص سے ہوتا ہے، اور مخصوص کلام فقط دو ہیں: کلام الہی اور کلام نبوی یعنی کتاب و سنت، البتہ کسی بات پر کامل و مکمل اجماع امت ہو جائے تو وہ بھی شریعت کے زمرہ میں آتی ہے، تاہم کسی نیکی اور بدی کے ثواب و عذاب کا تعین فقط شریعت سے ہوتا ہے شعر سے نہیں۔ چنانچہ علامہ نووی لکھتے ہیں:

إِعْلَمُ أَنَّ مَلَهَبَ أَهْلِ السُّنَّةِ أَنَّهُ لَا يَنْبَغُ بِالْعَقْلِ ثَوَابٌ وَلَا عِقَابٌ
وَلَا يُجَابُ وَلَا تَحْرِيْمٌ ، وَلَا غَيْرُهُمَا مِنْ أَنْوَاعِ التَّكْلِيفِ وَلَا تَقْبُطُ هَلِهِ
كُلُّهَا وَلَا غَيْرُهَا إِلَّا بِالشَّرْعِ.

”جان لیجئے کہ مذہب اہل سنت یہ ہے کہ عقل سے کوئی ثواب، عذاب، وجوب

اور حرمت ثابت نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کے علاوہ کسی قسم کا کوئی عمل ثابت ہوتا ہے، یہ

سب امور اور ان کے علاوہ کوئی بھی چیز شریعت کے بغیر ثابت نہیں ہوتی۔“

(شرح صحيح مسلم للنووي: كتاب صفات المنافقين وأحكامهم، باب لن يدخل أحد الجنة بعمله، ج ۱۷ ص ۲۳۲ حدیث ۲۸۱۶؛ تفسير الخازن: سورة النحل، آیت: ۲۸ ج ۳ ص ۷۵؛ شرح صحيح مسلم للسعيد ج ۷ ص ۶۵۲، ۶۵۳؛ فتح المنعم للموسى شاهين لاشين ج ۱ ص ۴۳۱)

لہذا خود ہی سوچئے کہ ایک مجہول شاعر کے قول سے کسی مخصوص شخص پر طعن کرنے کی معین سزا کو قبول

کرتے ہوئے اُسے آگے بیان کرنا کہاں کی دانش مندی اور شریعت فہمی ہے؟ بعض علماء ہند نے لکھا تھا:

”ہمیں معاویہ سے کیا رشتہ، خدا نخواستہ اُن کی حمایت بے جا کریں مگر ہاں اپنی

سرکار کی طرف داری اور ان کا الزام بدگویاں سے بری رکھنا منظور ہے۔“

مگر افسوس کہ وہ اُن کی بے جا حمایت میں اس قدر آگے نکل گئے کہ انہیں شرعی اصول ہی یاد نہ رہا اور انہوں نے شارع ﷺ کے فرامین کی بجائے ایک مجہول شاعر کے قول کو سند سمجھتے ہوئے یوں نقل کر دیا جس طرح کتاب و سنت کی تصریحات کو نقل کیا جاتا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

اس ضابطہ کی روشنی میں محدث ابن المبارک رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب اُس قول کی قلعی بھی کھل گئی جس کو یوں بیان کیا جاتا ہے:

”حضرت معاویہ ؓ جس گھوڑے پر سوار ہو کر حضور ﷺ کی معیت میں شریک

جہاد ہوئے اُس گھوڑے کی ٹاپ سے اُڑ کر جو غبار گھوڑے کی نتھنوں میں داخل ہوا ہے

وہ بدر جہا حضرت عمر بن عبدالعزیز سے بہتر ہے۔“

(فضائل حضرت امیر معاویہ للقاضی غلام محمود ہزاروی ص ۶۲)

امام ابن المبارک رحمۃ اللہ علیہ کو کسی معین شخص کا یہ ثواب اور درجہ کیسے معلوم ہو گیا؟ نام لے کر دو شخصوں میں تقابل کرنا اور اُن میں وثوق کے ساتھ اس قدر تفاوت بیان کرنا تو نبی کا مقام ہے، کسی امتی کو کیا خبر کہ دو معلوم شخصوں کے درجات میں کتنا فرق ہے؟ ہاں اگر وہ نام زد کیے بغیر مطلقاً کسی صحابی اور غیر صحابی کے مابین ایسا فرق بیان کرتے تو قابل فہم ہوتا۔

صحابی غیر عادل اور تابعی عادل تو افضل کون؟

یاد رکھنا چاہیے کہ اپنے لیے حکومت کرنے اور عدل و انصاف کے قیام کے لیے حکومت کرنے میں زمین و آسمان سے بھی زیادہ فرق ہوتا ہے۔ بعض احادیث مبارکہ میں عادل شخص کے ایک دن کو ستر سال کی عبادت سے بھی بہتر فرمایا گیا ہے، اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عادل ہونے پر امت مسلمہ کا اتفاق ہے اور معاویہ بن ابی سفیان کو صحابہ، تابعین، فقہاء اور علماء کلام نے امام ضلالہ، غیر عادل، ظالم، جائز، قاتل اور

فاسق کہا ہے، جیسا کہ گذشتہ صفحات میں باحوالہ لکھا جا چکا ہے۔ سو آپ ہی بتائیے کہ عادل اور غیر عادل کا کوئی موازنہ بنتا ہے؟ اور یہ بھی بتائیے کہ کوئی غیر صحابی شخص سراپا عدل و انصاف پر مبنی حکومت کرنے میں کامیاب ہو جائے اور صحابی کہلانے والا شخص کامیاب نہ ہو سکے تو پھر اس کے لیے صحابیت و بال ہوئی یا کمال؟ معاویہ بن صخر صحابی، کاتب وحی اور خال المؤمنین کہے جانے کے باوجود عادل حکومت قائم کرنے میں اس حد تک ناکام ہوئے کہ اُن کا شمار خلفاء راشدین اور ائمہ میں نہ ہو سکا اور عمر بن عبدالعزیز صحابی نہ ہونے، کاتب وحی نہ ہونے اور خال المؤمنین نہ ہونے کے باوجود ایسی عادلانہ حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ انہیں خلفاء راشدین اور ائمہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ امام ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

الْخُلَفَاءُ: أَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ وَعُثْمَانُ وَعَلِيٌّ وَعُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ.

”خلفاء: حضرات ابوبکر، عمر، عثمان، علی اور عمر بن عبدالعزیز ؓ ہیں۔“

کبھی فرماتے:

الْأَئِمَّةُ: أَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ وَعُثْمَانُ وَعَلِيٌّ وَعُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ، وَمَا

بِوَيْ ذَٰلِكَ فَهُمْ مُنْتَزَوُونَ.

”ائمہ: حضرات ابوبکر، عمر، عثمان، علی اور عمر بن عبدالعزیز ؓ ہیں اور جو ان کے

ماسوا ہیں وہ برائی میں جلدی کرنے والے ہیں۔“

(جامع بیان العلم وفضله ج ۲ ص ۱۱۷۳)

اس جملہ کے آخر میں ”مُنْتَزَوُونَ“ کا لفظ آیا ہے، علماء لغت نے اس کا معنی یہ کیا ہے:

”انتزى ينتزى کا معنی ہے برائی اور شر کی طرف جلدی کرنا۔“

(النهاية في غريب الحديث والاثر ص ۹۱۱؛ مصباح اللغات ص ۸۶۹)

اور ظاہر ہے کہ ظلم، جور، فسق، بدعت اور بغاوت وغیرہ شر ہیں خیر نہیں۔ کیا یہ سارے شریعتنا عمر بن

عبدالعزیز ؓ کی حکومتی زندگی میں ثابت کیے جاسکتے ہیں؟ اگر نہیں تو بتائیے انہوں نے وہ خیر و بھلائی کہاں

سے سیکھی یا حاصل کی جس کی بدولت وہ خلفاء راشدین میں شمار ہو گئے؟ اور یہ بھی بتائیے کہ معاویہ بن ابی سفیان ایسی خیر و بھلائی سے کیوں محروم رہے کہ اُن کا شمار خلفاء راشدین میں نہ ہو سکا؟ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اُن میں وہ شر کہاں سے آگیا تھا جس کی وجہ سے اُن کے بارے میں وہ الفاظ استعمال کیے گئے جو ابھی ابھی صحابہ و ائمہ سے نقل کیے جا چکے ہیں حتیٰ کہ اُن کا شمار خلفاء راشدین کی بجائے ”مُنْتَزُونَ“ میں ہو گیا؟ جب اصل حقائق یہ ہیں تو پھر کیوں سمجھا جاتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اُن کے گھوڑے کے نتھنوں میں گھسنے والی غبار سے بھی کمتر ہیں؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ عمر بن عبدالعزیز افضل یا معاویہ بن ابی سفیان، وہ کوئی زیرک و دانا آدمی تھا۔

عمر بن عبدالعزیز افضل یا معاویہ، یہ سوال کیوں پیدا ہوا؟

یہاں اُن لوگوں سے سوال ہے جو پہلے سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اور معاویہ کے مابین مفاضلہ پر مبنی متقدمین کے سوال و جواب کو نقل کرتے ہیں پھر شانِ معاویہ میں مبالغہ بازی کی تمام حدیں پھلانگ جاتے ہیں۔ وہ بتائیں کہ کون نہیں جانتا کہ مطلقاً کسی صحابی اور غیر صحابی میں کوئی تقابل اور مفاضلہ بنتا ہی نہیں؟ یہ اس قدر بدیہی بات ہے کہ معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی اس سے بے خبر نہیں، لہذا ہر عقل مند مسلم کو چاہیے کہ وہ اُن وجوہات کو جاننے کی کوشش کرے جن کے باعث سائل کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ افضل یا معاویہ؟

ان وجوہات کے بیان کی زحمت ہم اُن لوگوں کو دینا چاہتے ہیں جو ایک طرف تو سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو معاویہ کے گھوڑے کی ٹاپ سے اُٹھنے والی گرد و غبار سے بھی کمتر سمجھتے ہیں اور دوسری طرف وہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو تو خلفاء راشدین میں شمار کرتے ہیں لیکن معاویہ کو خلفاء راشدین میں سے نہیں سمجھتے۔ ایسے لوگوں میں سے بعض حضرات نے ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے:

”خلافتِ راشدہ: وہ خلافت کہ منہاج نبوت (یعنی نبوی طریقے) پر ہو جیسے حضرات خلفائے اربعہ و امام حسن و امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے کی اور اب میرے خیال میں ایسی خلافتِ راشدہ امام مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی قائم

کریں گے۔

(ملفوظات اعلیٰ حضرت ص ۱۶۰، مکتبۃ المدینہ کراچی؛ بہار شریعت ج ۱ حصہ (الف) ص ۲۵۷، مکتبۃ المدینہ، کراچی؛ حضرت سیدنا عمر بن عبد العزیز کی 425 حکایات ص ۱۲۹، منجانب: دعوتِ اسلامی شعبہ اصلاح، مکتبۃ المدینہ، کراچی)

سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی خلافت کے فوراً بعد اُس شخص کا نام خلفاء راشدین میں کیسے آگیا جس کو امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی دست برداری سے ساٹھ (۶۰) سال بعد اقتدار ملا، اور اُس شخص کا نام خلفاء راشدین کی فہرست میں کیوں نہ شامل ہو سکا جس کو امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی دست برداری سے فوراً بعد اُسی دن ہی مکمل اقتدار مل گیا تھا؟ وجہ کیا ہے؟ صحابی، کاتب وحی، خال المومنین اور زمانی لحاظ سے خلافتِ راشدہ سے متصل شخص کو خلفاء راشدین علیہ السلام کی فہرست میں شمولیت ہی نہ ملی، اور جو صحابی نہیں، کاتب وحی نہیں، خال المومنین نہیں اور دو خلفاء راشدین علیہ السلام سے ساٹھ برس دور ہے، اُس کو خلفاء راشدین علیہ السلام کی فہرست میں شامل ہونا نصیب ہو گیا، وجہ کیا ہے؟؟

اعلیٰ حضرت اور مورانا امجدی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ دونوں اُس کے خلیفہ راشد ہونے کے قائل نہیں ہیں اور بعض تعظیلات بھی قائل نہیں۔ چنانچہ بعض تعظیلات کے شعبہ اصلاحی کتب کے قلم کار حضرات لکھتے ہیں:

”حضرت سیدنا عمر بن عبد العزیز علیہ رحمۃ اللہ العزیز کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ خلافتِ اسلامیہ کو خلافتِ راشدہ کی طرز پر قائم کر کے عہد صدیقی اور عہد فاروقی کو دنیا میں پھر واپس لے آئے تھے۔ تجدید و اصلاح کے اسی کارنامے کی بدولت آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا زمانہ خلافتِ راشدہ میں شمار کیا جاتا ہے۔“

(حضرت سیدنا عمر بن عبد العزیز کی 425 حکایات ص ۱۲۹)

پوچھنا یہ تھا کہ جس عہد صدیقی و فاروقی کو سیدنا عمر بن عبد العزیز علیہ السلام دنیا میں پھر واپس لے آئے تھے، اُس عہد کو ختم یا پامال کس نے کیا تھا؟ نیز وفاتِ معاویہ سے تقریباً ۳۹ سال بعد، سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی دست برداری سے ساٹھ سال بعد اور وصالِ نبوی ﷺ سے ۹۰ سال بعد اُس عہد کو حضرت عمر بن عبد

العزیز ﷺ تو واپس لے آئے مگر ایک صحابی اور کاتب وحی شخص اُس نظام کو قائم ہی کیوں نہ رکھ سکا؟ وہ مکمل اختیارات کے ساتھ بیس برس تک حکومت کرنے کے باوجود اُس نظام کو کیوں نہ سنبھال سکا اور خلیفہ راشد کے ٹائٹل سے کیوں محروم رہا، آخر اس محرومی کی وجوہات کیا ہیں؟؟؟

وکلّائے طلقاء حقانیت پر مبنی وجوہات بیان کریں گے تو حقیقت عیاں ہو جائے گی اور وہ بیان نہ بھی کریں تو عقل مندوں پر تو از خود یہ حقیقت عیاں ہے کہ۔

عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی جہنم بھی

یہ خاک اپنی فطرت میں نہ لوری ہے نہ ناری

قارئین کرام یقین فرمائیے! اگر ایمان داری اور انصاف و دیانت کے ساتھ ان وجوہات کا جواب وکلّائے طلقاء نے دے دیا تو یقیناً بڑے بڑے عقدے کھل جائیں گے اور سارے بھرم ٹوٹ جائیں گے۔ پھر کوئی عقل مند اور شریعت پسند شخص بعض مجہول اور عادی شعراء کے اس قسم کے اشعار سے استدلال کرنے کی جسارت نہیں کرے گا:

وَمَنْ يَكُنْ يَطْعَنُ فِي معاوية

فَإِنَّ كَلْبَ مَنْ كَلَابِ الهَاوية

سیدنا عمر بن عبدالعزیز ﷺ اور معاویہ کے مابین مفاضلہ پر امام ابن المبارک وغیرہ کے قول پر بحث و نظر کے لیے راقم الحروف کی کتاب ”الاحادیث الموضوعة في فضائل معاوية“ کا مطالعہ بھی بہت مفید ثابت ہوگا۔

سب شروع کرنے اور بند کرنے والا برابر؟

قارئین کرام! آپ نواصب زمانہ کے سامنے یہ سادہ سا سوال رکھیں کہ اگر ایک صحابی کہلانے والا شخص سیدنا علی ﷺ پر سب و شتم شروع کرائے اور غیر صحابی اُس سب و شتم کو بند کرائے تو افضل کون ہوگا؟ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیے کہ عام مسلمان کو سب کرنا منع ہے اور سیدنا علی ﷺ کو سب کرنا نبی کریم ﷺ پر سب کرنا ہے، لہذا خود ہی سمجھ لینا چاہیے کہ سب و شتم شروع کرانے والا کتنا بڑا مجرم ہوگا اور سب و شتم

بند کرانے والا کتاب بڑا متقی؟

نوٹ:

بعض غیر ملکی ماریوں نے ”حضرت معاویہ خلیفہ راشد“ کے نام سے ایک کتاب لکھ ماری ہے، میں نے اُس کا مطالعہ کیا ہے، انتہائی کمزور، بددیانتی اور تاویلاتِ فاسدہ پر مبنی تحریر ہے، اس لیے میں نے اُس کی تردید میں دلچسپی نہیں لی، کیونکہ کسی غیر اہم تحریر کی تردید کی جائے تو اُس کی عمر بڑھ جاتی ہے۔

تعصب سے حقائق اوجھل ہو جاتے ہیں

قرائن و احوال سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض علماء ہند سے ایسی سنگین غلطی جو سر اسر کتاب و سنت کے منافی ہے اس لیے سرزد ہو گئی کہ وہ تردید و روافض میں بہت ہی سخت تھے، اور بسا اوقات انسان مذہبی تعصب میں فریقِ مخالف کی سچی باتوں پر بھی ہاتھ صاف کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ چنانچہ علامہ ابن تیمیہ بھی روافض کی تردید میں متقی مرتضوی کے مرتکب ہو گئے تھے، جیسا کہ امام سبکی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے یوسف بن حسین بن مطہر لُحَافی کے حالات میں اُن کے قول کی تائید فرمائی ہے۔ دیکھئے!

(لسان المیزان للعسقلانی ج ۷ ص ۵۲۹، ۵۳۰؛ الأجوبة الفاضلة للأسئلة العشرة الكاملة للكنوي ص ۱۷۴، ۱۷۵)

اگر کچھ لوگوں کو مجھ عاجز کی یہ بات حقیقت کے منافی محسوس ہو رہی ہو تو میں اُن کے سامنے ایک ناقابلِ تردید نظیر پیش کر دیتا ہوں۔ بعض علماء ہند سے لاہور کے بعض لوگوں نے دو سوال کیے، سوال کا مکمل رُخ معاویہ کی طرف ہے، اُس میں اہل جمل کا ذکر تک نہیں مگر چونکہ سوال میں روافض کا ذکر آ گیا ہے، اس لیے بعض علماء ہند کی توجہ سوال کے مندرجات پر مرکوز نہ رہی اور انہوں نے روافض کو کوسنا شروع کر دیا، پھر جس شخص اور جس جنگ کے بارے میں اُن سے سوال کیا گیا تھا اُس کا جواب دینے کی بجائے وہ ایسی بحث میں کھو گئے جو سائل کا مقصود ہی نہیں تھا۔ آئیے مکمل سوال و جواب خود پڑھ لیجئے:

”مسئلہ: از لاہور، مسجد بیگم شاہی اندرون دروازہ مستی، مرسلہ صوفی احمد الدین طالب علم، ۲۶ صفر ۱۳۳۸ھ۔

حضرت ہادی و رہنمائے سالکوں قبلہ دو جہاں دام فیضہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ، مسائل ذیل میں حضرت کیا فرماتے ہیں:

۱۔ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وحمہ الکریم حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ایک روز خفا ہوئے، اور روافض کہتے ہیں: یہی وجہ ہے باغی ہونے کی۔ پھر ایک کتاب مولانا حاجی صاحب کی تصنیف اعتقادنامہ ہے جو بچوں کو پڑھایا جاتا ہے، اس میں یہ شعر بھی درج ہے۔

حق در آنجا بدست حمد و بود
جنگ با او خطا و منکر بود
(حق وہاں حیدر کرار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ میں تھا، ان کے ساتھ جنگ غلط و ناپسندیدہ تھی)

۲۔ امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلافت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد کی تھی واسطے دفع جنگ کے۔

الجواب:

۱۔ روافض کا قول کذب محض ہے۔ عقائدنامہ میں خطا و منکر بود نہیں ہے بلکہ خطائے منکر بود۔ اہل سنت کے نزدیک امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خطا خطا اجتہادی تھی، اجتہاد پر طعن جائز نہیں ہے۔ خطا اجتہادی دو قسم ہے: مقرر و منکر۔ مقرر وہ جس کے صاحب (مترکب) کو اس پر برقرار رکھا جائے گا اور اس سے تعرض نہ کیا جائے گا، جیسے حنفیہ کے نزدیک شافعی المذہب مقتدی کا امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنا، اور منکر وہ جس پر انکار کیا جائے گا جبکہ اس کے سبب کوئی فتنہ پیدا ہوتا ہو، جیسے اجلہ اصحاب جمل

رضی اللہ تعالیٰ عنہم کہ قطعی جنتی ہیں اور ان کی خطایقیناً اجتہادی جس میں کسی نام سنیہ لینے والے کو کل لب کشائی نہیں، بائیں ہمہ اس پر انکار لازم تھا جیسا امیر المومنین مولیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم نے کیا، باقی مشاجرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں مداخلت حرام ہے۔ حدیث میں ہے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ (وآلہ) وسلم فرماتے ہیں:

”إِذَا ذُكِرَ أَصْحَابِي فَأَمْسِكُوا“ (جب میرے صحابہ کا ذکر آئے تو زبان روکو)

دوسری حدیث میں فرماتے ہیں صلی اللہ تعالیٰ علیہ (وآلہ) وسلم ”سَعَتُكُمْ لَأَصْحَابِي بَعْدِي زَلَّةٌ يَغْفِرُهَا اللَّهُ لَهُمْ لَسَابِقَتِهِمْ، ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِهِمْ قَوْمٌ يَكْفُرُهُمُ اللَّهُ عَلَىٰ مَنَاجِرِهِمْ فِي النَّارِ“ (قریب ہے کہ میرے اصحاب سے کچھ لغزش ہوگی جسے اللہ بخش دے گا اس سابقہ کے سبب جو ان کو میری سرکار میں ہے، پھر ان کے بعد کچھ لوگ آئیں گے جن کو اللہ تعالیٰ ناک کے بل جہنم میں اوندھا کر دے گا) یہ وہ ہیں جو ان لغزشوں کے سبب صحابہ پر طعن کریں گے، اللہ ﷻ نے تمام صحابہ سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ (وآلہ) وسلم کو قرآن عظیم میں دو قسم کیا: مومنین قبل فتح مکہ و مومنین بعد فتح۔ اول کو دوم پر تفصیل دی اور صاف فرمادیا: وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ سب سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ فرمایا اور ساتھ ہی ان کے افعال کی تفتیش کرنے والوں کا منہ بند فرمادیا ”وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ“ (اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرنے والے ہو) بائیں ہمہ وہ تم سب سے بھلائی کا وعدہ فرما چکا پھر دوسرا کون ہے کہ ان میں سے کسی کی بات پر طعن کرے۔ واللہ البہادی، واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۔ بیشک امام مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلافت سپرد فرمائی، اور اس سے صلح و بندش جنگ مقصود تھی اور یہ صلح و تقویٰ رض خلافت اللہ و رسول کی پسند سے ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ (وآلہ) وسلم نے امام حسن کو گود میں لے کر فرمایا تھا: ”ان ابني هذا سيد ولعل الله ان يصلح به بين فئتين عظيمتين“

من المسلمین“ (میرا یہ بیٹا سید ہے میں امید کرتا ہوں کہ اللہ اس کے سبب سے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرادے گا) امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگر خلافت کے اہل نہ ہوتے (تو) امام مجتبیٰ ہرگز انہیں تفویض نہ فرماتے، نہ اللہ و رسول اسے جائز رکھتے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔“

(فتاویٰ رضویہ ج ۲۹ ص ۳۳۵، ۳۳۷)

قارئین کرام! اس سوال و جواب کے الفاظ میں آپ خود بھی غور فرمائیں اور یہ عاجز بھی چند امور کو واضح کرنا چاہتا ہے:

۱۔ سوال نمبر [۱] میں معاویہ کے باغی ہونے کے متعلق دریافت کیا گیا اور اُس میں اُن کے باغی ہونے کی ایک صحیح یا غلط وجہ بھی مذکور ہے، لیکن بعض علماء ہند اس سوال کے جواب کو گول کر گئے۔

۲۔ اسی سوال میں ایک فارسی شعر میں ”جنگ با او خطا و منکر بود“ میں حرفِ واؤ زیادہ تھا تو فاضل بریلی اس غلطی کو روافض کی غلطی گردانتے ہوئے اُن پر برس پڑے اور کہا: ”روافض کا قول کذب محض ہے۔“ حالانکہ سائل نے یہ شعر روافض کی طرف سے نہیں اپنی طرف سے نقل کیا ہے، کیونکہ سائل نے یہ نہیں کہا کہ روافض نے بطور دلیل یہ شعر بھی پیش کیا ہے، لیکن چونکہ موصوف ردِ روافض میں خاصی دل چسپی لیتے تھے اس لیے اُن سے جواب کا آغاز ہی تردید سے ہو گیا اور انہیں دھیان نہ رہا کہ جس بات کو وہ ”روافض کا قول کذب محض ہے“ کہہ رہے ہیں وہ کذب ہے یا غلطی، اور اگر واقعی وہ کذب یا غلطی ہے تو کس کی طرف سے ہے، سائل کی جانب سے ہے یا روافض کی جانب سے؟

۳۔ اس کے بعد لفظِ باغی سے صرف نظر کرتے ہوئے فاضل بریلی کی توجہ شعر میں مذکور لفظِ منکر پر مرکوز ہو گئی تو انہوں نے اس کی دو قسمیں بیان کیں اور جس باغی شخص یا جس کی خطائے منکر کے متعلق سوال کیا گیا تھا اُسے آٹے سے بال کی طرح نکال لیا اور اُن قطعی جنتی ہستیوں (جنگِ جمل کے اکابر) کا ذکر شروع کر دیا جن کا سوال میں نام اور ذکر ہی نہیں ہے۔

۴۔ اُن اصحابِ جمل (ام المومنین سیدتنا عائشہ صدیقہ، سیدنا زبیر بن العوام اور سیدنا طلحہ بن عبید اللہ) (

کے اقدام کو خطا منکر قرار دے کر اُن پر انکار کو لازم کہا اور اسی لیے اُن کے خلاف سیدنا علیؑ کے اقدام کو حق کہا۔

۵۔ اس کے بعد انہیں یکا یک خیال آ گیا کہ ”مشاجراتِ صحابہؓ میں دخول حرام ہے“ اور اس پر انہوں نے احادیث بھی درج کر ڈالیں۔ اگر یہی بات تھی تو اولاً ہی سائل کو جواب میں یہی احادیث پیش کر کے فرما دیتے: خاموش! ”مشاجراتِ صحابہؓ میں دخول حرام ہے“ لیکن افسوس کہ انہوں نے ان احادیث کے باوجود قطعی جنتی ہستیوں کا ذکر چھیڑ دیا اور اُن کے اقدام کو خطائے منکر بھی قرار دے دیا، حالانکہ ان کے متعلق سائل نے سوال ہی نہیں کیا تھا اور حیرت کی بات ہے کہ سائل نے جس صاحب کے متعلق سوال کیا ہے فاضل موصوف اُس کی طرف گئے ہی نہیں۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ”إِذَا ذُكِرَ أَصْحَابِي فَأَمْسِكُوا“ کے الفاظ حدیث نبوی ہیں تو کیا یہ الفاظ فقط طلقاء کے دفاع کے لیے آئے ہیں، عشرہ مبشرہ اور قدیم صحابہ کرامؓ کے دفاع کے لیے نہیں آئے؟

۶۔ فاضل بریلی نے مذکور الصدر حدیث اور درج ذیل حدیث کو معاویہ کے دفاع میں نقل کیا ہے، کیونکہ سوال فقط معاویہ کے متعلق تھا، لیکن اُن کا یہ استدلال بہت سی احادیث کے خلاف ہے، کیونکہ احادیث مبارکہ میں جہاں بھی لفظ ”أَصْحَابِي“ سے نبی کریم ﷺ نے کوئی فضیلت، تہنیت یا نصیحت فرمائی ہے وہاں طلقاء مراد نہیں بلکہ سابقین اولون صحابہ کرامؓ مراد ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ راقم الحروف کی کتاب ”الصحابة والطلاق“ میں اس کی تفصیل آئے گی۔

۷۔ فاضل بریلی نے درج ذیل حدیث بھی معاویہ کی شان اور دفاع میں پیش کی:

سَعَكُونُ لِأَصْحَابِي بَعْدِي زَلَّةٌ يَغْفِرُهَا اللَّهُ لَهُمْ لِسَابِقَتِهِمْ ، ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِهِمْ قَوْمٌ يَكُفُّهُمْ اللَّهُ عَلَى مَا خَرَجَهُمْ فِي النَّارِ .

”قریب ہے کہ میرے اصحاب سے کچھ لغزش ہوگی جسے اللہ بخش دے گا، اس

سابقہ کے سبب جو اُن کو میری سرکار میں ہے، پھر اُن کے بعد کچھ لوگ آئیں گے جن کو

اللہ تعالیٰ ناک کے بل جہنم میں اوندھا کر دے گا۔“

اُن کا یہ استدلال بھی درست نہیں ہے، کیونکہ اس حدیث میں دو قسم کے لوگوں کا ذکر ہے اور دونوں کے لیے الفاظ الگ الگ ہیں، پہلے والوں کے لیے لفظ ”أَصْحَابِي“ ہے اور دوسروں کے لیے لفظ ”قَوْم“ استعمال فرمایا گیا ہے، ذرا توجہ سے دوبارہ پڑھ لیجئے!

سَتَكُونُ لِأَصْحَابِي بَعْدِي زُلَّةٌ يَغْفِرُهَا اللَّهُ لَهُمْ لِسَابِقَتِهِمْ“ اس جملہ میں لفظ ”تَكُونُ“ سے پہلے ”میں“ کا ہونا پھر اُس کے بعد لفظ ”أَصْحَابِي“ کا آنا پھر لفظ ”بَعْدِي“ (میرے بعد) پھر لفظ ”زُلَّة“ پھر ”لِسَابِقَتِهِمْ“ کے الفاظ اہل علم کی خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔

”سَتَكُونُ“ سے یہ بتایا گیا ہے کہ زیادہ عرصہ نہیں گزرے گا بلکہ میرے بعد مستقبل قریب ہی میں عام لوگوں سے نہیں بلکہ میرے صحابہ کرام ؓ سے لغزش ہوگی۔ پھر ان کے بعد آنے والوں کے لیے فرمایا: ”ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِهِمْ قَوْمٌ يَكْفُرُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ عَلَى مَا خَرَجَهُمْ فِي النَّارِ“ فاضل بریلی نے ان الفاظ سے اُن لوگوں کو مراد لیا ہے جن کی طرف سائل نے اشارہ کیا ہے، یعنی اعلیٰ حضرت کے دور کے لوگ۔ اہل علم سے درخواست ہے کہ وہ ایک طرف ”ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِهِمْ قَوْمٌ“ میں ”ثُمَّ“ اور ”مِنْ بَعْدِهِمْ“ کے الفاظ میں توجہ فرمائیں اور پھر پہلے جملے کے الفاظ ”لِأَصْحَابِي“ اور پھر دو مرتبہ ضمیر ”هُمْ“ میں غور فرمائیں اور بتائیں کہ کیا ”أَصْحَابِي“ کے بعد لفظ ”ثُمَّ“ سے جس قوم کے آنے کا ذکر ہے اُس سے چودھویں صدی کے وہ لوگ مراد ہیں جن سے صحابہ کی طرح ”زُلَّة“ (لغزش) واقع ہوگی یا وہ لوگ مراد ہیں جو اُن صحابہ کرام ؓ کے زمانے میں اُن کے فوراً بعد اُسی طرح کی لغزش کا ارتکاب کریں گے؟

اصل بات یہ ہے کہ پہلے تو یہ حدیث انتہائی ضعیف ہے اور اس سے استدلال درست نہیں، لیکن اگر اس سے استدلال جائز بھی ہو تو پھر اس سے ایسی قوم مراد ہے جو نمودار تو ہوگی صحابہ کرام ؓ کے فوراً بعد اور وہ اُن ہی کی طرح کا عمل کرے گی مگر اُن کا عمل ”زُلَّة“ (لغزش) نہیں ہوگا بلکہ جرم ہوگا، اسی لیے اُن کے لیے ”يَغْفِرُهَا اللَّهُ“ کے الفاظ نہیں بلکہ ”النَّارُ“ کا لفظ ہے، اور یہ وہی قوم ہے جس کے لیے یہی لفظ حسب ذیل حدیث میں بھی آیا ہے:

وَبِئْسَ عَمَلًا، تَقْتُلُهُ الْفِتْنَةُ الْبَاطِنِيَّةُ، يَدْعُوهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ، وَيَدْعُوْنَهُ إِلَى النَّارِ.

”عمار پر رحمت ہو، اس کو ایک باغی گردہ قتل کرے گا، یہ اُن کو جنت کی طرف بلائے گا اور وہ اس کو دوزخ کی طرف بلائیں گے۔“

(بخاری ص ۷۸ حدیث ۴۴۷، ص ۴۶۶ حدیث ۲۸۱۲)

خیال رہے کہ اس معنوی اطلاق سے کچھ لوگوں کو مستثنیٰ سمجھا جاسکتا ہے، کیونکہ ہر شخص کا معاملہ اُس کی نیت کے مطابق ہوتا ہے، جیسا کہ خود سیدنا علی ؓ کا یہ ارشادِ عدل اس پر شاہد ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيدُ رَجَةَ اللَّهِ مِنَّا وَمِنْهُمْ نَجَا.

”ہم میں سے اور اُن میں سے جس نے رضائے الہی کا ارادہ کیا وہی نجات پائے گا۔“

(تاریخ دمشق ج ۱ ص ۳۴۶؛ مختصر تاریخ دمشق ج ۱ ص ۱۳۱)

دوسری حدیث میں سیدنا علی ؓ سے جو الفاظ منقول ہیں وہ نقطہ مقتولین کے لیے ہیں۔ چنانچہ

فرمایا:

مَنْ قُتِلَ مِنَّا وَمِنْهُمْ يُرِيدُ رَجَةَ اللَّهِ وَالْذَّارَ الْآخِرَةَ، دَخَلَ الْجَنَّةَ.

”ہم میں سے اور اُن میں سے جو رضائے الہی اور دارِ آخرت کے لیے شہید ہو گیا وہ جنت میں داخل ہوا۔“

(سنن سعید بن منصور، باب جامع الشهادة ج ۲ ص ۳۴۴، ۳۴۵ حدیث ۲۹۶۸)

نیز بعض علماء ہند کا زیر بحث ضعیف حدیث ”سَكُونٌ لِأَصْحَابِي بَعْدِي زَلَّةٌ يَغْفِرُهَا اللَّهُ لَهُمْ

لِسَابِقَتِهِمْ“ کو طلقاء کی شان میں لانا قرآن مجید کی درج ذیل آیات کے بھی خلاف ہے:

يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ مَنْ يَأْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُبَيَّنَةٍ يُضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ
ضِعْفَيْنِ وَكَانَ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا. وَمَنْ يَقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ
وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُورِثْهَا أَجْرَهَا مَوْتَتَيْنِ.

”اے نبی کی بیویو جو تم میں صریح حیا کے خلاف کوئی جرات کرے اس پر اوروں

سے دو ناعذاب ہوگا اور یہ اللہ پر آسان ہے، اور جو تم میں فرماں بردار رہے اللہ اور رسول

کی اور اچھا کام کرے ہم اُسے اوروں سے دونا ثواب دیں گے۔“

(الاحزاب: ۳۰، ۳۱)

کیا بعض طلقاء امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن سے زیادہ صحبت یافتہ تھے؟ یہ آیات تو ظاہری ہیں کہ جس طرح کسی صحابی کو اُس کی کسی نیکی پر اجر دو گنا دیا جائے گا اسی طرح اُس کی برائی پر عذاب بھی دو گنا دیا جائے گا۔

﴿وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَى﴾ سے استدلال کا جائزہ

فاضل بریلی نے بعض طلقاء کو ﴿وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَى﴾ میں بھی شامل کر دیا ہے لیکن اُن کا یہ استدلال مردود و باطل ہے، کیونکہ سورۃ الحدید فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی ہے، حتیٰ کہ یہ اختلاف بھی ہے کہ یہ سورت مکی ہے یا مدنی، بعض نے کہا ہے کہ اس کا کچھ حصہ مکی ہے اور کچھ حصہ مدنی، بہر حال یہ فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی تھی اور معاویہ بن ابی سفیان فتح مکہ کے بعد مجبوراً اسلام لائے تھے۔ سورۃ الحدید کی اس آیت میں جو لفظ ”الفتح“ آیا ہے اُس کی تفسیر معلوم کرنے کے لیے اگر آپ کتب تفسیر کو کھنگالنا شروع کریں گے تو آپ کو نقل درنقل کے طور پر فتح مکہ کے قائلین کی تعداد زیادہ ملے گی مگر اہل تحقیق مفسرین نے اس سے فتح مکہ نہیں بلکہ صلح حدیبیہ کی فتح مراد لی ہے اور اسی کو صحت کے قریب اور رائج قرار دیا ہے۔ چنانچہ امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ فتح مکہ اور فتح حدیبیہ دونوں کے بارے میں تفسیری اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وَأَوَّلَى الْأَقْوَالِ فِي ذَلِكَ بِالصَّوَابِ عِنْدِي أَنْ يُقَالَ: مَعْنَى ذَلِكَ:
لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ أَيُّهَا النَّاسُ مَنْ أُنْفِقَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ مِنْ قَبْلِ فَتْحِ
الْحُدَيْبِيَّةِ، لِلَّذِي ذَكَرْنَا مِنَ الْغُبَرِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، الَّذِي رَوَيْنَاهُ عَنْ
أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ عَنْهُ.

”اور میرے نزدیک ان اقوال میں سے صحیح یہ ہے کہ اس آیت کا معنی یوں کیا جائے: اے لوگو! تم اُن کے برابر نہیں ہو جنہوں نے تم میں سے فتح حدیبیہ سے قبل راہ

الہی میں خرچ کیا ہے، اس لیے کہ ہم اس کی دلیل میں رسول اللہ ﷺ کا وہ ارشاد نقل کر چکے ہیں جو آپ ﷺ سے حضرت ابوسعید خدریؓ نے روایت کیا ہے۔

(جامع البیان ج ۲۲ ص ۳۹۵)

امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے قبل جو حدیث نبوی نقل فرمائی ہے وہ یہ ہے:

عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، قَالَ: قَالَ لَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ غَامَ الْحُدَيْبِيَّةِ: يُوشِكُ أَنْ يَأْتِيَ قَوْمٌ تَحْقِرُونَ أَعْمَالَكُمْ مَعَ أَعْمَالِهِمْ، قُلْنَا: مَنْ هُمْ يَا رَسُولَ اللَّهِ، أَقْرَبُشْ هُمْ؟ قَالَ: لَا، وَلَكِنْ أَهْلُ الْيَمَنِ، أَرَأَيْتُمْ أَفْلَدَةً، وَالْأَيْمَنُ قُلُوبًا. فَقُلْنَا: هُمْ خَيْرٌ مِنَّا يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ فَقَالَ: لَوْ كَانَ لِأَحَدِهِمْ جَبَلٌ مِّنْ ذَهَبٍ فَأَنْفَقَهُ، مَا أَذْرَكَ مُدًّا أَحَدُكُمْ وَلَا نَصِيفَةً، أَلَا إِنَّ هَذَا فَصْلٌ مَّا بَيْنَنَا وَبَيْنَ النَّاسِ ﴿لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتِلَ﴾ إِلَى قَوْلِهِ: ﴿وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾.

”سیدنا ابوسعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حدیبیہ کے سال ارشاد فرمایا: عنقریب تمہارے پاس ایک قوم آئے گی جن کے اعمال کے مقابلہ میں تم اپنے اعمال کو حقیر سمجھو گے۔ ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ کون ہیں، کیا قریش ہیں وہ؟ فرمایا: نہیں، لیکن وہ اہل یمن ہیں جو بہت زیادہ رقیق القلب اور نرم خو ہیں۔ ہم نے پھر عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا وہ ہم سے بہتر ہیں؟ فرمایا: اگر ان میں سے کسی کے پاس سونے کا پہاڑ ہو پھر وہ اُس کو خرچ کر دے تو وہ تمہارے ایک اور آدھے مد کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتا۔ سنو! ہمارے اور لوگوں کے درمیان یہ آیت حد فاصل ہے: ﴿تم میں سے کوئی برابر نہیں کر سکتا ان کی جنہوں نے فتح سے پہلے خرچ کیا اور جنگ کی، ان کا درجہ بہت بڑا ہے ان سے جنہوں نے فتح کے بعد مال خرچ کیا اور جنگ کی، اور سب کے ساتھ اللہ نے وعدہ کیا ہے بھلائی کا، اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو اُس

سے بخوبی خبردار ہے۔“

(جامع البیان ج ۲۲ ص ۳۹۴؛ تفسیر ابن ابی حاتم ج ۱۰ ص ۳۳۳۶)

اس حدیث کی سند میں سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے علاوہ پانچ راوی ہیں:

۱۔ یونس بن عبدالاعلیٰ مصری، یہ امام ابن جریر طبری کے مشائخ میں سے ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ ثقہ ہیں۔

(تقریب التہذیب ص ۱۰۹۸)

۲۔ ابن وہب: ان کی توثیق کے بارے میں پہلے لکھا جا چکا ہے۔

۳۔ ہشام بن سعد: ان کے بارے میں حافظ نے تمام اقوال کا خلاصہ ان الفاظ میں درج کیا ہے:

صَدْرُ قِيٍّ لَهُ أَوْهَامٌ ، وَدُمِيٌّ بِالتَّشْيِيعِ .

”یہ سچا ہے، اس کے کچھ اوہام تھے اور اس پر تشیع کی تہمت لگائی گئی ہے۔“

(تقریب التہذیب ص ۱۰۹۸)

لیکن یہاں اس بات کا خیال رہے کہ اس حدیث میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے تشیع کو تقویت ملے، نیز یہ حدیث انہوں نے زید بن اسلم سے روایت کی ہے، اور ان سے روایت میں وہ تمام لوگوں سے زیادہ مضبوط تھے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی ہی لکھتے ہیں:

قَالَ الْآجُرِّيُّ ، عَنْ أَبِي دَاوُدَ : هِشَامُ بْنُ سَعْدٍ أَثْبَتَ النَّاسَ فِي زَيْدِ

بْنِ أَسْلَمَ .

”محدث آجری امام ابوداؤد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: ہشام

بن سعد زید بن اسلم سے روایت کرنے میں تمام لوگوں سے زیادہ مضبوط ہیں۔“

(تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۶۴۱)

۴۔ زید بن اسلم رضی اللہ عنہ: یہ سیدنا عمر کے غلام ہیں۔ حافظ عسقلانی لکھتے ہیں: یہ ثقہ عالم تھے۔

(تقریب التہذیب ص ۳۵۰)

۵۔ عطاء بن یسار ابو محمد دنی ہلالی: یہ سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے غلام تھے۔ حافظ عسقلانی ان کے بارے میں لکھتے ہیں: یہ ثقہ فاضل تھے۔

(تقریب التہذیب ۶۷۹)

امام سیوطی نے سورۃ الفتح کی تفسیر میں محدث عبد بن حمید سے اس سے بھی زیادہ واضح حدیث نقل فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

عَنْ عَامِرِ الشَّعْبِيِّ، أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ يَوْمَ الْحُدَيْبِيَّةِ: أَفْتَحَ هَذَا؟ قَالَ: وَأَنْزِلْتُ عَلَيْهِ: ﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا﴾ فَقَالَ النَّبِيُّ: نَعَمْ، عَظِيمٌ. قَالَ: وَكَانَ فَضْلٌ مَا بَيْنَ الْهَجْرَتَيْنِ فَتَحَ الْحُدَيْبِيَّةَ، فَقَالَ: ﴿لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَلْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ﴾.

”حضرت عامر شعیبیؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے حدیبیہ کے دن دریافت کیا: کیا یہ فتح ہے؟ راوی کہتے ہیں: اور آپ پر آیت ﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا﴾ نازل کی گئی تھی۔ پس نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہاں عظیم فتح ہے۔ فرمایا: دو ہجرتوں کے درمیان فرق حدیبیہ کی فتح ہے، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: ﴿لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَلْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ﴾۔“

(الدر المنثور ج ۱۳ ص ۴۶۱)

اصل فتح صلح حدیبیہ ہے، قول محقق

اس تفسیر نبوی ﷺ کے بعد کوئی ابہام باقی نہ رہا کہ سورۃ الحدید کی آیت نمبر ۱۰ ﴿لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَلْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ﴾ میں جس فتح کا ذکر ہے اُس سے صلح حدیبیہ کی فتح مراد ہے۔ اب اس سلسلہ میں اگرچہ تفسیری اقوال نقل کرنے کی حاجت نہیں ہے، تاہم بعض لوگوں کی تسلی کے لیے چند حوالہ جات پیش کرتا ہوں۔ امام ابو حیان اندلسی نے اس قسم کے دلائل کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کو قول جمہور قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

وَقَالَ الْجَمْهُورُ: هُوَ فَتْحُ الْحَدِيثِ، وَقَالَ السُّدِّيُّ وَالشَّعْبِيُّ
وَالزُّهْرِيُّ: قَالَ ابْنُ عَطِيَّةٍ: وَهُوَ الصَّحِيحُ.

”جمہور نے کہا: یہ فتح حدیث ہے، اور یہی سدی، فحسی اور زہری کا قول ہے۔
ابن عطیہ نے کہا: یہی صحیح ہے۔“

(البحر المحيط ج ۸ ص ۸۹)

علامہ محمود آلوسی حنفی نے اس مقام پر تفصیلی کلام کیا ہے اور فرمایا ہے کہ قبل از فتح اور بعد از فتح سے مراد
صلح حدیبیہ سے قبل اور صلح حدیبیہ کے بعد ہے۔ پہلے انہوں نے مشہور حدیث ”لَا تَسُبُّوا أَصْحَابِي“
درج فرمائی ہے، اس میں حضرت عبدالرحمان بن عوف اور حضرت خالد بن ولید کے تنازع کا ذکر ہے، ان
میں سے اول الذکر قدیم الاسلام ہیں اور مؤخر الذکر صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔ پھر انہوں نے
آیت میں جو لفظ ﴿أُولَئِكَ أَكْثَرُ دَرَجَةً﴾ آیا ہے اُس سے انہوں نے حدیبیہ سے پہلے والے قدیم
الاسلام صحابہ کرام ﷺ کو مراد لیا ہے اور ﴿مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدِ وَقَاتِلُوا﴾ سے صلح حدیبیہ کے بعد
والوں کو مراد لیا ہے۔ پھر انہوں نے نتیجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

لَمْ يَفِي الْحَدِيثُ تَأْيِيدَ مَا لِيَكُونَ ﴿أُولَئِكَ﴾ هُمُ الَّذِينَ أَنْفَقُوا قَبْلَ
الْحَدِيثِ، لِأَنَّ إِسْلَامَهُ ﷺ كَانَ بَيْنَ الْحَدِيثِ وَفَتْحِ مَكَّةَ كَمَا فِي
”التَّقْرِيبِ“ وَغَيْرِهِ، وَالزُّمَخْشَرِيُّ فَسَّرَ الْفَتْحَ بِفَتْحِ مَكَّةَ، فَلَا تَغْفَلُ.

”پھر اس حدیث (لَا تَسُبُّوا) میں اس بات کی تائید ہے کہ ﴿أُولَئِكَ﴾
أَكْثَرُ دَرَجَةً میں اُن لوگوں کا ذکر ہے جو صلح حدیبیہ سے پہلے مسلمان ہوئے، کیونکہ
حضرت خالد ﷺ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیانی عرصہ میں اسلام لائے تھے، جیسا
کہ ”تقریب التہذیب“ وغیرہ کتب میں ہے، اور علامہ زخشری نے الفتح کی تفسیر فتح
مکہ سے کی ہے، لہذا غفلت کا شکار نہ ہوتا۔“

(روح المعانی ج ۲۶ ص ۴۱۲)

پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے مطابق سورۃ الحدید کا نزول ہی فتح مکہ سے پہلے ہوا، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

”اس کی آیات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نزول غزوۂ اُحداور صلح حدیبیہ کے درمیانی عرصہ میں ہوا۔“

(ضمیمۃ القرآن ج ۵ ص ۱۰۴)

پیر صاحب نے سورۃ الفتح کی پہلی آیت کی تفسیر میں بھی دوسرے اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

”اس فتح مبین سے مراد صلح حدیبیہ ہے۔“

(ضمیمۃ القرآن ج ۴ ص ۵۳۱)

مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ سورۃ الفتح کی پہلی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”اکثر مفسرین فتح سے صلح حدیبیہ مراد لیتے ہیں۔“

(خزائن العرفان ص ۵۲۰)

نواب صدیق حسن قزوینی لکھتے ہیں:

وَقَالَ الشَّعْبِيُّ وَالزُّهْرِيُّ: فَتْحُ الْحَدَيْبِيَّةِ، وَهُوَ الرَّاجِعُ قَالَهُ الْكُرَّجِيُّ.

”امام شعبی اور زہری نے فرمایا: فتح حدیبیہ مراد ہے اور امام کرخی نے فرمایا: یہی راجح ہے۔“

(فتح البیان فی مقاصد القرآن ج ۱۳ ص ۴۰۱)

حدیبیہ کی بجائے فتح مکہ کیوں مشہور ہو گئی؟

یوں محسوس ہوتا ہے کہ بعض غرض مندوں نے اس آیت کی تفسیر میں فتح مکہ کو اس قدر شہرت دی کہ عام لوگوں نے اسی کو ہی اصل فتح سمجھ لیا، جبکہ قدیم الاسلام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک صلح حدیبیہ اصل فتح تھی۔ چنانچہ امام بخاری حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

تَعْدُونَ أَنْتُمْ الْفَتْحَ فَتَحَ مَكَّةَ، وَقَدْ كَانَ فَتْحُ مَكَّةَ فَتْحًا وَنَحْنُ نَعُدُّ

الْفَتْحَ بَيْعَةَ الرِّضْوَانِ يَوْمَ الْحَدَيْبِيَّةِ.

”تم لوگ فتح مکہ کو فتح سمجھتے ہو، بیشک فتح مکہ بھی ایک فتح تھی، جبکہ ہم حدیبیہ کے دن بیعت رضوان کو فتح سمجھتے ہیں۔“

(بخاری: کتاب المغازی، باب غزوة الحديبية، ص ۵۶۷ حدیث ۴۱۵۰؛ تاریخ الإسلام للذهبي ج ۱ ص ۳۷۴)

خدا جانے کہ سیدنا براء بن عازب ؓ کو کن لوگوں کے سامنے اور کیوں یہ وضاحت کرنا پڑی ہوگی کہ اصل فتح کون سی ہے، اُن کے سال وفات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں یہ وضاحت اُس دور میں کرنا پڑی ہوگی جب بعض طلقاء خود کو فتح مکہ کے بعد والے مجاہدین باور کراتے ہوں گے تاکہ سادہ لوگ انہیں بھی ہیرو سمجھنے پر مجبور ہوں۔ ہمارے اِس خیال کی صحت کی ایک دلیل تو سیدنا براء بن عازب ؓ کا طلقاء بنو امیہ کے دورِ ملوکیت تک زندہ رہنا اور اُن کے دور کا مشاہدہ کرنا ہے، کیونکہ اُن کی وفات ۷۷ھ میں ہوئی تھی، اور دوسری دلیل حضرت مقداد بن اسود ؓ کا وہ تلخ تجربہ ہے جو انہیں شام کی سرزمین میں حاصل ہوا۔ امام طبرانی عبدالرحمان بن میسرہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا:

مَرَّ بِاَلْمِقْدَادِ بْنِ اَلْاَسْوَدِ رَجُلٌ فَقَالَ: لَقَدْ اُفْلَحْتَ هَاتَانِ الْعَيْنَانِ
رَأَا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ، فَاجْتَمَعَ الْمِقْدَادُ غَضَبًا وَقَالَ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ اَلَا
تَتَمَنَّوْا اَمْرًا قَدْ غَيَّبَهُ اللّٰهُ، فَكُم مِّمَّنْ قَدْ رَاَهُ وَلَمْ يَنْتَفِعْ بِوُرُودِهِ.

”سیدنا مقداد بن اسود ؓ کے قریب سے ایک شخص گزرا تو وہ کہنے لگا: اُن آنکھوں نے کامیابی پائی جو رسول اللہ ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوئیں۔ اس پر سیدنا مقداد ؓ انتہائی غضب ناک ہوئے اور فرمایا: لوگو! اُس امر کی تمنّا مت کرو جسے اللہ ﷻ نے مخفی رکھا ہے، بہت سے لوگوں نے آپ ﷺ کو دیکھا لیکن انہوں نے آپ کے دیوار سے فائدہ نہ اٹھایا۔“

(مسند الشاميين للطبراني ج ۲ ص ۱۴۸، ۱۴۹ حدیث ۱۰۸۱؛ المعجم الكبير ج ۲۰ ص ۲۵۸ حدیث ۶۰۸؛ تاریخ دمشق (مفصلاً) ج ۶۰ ص ۱۸۰؛ مختصر تاریخ دمشق ج ۲۵ ص ۲۲۱)

بظاہر اُس آدمی کے جملہ میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی جس کو سبب غصہ سمجھا جائے، لیکن چونکہ اُس دور کے لوگوں کے سامنے بعض طلقاء نے خود کو غیر معمولی طور پر چڑھا رکھا تھا اس لیے وہ اس انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے تھے۔ حضرت مقداد ؓ چونکہ ایسی حیرت و تعجب کے پس پردہ چال سے آشنا ہو چکے تھے اس لیے وہ نہ صرف یہ کہ غضبناک ہوئے بلکہ ساتھ ہی ”فَکُم مِّمَّنْ قَدْ رَاَهُ وَلَمْ يَنْتَفِعْ بِرُؤْيَاهُ“ کے الفاظ سے اُن سرداروں پر تعریض و طنز بھی فرمادی جو صحابیت کے ٹائٹل سے ناجائز فوائد تو حاصل کرتے تھے مگر صحابہ کرام ؓ کے اُسوہ حسنہ سے محروم تھے۔ فی الجملہ یہ کہ حضرت براء بن عازب ؓ نے ایک خاص دور میں وضاحت فرمادی تھی کہ اصل فتح صلح حدیبیہ کی فتح تھی۔

سیدنا انس بن مالک ؓ کے نزدیک بھی فتح مبین سے مراد صلح حدیبیہ کی فتح ہے۔ چنانچہ حضرت قتادہ ؓ فرماتے ہیں:

”سیدنا انس ؓ نے سورۃ الفتح کی پہلی آیت تلاوت کی اور پھر فرمایا: یہ حدیبیہ کی فتح ہے۔“

(بخاری: کتاب التفسیر، باب سورۃ الفتح، ص ۶۸۵ حدیث ۴۸۳۴؛ دلائل النبوة للبيهقي ج

۴ ص ۱۵۷)

اوپر ہم سیدنا ابوسعید خدری ؓ کی روایت نقل کر چکے ہیں کہ خود نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ کی صلح کو فتح فرمایا ہے، اسی طرح حضرت مجمع بن جاریہ نے بھی آپ ﷺ سے نقل کیا ہے کہ صلح حدیبیہ فتح ہے۔

(دلائل النبوة للبيهقي ج ۴ ص ۱۵۷)

نیز حضرت عروہ نے متعدد صحابہ سے نقل کیا ہے کہ لوگوں نے حدیبیہ کے دن کہا: ہمیں مکہ جانے سے روک دیا گیا، لہذا صلح حدیبیہ کوئی فتح نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ کو یہ بات پہنچی تو آپ نے فرمایا:

بَسَّ الْكَلَامُ اهَذَا اَعْظَمُ الْفَتْحِ.

”بری بات! یہ عظیم ترین فتح ہے۔“

(دلائل النبوة للبيهقي ج ۴ ص ۱۶۰؛ تاریخ الإسلام للذهبي ج ۱ ص ۳۹۷؛ السرا المنشور ج ۱۳

ص ۴۵۹)

امام صالحی شامی لکھتے ہیں:

وَكَانَ أَبُو بَكْرٍ رضی اللہ عنہ يَقُولُ: مَا كَانَ فَتْحُ فِي الْإِسْلَامِ أَعْظَمَ مِنْ صَلْحِ الْحُدَيْبِيَّةِ.
”سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: اسلام میں صلح حدیبیہ سے بڑھ کر کوئی فتح نہیں ہے۔“

(سبل الہدی والرشاد ج ۵ ص ۶۴)

سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک تو صلح حدیبیہ کے علاوہ فتح کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ چنانچہ امام ابو منصور ماتریدی حنفی اور امام ابن جریر طبری وغیرہما لکھتے ہیں:

وَعَنْ جَابِرٍ أَنَّهُ قَالَ: مَا كُنَّا نَعُدُّ الْفَتْحَ إِلَّا يَوْمَ الْحُدَيْبِيَّةِ.

”سیدنا جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم یوم حدیبیہ کے علاوہ کسی چیز کو فتح شمار ہی نہیں کرتے تھے۔“

(تاویلات أهل السنة للماتریدی ج ۹ ص ۲۹۱؛ جامع البيان ج ۲۱ ص ۲۴۲؛ تفسیر ابن کثیر ج ۷ ص ۳۲۵)

غور کیا جائے تو درحقیقت یہ تفسیر قرآن بالقرآن ہے، چنانچہ علامہ ابن عاشور کے درج ذیل کلام سے بھی اس حقیقت کی تائید ہوتی ہے۔ وہ سورۃ المدید کی آیت نمبر ۱۰ کی تفسیر میں متعدد اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وَقِيلَ الْمُرَادُ بِالْفَتْحِ: صَلْحُ الْحُدَيْبِيَّةِ، وَهَذَا قَوْلُ أَبِي سَعِيدٍ
الْخُدْرِيِّ رضی اللہ عنہ، وَالزُّهْرِيِّ، وَالشَّعْبِيِّ، وَعَامِرِ بْنِ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ،
وَإِخْتَارَهُ الطَّبْرِيُّ. وَيُؤَيِّدُهُ مَا رَوَاهُ الطَّبْرِيُّ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ: أَنَّ
رَسُولَ اللَّهِ صلی اللہ علیہ وسلم تَلَا هَذِهِ الْآيَةَ عَامَ الْحُدَيْبِيَّةِ، وَهُوَ الْمَلَأَمُ لِكُنْ هَذِهِ
السُّورَةَ بَعْضُهَا مَكِّيٌّ وَبَعْضُهَا مَدَنِيٌّ فَيَقْتَضِي أَنْ مَدِينَتَهَا قَرِيبٌ عَهْدٍ مِنْ
مُدَّةِ إِقَامَتِهِمْ بِمَكَّةَ، وَإِطْلَاقُ الْفَتْحِ عَلَى صَلْحِ الْحُدَيْبِيَّةِ وَإِرَادَةُ فِي قَوْلِهِ
تَعَالَى: ﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا﴾.

”ایک قول یہ ہے کہ فتح سے مراد صلح حدیبیہ ہے، اور یہ حضرت ابو سعید خدری،

زہری، شعبی اور عامر بن سعد بن ابی وقاص رحمہم اللہ کا قول ہے، اور امام ابن جریر طبری نے اسی کو اختیار کیا ہے، اور اس تفسیر کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جو امام طبری نے از ابو سعید خدری رحمہ اللہ روایت فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت حدیبیہ کے سال تلاوت فرمائی، اور یہ تفسیر اس بات سے بھی مناسبت رکھتی ہے کہ اس سورت کا کچھ حصہ مکہ ہے اور کچھ مدنی۔ پھر اس کا مدنی ہونا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ مسلمانوں کی مکہ مکرمہ میں مدت اقامت کے قریب کے دور میں نازل ہوئی، اور صلح حدیبیہ پر فتح کا اطلاق اس ارشاد الہی میں بھی وارد ہوا ہے: ﴿يَتَذَكَّرُ لَكُمْ يَوْمَ الْفَتْحِ عَطَا﴾ فرمادی ہے۔“

(التحریر والتنویر لابن عاشور ج ۲۷ ص ۳۷۴)

مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب نے بھی یہی تفسیر کی ہے، حتیٰ کہ انہوں نے جس ترجمہ قرآن پر حاشیہ لکھا ہے اُس کے مترجم (مولانا محمود الحسن صاحب) سے بھی اختلاف کر دیا ہے۔ غالباً مترجم نے شہرت کی پیروی میں آیت مبارکہ کے اس ٹکڑے کا ترجمہ یوں کیا ہے:

لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَلْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ.
”میرا نہیں تم میں جس نے کہ خرچ کیا فتح مکہ سے پہلے۔“

(الحديد: ۱۰)

اس پر علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب نے حاشیہ میں نمبر ۲ کے تحت لکھا ہے:

”اور بعض نے فتح سے مراد صلح حدیبیہ لی ہے اور بعض روایات سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔“

(تفسیر عثمانی ج ۳ ص ۶۲۷)

موجب اصل فتح صلح حدیبیہ کی فتح ہے تو پھر آیت میں جن لوگوں کی فضیلت کا ذکر ہے اُن سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے حدیبیہ کی صلح سے قبل اور فتح مکہ سے پہلے راہ الہی میں خرچ کیا اور جہاد کیا، لہذا اس

فضیلت میں فتح مکہ کے بعد مجبوراً مسلمان ہونے والے لوگوں کو شامل سمجھنا عدم تدبر کا نتیجہ اور حلوائی کی دکان پر نانا جی کی قاتحہ کے مترادف ہے۔

خیل رہے کہ فتح مکہ کے بعد جن اہل مکہ نے مجبوراً اسلام قبول کیا تھا انہیں طلاقاً کہا جاتا ہے، اور طلاقاً بعد والے غزوات میں جہاد تو کیا کرتے اُلٹا شکست کا سبب بنے تھے۔ چنانچہ غزوہ حنین میں سب سے پہلے پشت پھیر کر بھاگنے والے لوگ طلاقاً تھے، دوسرے لوگ بھی انہیں بھاگتا دیکھ کر میدان چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس کی مدلل و کھل تفصیل کے لیے راقم الحروف کی کتاب ”الصحابۃ والطلاق“ کا مطالعہ انتہائی مفید ثابت ہوگا۔

﴿وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَى﴾ کی حیران کن تفسیر

بعض علماء ہند لکھتے ہیں:

”اللہ ﷻ نے تمام صحابہ سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ (وآلہ) وسلم کو قرآن عظیم میں دو قسم کیا: مومنین قبل فتح مکہ و مومنین بعد فتح۔ اول کو دوام پر تفصیل دی اور صاف فرمادیا: ﴿وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَى﴾ سب سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ فرمایا اور ساتھ ہی اُن کے افعال کی تفتیش کرنے والوں کا منہ بند فرمادیا ﴿وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ (اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرنے والے ہو) ہاں یہ سب سے بھلائی کا وعدہ فرما چکا پھر دوسرا کون ہے کہ اُن میں سے کسی کی بات پر طعن کرے۔“

(فتاویٰ رضویہ ج ۲۹ ص ۳۳۶)

بعض علماء ہند سطور بالا سے قبل یہ بھی لکھ چکے ہیں:

”پھر اُن کے بعد کچھ لوگ آئیں گے جن کو اللہ تعالیٰ ناک کے بل جہنم میں اوندھا کر دے گا) یہ وہ ہیں جو اُن لغزشوں کے سبب صحابہ پر طعن کریں گے۔“

(فتاویٰ رضویہ ج ۲۹ ص ۳۳۶)

یہ سب کچھ وہ بے دھیانی میں لکھ گئے، انہیں معصوم نہیں کہ جن صاحب کا وہ دفاع کر رہے ہیں اُن پر

قطع جنتی ہستیاں بھی طعن فرما چکی ہیں، جیسا کہ ہم سیدنا علی، سیدنا عمار بن یاسر، ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ اور ام المومنین سیدہ ام سلمہ ؓ کے حوالے سے لکھ چکے ہیں۔ نیز تابعین اور مذاہب اربعہ کے فقہاء و متکلمین کی ایسی عبارات بھی نقل کی جا چکی ہیں جن میں فاضل بریلی کے مدوح کو امام ضلالت، فاسق، ظالم، جائز اور بدعتی وغیرہ تک کہا گیا ہے، حتیٰ کہ امام ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ کی بعض عبارات میں اُن کے قدریہ ہونے کا اشارہ بھی ملتا ہے، ان شاء اللہ امام ماتریدی کی عبارت ہم اپنی کتاب ”الفیۃ الباغیۃ“ میں درج کریں گے۔ بتائیے! یہ طعن ہے یا حقیقت؟ اگر یہ طعن ہے تو کیا ان سب طاعنین کو اللہ تعالیٰ ناک کے بل جہنم میں اوندھا کر دے گا؟

فی الجملہ یہ کہ فاضل بریلی کا درج ذیل جملہ:

”سب سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ فرمایا اور ساتھ ہی اُن کے افعال کی تفتیش کرنے والوں کا منہ بند فرمادیا ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ (اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرنے والے ہو) یا ایں ہمہ وہ تم سب سے بھلائی کا وعدہ فرما چکا پھر دوسرا کون ہے کہ اُن میں سے کسی کی بات پر طعن کرے۔“

(فتاویٰ رضویہ ج ۲۹ ص ۳۳۶)

کتاب و سنت دونوں کے خلاف ہے، اس لیے کہ سورۃ الحدید فتح مکہ سے قبل نازل ہوئی، اور اگر اس کا نزول فتح مکہ کے بعد ہی مان لیا جائے تو تب بھی آٹھ (۸) ہجری سے لے کر کم از کم ساٹھ (۶۰) ہجری تک سب صحابہ کہلانے والوں کو جنتی ماننا ہوگا، اور اُن سے گزشتہ نصف صدی میں جو کچھ ہوتا رہا سب معاف ماننا ہوگا۔ اس صورت میں حضرت عثمان ؓ کے قاتلین میں سے بعض سرغنون کو بھی جنتی ماننا ہوگا، کیونکہ وہ بھی فتح مکہ کے بعد اسلام لانے والوں میں سے تھے بلکہ بعض تو بیعت رضوان میں بھی شامل تھے، جیسا کہ عبد الرحمان بن عدیس۔ اسی طرح سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کا قاتل ابوالغادیہ جہنی بھی صحابی تھا، اُسے بھی جنتی ماننا ہوگا حالانکہ صحیح حدیث میں ہے:

قَاتِلُ عَمَّارٍ وَسَائِلُهُ فِي النَّارِ.

”عمار کا قاتل اور اُن کا سامان لوٹنے والا آگ میں ہے۔“

(المستدرک، کتاب معرفة الصحابة، ذکر شهادة عمار بن یاسر ؓ ج ۳ ص ۳۸۷؛ سلسلة الأحادیث الصحيحة للالبانی ج ۵ ص ۱۸، ۱۹؛ حدیث ۲۰۰۸؛ عمار بن یاسر ؓ رجل المعنة ومیزان الفتنة، لأسامة بن أحمد ص ۱۸۵، ۱۸۶)

نوٹ:

ابوالغادیہ کے دفاع میں بعض نامور محدثین سے سنگین غلطی ہوئی ہے، ان شاء اللہ ہم اُن کی غلطی پر اپنی کتاب ”الفئة الباغية“ میں کلام کریں گے۔

طلاق کو بھی مکمل مستقبل معاف؟

بعض متاخرین ہند خصوصاً جس صاحب کی خاطر یہ پاڑ بلیتے رہے وہ صاحب فتح مکہ کے بعد جب مجبوراً مسلمان ہوئے تو مسجد یا کسی حجرہ کے کونے میں بیٹھ کر محض عبادت و ریاضت ہی نہیں کرتے رہے بلکہ وہ بیس سال تک گورنر رہے اور پھر بیس سال تک مطلق العنان بادشاہ بھی رہے۔ اس عرصہ میں انہوں نے کیا کیا کیا؟ ذرا ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ مولانا علی ؒ کے مد مقابل آکر جنگ کی اور اُن کے ساتھ جنگ کو آقا کریم ﷺ نے اپنے ساتھ جنگ قرار دیا تھا۔

۲۔ ہزاروں لوگوں کے علاوہ سیدنا عمار بن یاسر ؓ کو بھی قتل کیا اور سیدنا عمار ؓ نے فرمایا تھا کہ انہیں کپڑوں سمیت دفن کیا جائے وہ قیامت کے دن معاویہ کے بارے میں بارگاہ الہی میں احتجاج کریں گے۔

۳۔ سیدنا حجر بن عدی ؓ اور اُن کے ہم نواؤں کو باندھ کر ناحق قتل کیا، انہوں نے بھی سیدنا عمار بن یاسر ؓ کی طرح وصیت فرمائی تھی کہ انہیں زنجیروں اور کپڑوں سمیت دفن کیا جائے، کیونکہ وہ قیامت کے دن معاویہ کے خلاف بارگاہ الہی میں احتجاج کریں گے۔

۴۔ سیدنا علی ؓ ہی کی خلافت کے دوران بسر بن ابی ارقطہ جو کہ طلقاء میں سے تھا، کی کمان میں مکہ

مکرمہ اور مدینہ منورہ پر حملہ کیا اور وہاں کے باشندوں کو قتل کیا اور خوف زدہ کیا، اور یقیناً ان بلدین مکرمین کے باشندوں کو حراساں کرنے کے دباں و عذاب سے اعلیٰ حضرتؒ بے خبر نہیں ہوں گے۔

۵۔ اسی بسر بن ابی ارطاة کے ذریعے یمن پر حملے کیے اور وہاں سیدنا ابن عباسؓ کے نابالغ بھتیجوں کو قتل کیا، جس سے بنو ہاشم اور خصوصاً سیدنا علیؓ کو اذیت پہنچی، اور حدیث شریف میں ہے: ”مَنْ آذَى عَلِيًّا فَقَدْ آذَانِي“ (جس نے علی کو اذیت پہنچائی تو اُس نے مجھے اذیت پہنچائی) [المستدرک ج ۳ ص

۱۲۱، مجمع الزوائد ج ۹ ص ۱۲۹]

۶۔ بسر بن ابی ارطاة کے انہی حملوں میں مسلم اور آزاد خواتین کو لونڈی بنا کر بازار میں برائے فروخت کھڑا کیا گیا۔

۷۔ سیدنا علی اور اہل بیت کرام علیہم السلام کے دوسرے حضرات پر منبروں پر سب و شتم کیا گیا۔

۸۔ امام حسن مجتبیٰؓ کے ساتھ جو شرائط طے کیں انہیں پورا نہ کیا۔

۹۔ کھلم کھلا عہد شکنی کی اور عہد شکن کے بارے میں آیات و احادیث سے کون واقف نہیں؟

۱۰۔ امام حسن مجتبیٰؓ کی شہادتِ قاجہ کو مصیبت نہ سمجھا اور جس نے اُس شہادتِ عظیمہ کو مصیبت سمجھ کر اُس پر ”إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ وَاجِعُونَ“ پڑھا اُس پر اُلٹا تعجب کیا۔

۱۱۔ امام حسن مجتبیٰؓ کو اُن کے سامنے ”جَمْرَةٌ“ (انگارہ) کہا گیا لیکن وہ اُس سے مس نہ ہوئے بلکہ اُلٹا اُس بکواس کرنے والے کو پیسے دیے۔

۱۲۔ اُن کے روبرو بد بخت ابن یامین نے کعب بن اشرف کے قتل کے معاملہ میں نبی کریم ﷺ کی طرف غداری کی نسبت کی تو وہ خاموش رہے۔

۱۳۔ سودی معاملہ کیا، اور اس سلسلے میں جب انہیں حدیث پیش کی گئی تو کہنے لگے: ”مَا أَدْبَى بِحِفْلٍ هَذَا بَأْسًا“ (میں تو اس جیسے معاملہ میں کوئی حرج نہیں سمجھتا)۔

۱۴۔ انصارؓ پر دوسرے لوگوں کو ترجیح دی، اس پر انصارؓ نے فرمایا: ہمیں رسول اللہ ﷺ نے اس قسم کے ترجیحی سلوک کی پیش گوئی فرمائی تھی اور فرمایا تھا: تم صبر کرنا۔ اس پر موصوف نے طنزاً کہا: پھر تم کرو نہ

مصر۔

۱۵۔ رشوت اور دھونس دھمکیوں کے ذریعے یزید پلید کو امت پر مسلط کر کے قیامت تک کے لیے امت کو انتشار و افتراق سے دوچار کر دیا۔

ان تمام باتوں کی تفصیل مع حوالہ جات ہماری کتاب ”الاحادیث الموضوعۃ فی فضائل معاویہ“ میں ملاحظہ فرمائی جائے۔

یقیناً بادشاہوں سے اُن کے دور میں اچھے کام بھی ہوتے ہیں لیکن کیا کسی بادشاہ سے مذکورہ بالا تمام مظالم اور اعمالِ سیدہ سرزد ہوئے ہوں تو اُس سے فقط اس لیے باز پرس نہیں ہوگی کہ وہ صحابی تھا؟ اگر کسی مقتدر صحابی کا دوسرے صحابہ اور تابعین پر ہر طرح کا ظلم معاف اور جنت اُس کے لیے واجب تو کیا پھر شریعت کا قانون فقط غیر صحابہ کے لیے ہے؟ بے ادبی معاف! ایسا اندھا نظام ہندو پاک کا تو ہو سکتا ہے مگر شریعتِ مصطفیٰ ﷺ میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔

کتاب و سنت کے منافی تفسیر

یاد رکھئے گا! کسی بھی غزوہ میں خرچ کرنے، جہاد کرنے، مقتول ہونے یا غازیانہ شان سے گھر لوٹ آنے والوں کو مطلقاً منفقور نہیں فرمایا گیا، ماسوا غزوہ بدر کے غازیوں کے۔ بعض علماء نے تو بعض بدری صحابہ پر بھی نفاق کی تہمت لگا دی ہے، جیسا کہ معتب بن قیس انصاری، لہذا جو لوگ ﴿وَمَثَلًا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنٰی﴾ سے استدلال کرتے ہوئے قبل از فتح اور بعد از فتح کے تمام صحابہ کو جنتی قرار دیتے ہیں وہ کتاب و سنت پر جرات کرتے ہیں۔ یہاں ہم چند احادیث کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن میں غور فرما کر آپ خود ہی یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ واقعی یہ جسارت ہے۔ امام بخاری حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

”ایک شخص نبی کریم ﷺ کے سامان پر معین تھا، اُسے کر کرہ کہا جاتا تھا، اُس کا

انتقال ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ آگ میں ہے۔ لوگوں نے جا کر اُس کو

غور سے دیکھا تو انہیں ایک چادر ملی جو اُس نے چرائی تھی۔“

(بخاری: کتاب الجہاد والسیر، باب الغلول، ص ۱۵۴ حدیث ۳۰۷۴)

خیال رہے کہ اس حدیث میں اُس شخص کے کافر ہونے کا ذکر نہیں ہے۔ چنانچہ اس سے پہلی حدیث میں ہے کہ آقائے کائنات ﷺ نے تمام صحابہ کرام کو فرمایا:

”مجھے تمہارا اس حال میں ملنا پسند نہیں کہ تم میں سے کسی کی گردن پر بکری میمانی ہوئی سوار ہو یا گھوڑا گردن پر سوار ہو اور وہ مجھ سے عرض کرے:

يَا رَسُولَ اللَّهِ اغْنِنِي، فَأَقُولُ لَا أُمْلِكُ لَكَ شَيْئًا لَقَدْ أَبْلَغْتُكَ.

”یا رسول اللہ! میری مدد فرمائیے: تو میں کہوں گا: میں تیرے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا، میں تجھے تبلیغ کر چکا ہوں۔“

(بخاری: کتاب الجہاد والسير، باب الغلول، ص ۱۵۴ حدیث ۳۰۷۳)

ایک اور حدیث میں ہے:

”غزوہ خیبر کے بعد جب وادی قرئی میں پہنچے تو ایک صحابی جس کو مدغم کہا جاتا تھا، اُسے کہیں سے ایک تیر آگیا تو لوگوں نے کہنا شروع کر دیا: ”هَيْبْنَا لِهَ الشَّهَادَةِ“ (اُس کو شہادت مبارک ہو) اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، بلکہ جو چادر اُس نے خیبر کے روز مال غنیمت سے تقسیم کے بغیر لے لی تھی وہ اس پر آگ بن کر بھڑکے گی۔“

(بخاری، کتاب المغازی، باب غزوہ خیبر، حدیث ۴۲۳۴)

اس حدیث میں صاف ظاہر ہے کہ وہ شخص مسلمان اور صحابی تھا، اگر وہ مسلمان نہ ہوتا تو صحابہ کرام ﷺ اُس کے حق میں ”هَيْبْنَا لِهَ الشَّهَادَةِ“ کے الفاظ استعمال نہ فرماتے اور اگر وہ مسلمان نہ ہوتا تو نبی کریم ﷺ بھی اس بات کی وضاحت فرما دیتے، جیسا کہ ایک اور حدیث میں وضاحت فرمادی تھی۔ چنانچہ بخاری شریف میں ہے:

”کسی جنگ میں ایک شخص نے انتہائی بہادری سے جہاد کیا تو صحابہ کرام ﷺ نے اُس کی تعریف کی۔ آقائے فرمایا: جہنم کی طرف بڑھ رہا ہے۔ بالآخر زخموں کی تاب نہ

لا کراُس نے خود کشی کر لی۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لوگوں میں اعلان کر دو:
إِنَّهُ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ إِلَّا نَفْسٌ مُّسْلِمَةٌ.
”مسلم شخص کے علاوہ کوئی انسان جنت میں داخل نہیں ہوگا۔“

(بخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب: إن الله ليؤيد الدين بالرجل الفاجر، حدیث ۳۰۶۲)
سو جب قبل از فتح والوں کے لیے کلیہ مغفور ہونے کا قول احادیث کے منافی ہے تو پھر بعد از فتح والوں کے لیے کیونکر درست ہو سکتا ہے، جب ایک چادر کی چوری صحابی کو جہنم میں لے گئی تو پھر قبل ناحق اور مسلسل بیس برس تک شاہانہ اونچ نیچ کا کوئی حساب نہیں ہوگا؟ اصحاب بدرؓ کے علاوہ اگر دوسرے صحابہ بھی یکسر حساب و کتاب سے مستثنیٰ ہوتے تو پھر امہات المؤمنین کو ﴿يُضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ﴾ اور ﴿نُؤَيِّهَا أَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ﴾ [الأحزاب: ۳۰، ۳۱] آیات کیوں سنائی جاتیں؟

تفسیر رضوی سے اکابر صحابہ و تابعینؓ کی بے خبری

معاویہ بن صخر کی بیجا حمایت میں بعض متاخرین ہند نے سورۃ المدید کی آیت نمبر دس کی جویوں تفسیر کی ہے:

”سب سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ فرمایا اور ساتھ ہی اُن کے افعال کی تفتیش کرنے والوں کا منہ بند فرمادیا“ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ (اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرنے والے ہو) با ایں ہمہ وہ تم سب سے بھلائی کا وعدہ فرما چکا پھر دوسرا کون ہے کہ اُن میں سے کسی کی بات پر طعن کرے۔“

(فتاویٰ رضویہ ج ۲۹ ص ۳۳۶)

اس تفسیر کو پڑھنے کے بعد یوں معلوم ہوتا ہے کہ اکابر صحابہ و تابعینؓ کی فہم قرآن سے محروم تھے، حتیٰ کہ ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بلکہ مولا علیؓ کی فہم کی رسائی بھی وہاں تک نہ ہو سکی جہاں تک ہمارے اعلیٰ حضرت کی فہم پہنچی، بلکہ معاذ اللہ یہ معاملہ نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس تک بھی پہنچتا ہے۔ وہ کیسے؟ اس کی تفصیل ہم سطور ذیل میں پیش کر رہے ہیں۔ پہلے ہم یہ بیان کریں گے کہ اس تفسیر سے

بعض تابعین کی (معاذ اللہ) کم فہمی کیسے ثابت ہوتی ہے، پھر بعض صحابہ کی، پھر اُم المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ اور امیر المؤمنین مولیٰ علیؑ تک اس کا اثر پہنچتا ہوا دکھائیں گے اور آخر میں خاتم بدہن یہ واضح کریں گے کہ اگر اس تفسیر کو درست مانا جائے تو معاذ اللہ آقا ﷺ کے بارے میں بھی یہ تاثر پیدا ہوگا کہ آپ بھی قرآن مجید کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

امام حسن بصریؒ کی بے خبری

سب سے پہلے اُس ہستی کا اس تفسیر بے خبر ہونا ملاحظہ فرمائیں جو تصوف کے تمام سلاسل طریقت میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے، یعنی امام حسن بصریؒ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ سیدنا حجر بن عدیؒ کے قاتل کے لیے ہلاکت ہوگی۔ چنانچہ امام ابن عبدالبر اور دوسرے حضرات مبارک بن فضالہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

سَمِعْتُ الْحَسَنَ يَقُولُ: وَقَدْ ذَكَرَ مُعَاوِيَةَ وَقَتْلَهُ حُجْرًا وَأَصْحَابَهُ:

وَيَلَّ لِمَنْ قَتَلَ حُجْرًا وَأَصْحَابَ حُجْرٍ.

”میں نے حسن بصریؒ کو سنا، جبکہ انہوں نے معاویہ کے تذکرہ میں اُس کا حجر بن عدی اور اُن کے ساتھیوں کو قتل کرنا بیان کیا تو فرمایا: حجر بن عدی اور اُن کے اصحابؒ کے قاتل کے لیے ہلاکت ہے۔“

(الاستيعاب في معرفة الأصحاب ج ۱ ص ۱۹۹، بغية الطلب ج ۵ ص ۲۱۱؛ أنساب الأشراف للبلاذري ج ۵ ص ۲۷۳)

ظاہر ہے کہ سیدنا حجر بن عدی اور اُن کے رفقاءؒ کا قاتل معاویہ بن صخر تھا، سوا اگر حضرت امام حسن بصریؒ کو سورۃ الحدید کی آیت نمبر دس کی ایسی تفسیر معلوم ہوتی تو وہ سیدنا حجر بن عدیؒ کے قاتل کے لیے ہلاکت کا قول نہ کرتے۔ کیونکہ وہ قاتل تو صحابی تھا اور صحابہ تو قبل از فتح والے ہوں یا بعد از فتح والے سب کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا وعدہ فرما چکا ہے، پھر دوسرا کون ہے کہ اُن میں سے کسی کی بات پر طعن کرے؟ لیکن امام حسن بصریؒ معاذ اللہ اس تفسیر بے نظیر سے اس حد تک بے خبر تھے کہ وہ نہ صرف یہ کہ

قتل حجر بن عدیؓ پر طعن اور ہلاکت معاویہ کا ذکر کرتے بلکہ وہ اُن کی دوسری زیادتیوں کو بھی شامل کر لیتے تھے۔ چنانچہ متعدد علماء کرام لکھتے ہیں کہ وہ فرمایا کرتے تھے:

أَرْبَعُ خِصَالٍ كُنْ فِي مُعَاوِيَةَ ، لَوْلَمْ يَكُنْ فِيهِ مِنْهُمْ إِلَّا وَاحِدَةٌ
لَكَانَتْ مُوَبَّقَةً: ائْتِزَاءُ عَلَى هَذِهِ الْأُمَّةِ بِالسُّفَهَاءِ حَتَّى ابْتَزَّهَا أَمْرُهَا بِغَيْرِ
مَشُورَةٍ مِنْهُمْ وَفِيهِمْ بَقَايَا الصَّحَابَةِ وَذُرُ الْفَضِيلَةِ ، وَاسْتِخْلَافُهُ ابْنَهُ بَعْدَهُ
سَكِينًا خَمِيرًا ، يَلْبَسُ الْحَرِيرَ وَيَضْرِبُ بِالطَّنَابِيرِ ، وَإِدْعَاءُهُ زِيَادًا ،
وَقَدْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: الْوَلَدُ لِلْفَرَّاشِ ، وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ ، وَقَتْلُهُ حُجْرًا ،
وَيُلَا لُهُ مِنْ حُجْرٍ مَرَّتَيْنِ .

”چار باتیں معاویہ میں تھیں، اگر اُن میں سے فقط کوئی ایک بات بھی اُن میں
ہوتی تو وہ اُن کی ہلاکت کے لیے کافی ہوتی:

۱۔ اُن کا اُمت پر بلا مشورہ بے وقوف لوگوں کو چڑھا دینا، یہاں تک کہ انہوں نے
اُمت کا حق زبردستی چھین لیا، جبکہ اُمت میں بقایا صحابہؓ اور ارباب فضیلت بھی
موجود تھے۔

۲۔ اُن کا اپنے بعد اپنے نشئی اور شرابی بیٹے کو خلیفہ بنانا، وہ ریشم پہنتا تھا اور مزامیر
بجاتا تھا۔

۳۔ اُن کا زیاد بن ابیہ کو ابوسفیان کا بیٹا بنا دینا، جبکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:
بچہ شوہر کا ہوتا ہے اور زانی کے لیے پتھر ہوتے ہیں۔

۴۔ اور اُن کا سیدنا حجر بن عدیؓ کو قتل کرنا، حجر بن عدیؓ کی وجہ سے اُن کے
لیے دوہری ہلاکت ہے۔“

(تاریخ الرسل والملوک والأمم ج ۵ ص ۲۷۹؛ مرآة الزمان ج ۷ ص ۲۳۸؛ الکامل فی التاريخ

ج ۳ ص ۸۲؛ البدایة والنهاية ج ۱۱ ص ۴۲۸)

کاش! امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کو ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ کی مذکورہ بالا تفسیر رضوی معلوم ہوتی تو وہ ایک صحابی کے لیے ہلاکت کا قول نہ کرتے اور اُن پر طعن سے محفوظ رہتے۔

سیدنا حجر بن عدی رحمۃ اللہ علیہ کی بے خبری

خود سیدنا حجر بن عدی رحمۃ اللہ علیہ بھی امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی طرح مذکورہ تفسیر سے بے خبر تھے، چونکہ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ قیامت کے دن معاویہ بن ابی سفیان سے بدلہ لیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی شہادت سے قبل بایں الفاظ وصیت فرمائی تھی:

لَا تُطْلِقُوا عَنِّي حَدِيدًا، وَلَا تَغْتَسِلُوا عَنِّي دَمًا، فَإِنِّي مُلَاقٍ مُّعَاوِيَةَ
يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَى الْعَجَاذَةِ، وَإِنِّي مُعَاصِمٌ.

”بعد از وفات میرے جسم سے بیڑیاں نہ کھولنا، میرا خون نہ دھونا، کیونکہ میں میدان محشر میں اسی حال میں معاویہ سے ملوں گا اور احتجاج کروں گا۔“

(کتاب المحن للتمیمی ص ۱۲۳، ۱۲۴؛ أنساب الأشراف للبلاذری ج ۵ ص ۲۶۹؛ الاستیعاب ج ۱ ص ۱۹۸؛ أسد الغابة ج ۱ ص ۶۹۸؛ المنتظم لابن الجوزی ج ۵ ص ۲۴۲؛ تاریخ دمشق ج ۱۲ ص ۲۱۵، ۲۲۲، ۲۲۸؛ مرآة الزمان ج ۷ ص ۲۳۳، ۲۳۶؛ تاریخ الاسلام للذہبی ج ۴ ص ۱۹۴؛ سیر أعلام النبلاء ج ۳ ص ۴۶۶؛ تاریخ ابن خلدون ج ۳ ص ۱۷؛ الإصابة ج ۲ ص ۳۲؛ بغية الطلب في تاريخ حلب ج ۵ ص ۲۱۱؛ المبسوط للسرخسی ج ۲ ص ۵۰، ج ۱۰ ص ۱۳۱؛ المحيط البرهاني لابن مازہ ج ۲ ص ۱۶۱)

اگر انہیں فتاویٰ رضویہ میں کی گئی مذکورہ بالا تفسیر معلوم ہوتی کہ قبل از فتح مکہ اور بعد از فتح مکہ کے تمام کے تمام صحابہ کے ساتھ بھلائی کا وعدہ ہو چکا ہے تو وہ ایسی وصیت نہ فرماتے۔

سیدنا عمار بن یاسر رحمۃ اللہ علیہ کی بے خبری

اسی طرح سابقون اولون صحابہ کرام رحمۃ اللہ علیہم میں سے ایک عظیم صحابی سیدنا عمار بن یاسر رحمۃ اللہ علیہ بھی اس تفسیر

سے بے خبر تھے، کیونکہ انہوں نے بھی اپنی شہادت سے قبل اسی طرح وصیت فرمائی تھی۔ چنانچہ امام سرخی حنفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وَلَمَّا اسْتُشْهِدَ عَمَّارُ بْنُ يَاسِرٍ بِصَفِيْنٍ قَالَ: لَا تَغْسِلُوا عَنِي دَمًا وَلَا
تَنْزِعُوا عَنِي ثَوْبًا، فَإِنِّي أَلْتَقِي مُعَاوِيَةَ بِالْبَجَادَةِ، وَهَكَذَا نُقِلَ عَنْ حُجْبَرِ
بْنِ عَدِيٍّ.

”جب سیدنا عمار بن یاسرؓ جنگ صفین میں شہید ہونے لگے تو فرمایا: میرا خون نہ دھونا اور میرے کپڑے نہ اتارنا، میں اسی حال میں معاویہ سے میدان محشر میں ملوں گا، اور ایسا سیدنا حجر بن عدیؓ سے بھی منقول ہے۔“

(المبسوط للسرخسي ج ۲ ص ۵۰، الطبقات الكبرى لابن سعد ج ۳ ص ۲۴۲، ۲۴۳؛ تاریخ

دمشق لابن عساكر ج ۴ ص ۷۷، ۷۸؛ مختصر تاریخ دمشق ج ۱۸ ص ۲۳۲)

کاش! انہیں معلوم ہوتا کہ قیامت کے دن کوئی شنوائی نہیں ہوگی، کیونکہ وہ جس کے خلاف قیامت کے دن احتجاج کا منصوبہ بنا رہے تھے اُس کے لیے تو پہلے ہی طے ہو چکا تھا کہ وہ فتح مکہ کے بعد جو کچھ بھی کرتا رہے گا اُس کے لیے ”حُسْنی“ (جنت) ہے تو وہ ایسی بیکار وصیت نہ کرتے۔ یہاں بطور خاص یہ بات قابل توجہ ہے کہ سیدنا عمار بن یاسرؓ کے بارے میں آیا ہے کہ شہادت سے قبل اُن کی مبارک عقل کامل طور پر کام کر رہی تھی۔ چنانچہ امام ابن سعد اور دوسرے علماء کرام حبیب بن ابی ثابت سے سند کے ساتھ نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا:

قُتِلَ عَمَّارٌ يَوْمَ قُتِلَ وَهُوَ مُجْتَمِعُ الْعَقْلِ.

”جس دن عمار بن یاسر شہید کیے گئے تو اُن کی عقل مکمل طور پر کام کر رہی تھی۔“

(الطبقات الكبرى لابن سعد ج ۳ ص ۲۴۳؛ تاریخ دمشق ج ۴ ص ۷۷؛ مختصر تاریخ

دمشق ج ۱۸ ص ۲۳۲)

کیوں نہ اُن کی عقل مکمل کام کر رہی ہوتی جبکہ اُن کے حق میں زبان نبوی ﷺ سے ضمانت مل چکی

تھی کہ اللہ ﷻ انہیں شیطان سے محفوظ رکھے گا، لیکن افسوس کہ اُن کے سامنے ہمارے اعلیٰ حضرت کی کتب تھیں اور نہ ہی وہ مسلکِ اعلیٰ حضرت سے آگاہ تھے، اگر وہ مسلکِ رضا سے آگاہ ہوتے تو یقیناً سورۃ الحدید کی آیت نمبر ۱۰ کی مذکور الصدر تفسیر سے ضرور باخبر ہوتے اور لامحالہ مذکورہ بالا غلط وصیت سے باز رہتے۔

امام عالی مقام علیؑ کی بے خبری

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ سیدنا حجر بن عدی ؓ نے اپنی شہادت سے قبل وصیت فرمائی تھی کہ انہیں زنجیروں کے ساتھ دفن کیا جائے تو لوگوں نے اُن کی وصیت پر عمل کیا۔ ابن کثیر لکھتے ہیں:

وَرَوِيَ أَنَّ الْحَسَنَ بْنَ عَلِيٍّ قَالَ: أَصَلُّوا عَلَيْهِ وَدَفِنُوا فِي قُبُورِهِ؟ قَالُوا نَعَمْ. قَالَ حَبَّهُمُ وَاللَّهِ.

”روایت کیا گیا ہے کہ سیدنا امام حسن بن علی (بقول ابن کثیر: امام حسین) ؓ نے پوچھا: کیا لوگوں نے اُس کی نماز جنازہ پڑھی اور انہوں نے اُن کو بیڑیوں کے ساتھ دفن کیا؟ انہوں نے عرض کیا: ہاں، فرمایا: خدا کی قسم! وہ حجت قائم کر گیا۔“

(البدایۃ والنہایۃ ج ۱۱ ص ۲۳۶؛ تاریخ دمشق ج ۱۲ ص ۲۲۶)

کس پر حجت قائم کر گیا؟ ظاہر ہے کہ اپنے قاتل پر، اور اُن کا قاتل معاویہ بن صحر تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام عالی مقام سیدنا حسین ؓ سورۃ الحدید کی آیت نمبر ۱ کی مذکورہ تفسیر سے بے خبر تھے، اگر انہیں یہ رضوی تفسیر معلوم ہوتی کہ فتح مکہ سے بعد والوں کے لیے جنت کا وعدہ ہو چکا ہے، خواہ وہ جو بھی کرتے رہیں تو وہ حجت قائم کرنے کی بات نہ فرماتے۔

اُم المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی بے خبری

متعدد محدثین و علماء کرام لکھتے ہیں:

عَنْ أَبِي الْأَسْوَدِ قَالَ: دَخَلَ مُعَاوِيَةُ عَلَى عَائِشَةَ فَقَالَتْ: مَا حَمَلَكَ

عَلَى قَتْلِ أَهْلِ عَذْرَاءِ حُجْرٍ وَأَصْحَابِهِ؟ فَقَالَ: يَا أُمُّ الْمُؤْمِنِينَ! إِنِّي رَأَيْتُ
قَتْلَهُمْ إِصْلَاحًا لِلْأُمَّةِ، وَأَنَّ بَقَاءَهُمْ فُسَادٌ، فَقَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ
ﷺ يَقُولُ: سَيُقْتَلُ بِعَذْرَاءِ نَاسٍ يَغْضِبُ اللَّهُ لَهُمْ وَأَهْلُ السَّمَاءِ.

”حضرت ابوالاسود بیان کرتے ہیں کہ معاویہ ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ
عنہا کے ہاں حاضر ہوا تو انہوں نے فرمایا: تمہیں کس بات نے اہل عذراء حجر اور ان
کے ساتھیوں کے قتل پر ابھارا؟ اُس نے عرض کیا: یا ام المومنین! میں نے اُن کے قتل
میں امت کی اصلاح اور اُن کی بقاء میں امت کا فساد سمجھا تھا۔ ام المومنین نے فرمایا: میں
نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا تھا: عنقریب عذراء کے مقام پر کچھ لوگ قتل
کیے جائیں گے، اُن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اور اہل آسمان غضب ناک ہوں گے۔“

(المعرفة والتاريخ للفوسوي ج ۳ ص ۱۷؛ دلائل النبوة للبيهقي ج ۶ ص ۵۷؛ تاریخ دمشق ج
۱۲ ص ۲۲۷؛ البدایة والنہایة ج ۹ ص ۲۲۶؛ الخصائص الکبری ج ۲ ص ۲۴۰؛ وط: بتحقیق
خلیل ہراس، ج ۲ ص ۵۰۰؛ سبل الہدی ج ۱۰ ص ۱۵۶؛ کنز العمال ج ۱۱ ص ۱۲۶ حدیث
۳۰۸۸۷ ص ۱۹۴ حدیث ۳۱۱۹۲ وج ۱۳ ص ۵۸۸ حدیث ۳۷۵۱۰)

یقیناً ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی مذکورہ تفسیر سے بے خبر تھیں، اگر وہ باخبر ہوتیں تو
ایسی حدیث بیان نہ فرماتیں، کیونکہ جب قرآن میں آگیا کہ فتح مکہ کے بعد اتفاق اور جہاد کرنے والوں
کے لیے بھی ”الحسنی“ (جنت) کا وعدہ ہو چکا ہے تو پھر کیونکر تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہ قرآن حکیم سے
متضاد حدیث سنا کر اللہ ﷻ اور اہل آسمان کے غضب کا ذکر فرماتیں؟ ہائے افسوس! وہ قرآن کی صحیح تفسیر اور
مسکب اعلیٰ حضرت سے بے خبر تھیں۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بے خبری

ام المومنین رضی اللہ عنہا کی طرح یہ حدیث صدر المفسرین سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔ چنانچہ
امام فسوی اور دوسرے محدثین کرام عبد اللہ بن رزین غافقی سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا:

سَمِعْتُ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ يَقُولُ: يَا أَهْلَ الْعِرَاقِ سَيَقْتُلُ مِنْكُمْ
سَبْعَةَ نَفَرٍ بَعْدَ رَاءِ، مِثْلَهُمْ كَمِثْلِ أَصْحَابِ الْأَخْذُودِ، فَقَتِلَ حُجْرُ بْنُ
عَدِيٍّ وَأَصْحَابُهُ.

میں نے سیدنا علی بن ابی طالب ؑ کو بیان کرتے ہوئے سنا: اے اہل عراق! عنقریب تم میں سے سات افراد کو عذراء کے مقام پر قتل کیا جائے گا، اُن کی مثال ایسی ہے جیسی ”اصحاب الاخذود“ کی، پس سیدنا حجر بن عدی اور اُن کے ساتھی ؑ قتل کیے گئے۔

(المعرفة التاريخ للفسوي ج ۳ ص ۴۱۶؛ تاریخ دمشق ج ۱۲ ص ۲۲۷)

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

قُلْتُ: عَلِيٌّ ؑ لَا يَقُولُ مِثْلَ هَذَا إِلَّا بِأَنْ يَكُونَ سَمِعَهُ مِنْ رَسُولِ
اللَّهِ ﷺ، وَقَدْ رُوِيَ عَنْ عَائِشَةَ بِإِسْنَادٍ مُرْسَلٍ مَرْفُوعًا.

”میں کہتا ہوں: سیدنا علی ؑ ایسی بات نہیں کہہ سکتے ماسوا اس کے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہو، اور بیشک ایسا سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی مرسل سند کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا گیا ہے۔“

(دلائل النبوة للبيهقي ج ۶ ص ۴۵۶)

حافظ ابن کثیر، امام سیوطی اور علامہ علی مقفی ہندی نے امام بیہقی کے قول کو مقرر رکھا ہے:

البدایة والنهاية ج ۹ ص ۲۲۵؛ الخصائص الكبرى ج ۲ ص ۲۴۱؛ وص: بتحقيق خليل هراس، ج ۲ ص ۵۰۱؛ كنز العمال ج ۱۲ ص ۴۰۵؛ حديث (۳۵۴۳۷)

ہر چند کہ سیدنا علی ؑ باب مدیۃ العلم تھے، صدر المفسرین تھے، سَلُونِي قَبْلَ أَنْ تَفْقِدُونِي (اس سے قبل کہ مجھے نہ پاؤ مجھ سے سوال کر لو) کا دعویٰ کرنے والے تھے اور قرآن مجید کے علم ظاہر و باطن کے عالم تھے مگر اس سب کچھ کے باوجود سورۃ الحدید کی آیت نمبر دس کی رضوی تفسیر سے بے خبر تھے۔ اگر باخبر ہوتے تو

سیدنا حجر بن عدیؓ اور اُن کے ہمواؤں کو کھٹی میں شہید کیے جانے والوں کی مانند اور اُن کے قاتل کو اُس دور کے ظالم و کافر بادشاہ کی مانند نہ فرماتے۔ اہل علم سے اپیل ہے کہ وہ اصحاب الاخذود کے واقعہ کو اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ قرآن کے حاشیہ پر چھپی ہوئی تفسیر ”عزائن العرفان“ میں ضرور پڑھ لیں، تاکہ انہیں معلوم ہو کہ سیدنا علیؓ نے مسلک اعلیٰ حضرت سے بے خبر ہونے کی وجہ سے سیدنا حجر بن عدیؓ اور اُن کے رفقاءؓ کے قاتل کو حدیث کی رو سے کیا سمجھ رکھا تھا۔

نبی کریم ﷺ کی (معاذ اللہ) بے خبری

قارئین کرام آپ پڑھ چکے ہیں کہ محدثین کرام نے مقام عذراء میں شہید کیے جانے والوں کے متعلق جو حدیث نقل فرمائی ہے اُسے حکما مرفوع مانا ہے اور ام المومنین اور مولیٰ علی علیہما السلام کی روایت کردہ حدیثوں کو ایک دوسری کی مؤید فرمایا ہے، اس لحاظ سے یہ ارشاد نبوی ﷺ ہوا۔ نیز اس سے قبل بخاری شریف کے حوالہ سے تین احادیث ذکر ہو چکی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے بعض غزوات میں مقتول ہونے والے بعض صحابہ کے بارے میں فرمایا کہ وہ آگ میں ہیں اور وہ بھی معمولی سی چوری کے سبب، لہذا اس صورت میں تو نبی کریم ﷺ بھی معاذ اللہ سورۃ الحدید کی آیت نمبر دس کی تفسیر سے بے خبر قرار پاتے ہیں۔ اندازہ لگائیے! بعض طلقاء کی بے جا حمایت کا نتیجہ کس قدر بھیانک ہے؟

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ کی صحیح تفسیر

بعض علماء ہند نے اس جملہ کی جو تفسیر کی ہے وہ غلط ہی نہیں بلکہ سراسر باطل ہے، کیونکہ قرآن و سنت کے خلاف ہے۔ آئیے! دیکھتے ہیں کہ اس جملہ کی صحیح تفسیر کیا ہے؟ بعض علماء ہند نے تو یہ سمجھا ہے کہ اس جملہ میں فقط یہ بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ ہر اُس عمل سے باخبر ہے جو تم کرو گے مگر وہ تم سب سے بھلائی کا وعدہ فرما چکا ہے، یعنی اُن کے نزدیک اس جملہ میں فقط وعدہ کا ذکر ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں بعد میں ایمان لانے والوں کو تسلی دی گئی ہے کہ وہ جو کچھ بھی راہِ الہی میں خرچ کریں اور جہاد کریں اُن کو بھی اجر دیا جائے گا، اگرچہ سابقین کے برابر نہیں ہوگا تاہم بھلائی کا وعدہ سب کے ساتھ ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ

اس آیت میں پہلے یا بعد میں ایمان لانے کا ذکر نہیں ہوا بلکہ فقط پہلے یا بعد میں خرچ کرنے اور جہاد کرنے کا ذکر ہو رہا ہے، لہذا اگر کوئی شخص قدیم الاسلام تو ہو مگر قدیم الانفاق نہ ہو تو اُس کا شمار بعد میں خرچ کرنے اور جہاد کرنے والوں میں ہوگا۔ یہاں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آیت میں ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ فرمانے میں نیت و اخلاص کی طرف بھی باریک اشارہ ہے، یعنی دیکھا جائے گا کہ کسی قدیم الاسلام شخص نے پہلے خرچ نہیں کیا تھا اور اب خرچ کرنے لگا ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟ فی الجملہ یہ کہ بتا دیا گیا ہے کہ پہلے یا بعد میں جس کسی نے بھی صدق و اخلاص کے ساتھ انفاق اور جہاد کیا اُس کا اجر ضائع نہیں ہوگا، ہر ایک کے ساتھ زمانی عسر و یسر اور اُس کے اخلاص کے مطابق بھلائی کا وعدہ ہے۔ اب یہاں اس وضاحت کی ضرورت تو نہیں ہے کہ پہلے یا بعد جو کوئی بھی خلوص سے عاری ہو کر انفاق اور جہاد کرے تو اُس کے لیے کسی قسم کے اجر اور بھلائی کا وعدہ نہیں ہوتا۔ سو آیت کے اس جملہ میں لفظ ﴿خَبِيرٌ﴾ سے تین چیزوں کو مد نظر رکھے جانے کا ذکر ہے:

- ۱۔ اخلاص و نیت
 - ۲۔ حال و مستقبل میں اچھے اعمال پر بھلائی کا وعدہ
 - ۳۔ اور حال و مستقبل میں برے اعمال پر وعید۔
- اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جو اس آیت کو مستقبل کے ساتھ مقید اور فقط وعدہ کے ساتھ خاص کر دیا ہے، خواہ مستقبل میں کوئی صحابی جس قدر بھی برے عمل کرتا رہے اُس کے ساتھ بھلائی کا وعدہ ہو گیا، یہ قرآن مجید کی دوسری آیات اور سینکڑوں احادیث نبویہ کے خلاف ہے۔ حق بات یہ ہے کہ آیت میں فقط وعدہ کا نہیں بلکہ وعدہ اور وعید دونوں کا ذکر ہے۔ چنانچہ علامہ ابن عطیہ اور علامہ ابو حیان اندلسی لکھتے ہیں:

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ قَوْلٌ فِيهِ وَعْدٌ وَوَعِيدٌ.

”اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو اُس سے بخوبی خبردار ہے“ اس قول میں وعدہ اور

وعید دونوں ہیں۔“

(المحرر الوجيز في تفسير الكتاب العزيز ج ۸ ص ۲۲۴؛ البحر المحيط ج ۸ ص ۲۱۹)

علامہ محمود آلوسی حنفی لکھتے ہیں:

عَالِمٌ بِظَاهِرِهِ وَبَاطِنِهِ وَيُجَازِيكُمْ عَلَى حَسْبِهِ ، فَالْكَلَامُ فِيهِ وَعْدٌ وَوَعْدٌ .
 ”وہ بندے کے ظاہر و باطن کو جاننے والا ہے اور وہ اسی کے مطابق تمہیں جزا دے گا،
 پس اس کلام میں وعدہ اور وعید دونوں مذکور ہیں۔“

(روح المعانی ج ۲۶ ص ۴۱۱)

علامہ عبد الحمید کشک لکھتے ہیں:

أَيُّ عَالِمٍ بِأَعْمَالِكُمْ ، مُطَّلِعٌ عَلَى خَفَايَاكُمْ وَنَوَايَاكُمْ ، وَمُجَازِيكُمْ
 عَلَيْهِ ، وَفِي الْآيَةِ وَعْدٌ وَوَعْدٌ .
 ”وہ تمہارے اعمال سے آگاہ، تمہارے خفی امور اور تمہاری نیتوں پر مطلع اور اسی
 کے مطابق تمہیں جزا دینے والا ہے، اور اس آیت میں وعدہ اور وعید دونوں ہیں۔“

(فی رحاب التفسیر ج ۲۷ ص ۶۱۷۵)

اس جملہ کی تفسیر میں اس امام نے تو کمال ہی کر دیا ہے جن کی نسبت سے ہم سنی حنفی کے ساتھ ساتھ
 ماتریدی بھی کہلاتے ہیں، یعنی امام ابو منصور محمد بن محمد بن محمود ماتریدی حنفی رحمۃ اللہ علیہ، متوفی ۳۳۳ھ، وہ
 لکھتے ہیں:

وَقَوْلُهُ تَعَالَى ﴿وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ فِيهِ تَرْغِيبٌ وَتَرْهِيْبٌ فِي مَا
 يَرْغَبُ فِيهِ وَيَرْغَبُ عَنْهُ .
 ”ارشادِ الہی: ﴿وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ میں ترغیب و ترہیب دونوں ہیں،
 پسندیدہ اعمال کی ترغیب اور ناپسندیدہ اعمال سے ترہیب (دارنگ) کا ذکر ہے۔“

(تاویلات اہل السنة لأبي منصور الماتریدی ج ۵ ص ۴۳)

جب اس آیت میں وعدہ و وعید اور ترغیب و ترہیب دونوں مذکور ہیں اور جزا و سزا کا معاملہ بھی اسی کے
 مطابق ہوگا تو پھر کسی عالم دین کے لکھ دینے سے وہ ذاتِ مجتہد اپنا قانون تو تبدیل نہیں کرے گی جس نے

یہاں تک فرمایا ہے:

لَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ، وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ .
”تو جو ایک ذرہ بھر بھلائی کرے اُسے دیکھے گا اور جو ایک ذرہ بھر برائی کرے اُسے دیکھے گا۔“

(الزلزال: ۸۰۷)

وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِنْ كَانَ
مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَكَفَى بِنَا حَاسِبِينَ .

”اور ہم عدل کی ترازوئیں رکھیں گے قیامت کے دن تو کسی جان پر کچھ ظلم نہ ہوگا،
اور اگر کوئی چیز رائی کے دانے کے برابر ہو تو ہم اُسے لے آئیں گے اور ہم کافی ہیں
حساب کو۔“

(الانبیاء: ۴۷)

سو اُس وقت تک جن لوگوں نے صلح حدیبیہ سے قبل اور بعد یا فتح مکہ سے ہی قبل اور بعد انفاق اور
جہاد کیا یا بعد میں جو لوگ انفاق و جہاد کرتے رہیں گے اللہ تعالیٰ جس طرح اُن کے ساتھ کیے ہوئے اجر کے
وعدہ کو پورا فرمائے گا اُسی طرح وہ ذرہ ذرہ کے حساب کی وعید کو بھی پورا فرمائے گا، ورنہ سیدنا حجر بن عدی
رضی اللہ عنہ ایسے بے گناہ حضرات جنہیں کسی حد یا جنگ میں نہیں بلکہ ”صَبْرًا“ (باندھ کر) قتل کیا گیا اُن کا حساب
کس کے ذمہ ہوگا؟

بعض طلقاء کی خاطر ترجمہ میں تبدیلی

قارئین کرام! خدا گواہ ہے کہ میں یہ سطور انتہائی کرب و اضطراب کے ساتھ لکھ رہا ہوں۔ میں انتہائی
معذرت کے ساتھ کہتا ہوں کہ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے معاویہ بن ابی سفیان کے مستقبل پر لکیر کھینچ کر
اُسے جنتی قرار دینے کی خاطر فتاویٰ رضویہ میں آیت کے ترجمہ کو جو مستقبل کے ساتھ خاص کیا ہے، یہ اُن کا ترا
تحمم ہے۔ فتاویٰ رضویہ میں بعض طلقاء کی خاطر انہوں نے ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ کا ترجمہ یوں
کیا ہے:

”اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرنے والے ہو۔“

(فتاویٰ رضویہ ج ۲۹ ص ۳۳۶)

جبکہ کنز الایمان میں اس جملہ کا ترجمہ انہوں نے ایسا شان دار کیا ہے کہ اُس میں ماضی، حال اور مستقبل کی کوئی قید ہی نظر نہیں آتی۔ وہ لکھتے ہیں:

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾

”اور اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے۔“

(الحديد: ۱۰)

ایک اور مقام پر اسی لفظ کا ترجمہ یوں کیا ہے:

”اور اللہ تمہارے کاموں سے خبردار ہے۔“

(آل عمران: ۱۸۰)

جب ان دونوں مقامات پر ترجمہ کو مستقبل کے ساتھ خاص نہیں کیا تو فتاویٰ رضویہ میں کیوں کیا؟ اس کی حکمت کسی پاسبان مسلک رضا سے ضرور معلوم کیجئے گا!

بے جا حمایت میں حد ہی کر دی

بعض علماء ہند نے فرمایا تو یہ تھا:

”ہم تو محمد اللہ سرکار اہل بیت کے غلامانِ خانہ زاد ہیں۔ ہمیں معاویہ سے کیا

رشتہ، خدا نخواستہ اُن کی حمایت بے جا کریں مگر ہاں اپنی سرکار کی طرف داری۔“

(فتاویٰ رضویہ ج ۲۹ ص ۳۷۸)

لیکن وہ اپنے لکھے پر قائم نہیں رہ سکے اور ابن ہند کی بے جا ہی نہیں کی بلکہ خلافتِ شریعت حمایت کے مرتکب ہو گئے۔ کبھی اُن کے دفاع میں بعض مجہول شعراء کے شعر کو شریعت کا درجہ دے دیا اور کبھی اُن کے چالیس سالہ اقتدار کی جملہ زیادتیاں پر غفوکا ایسا قلم پھیرا کہ کتاب و سنت کی سینکڑوں آیات و احادیث ہی عبث نظر آنے لگیں۔ اگر انہیں اپنی سرکار کی طرف داری اس حد تک منظور تھی کہ بعض طلقاء کی حمایت میں

انہیں آیات و احادیث یاد نہ رہیں اور انہوں نے اُس خاندان کو بلا حساب و کتاب جنتی قرار دے دیا جو اعلان نبوت کے بعد مسلسل اکیس (۲۱) برس تک پیغمبر اسلام ﷺ کو پریشان کرتا رہا اور پھر بعد از وصال نبوی ﷺ آپ کے اہل بیت کرام علیہم السلام کو اذیتیں پہنچاتا رہا، تو پھر انہوں نے اپنی سرکار کی طرف داری کا کچھ حصہ اُس شخص کے لیے بھی ظاہر کیا ہوتا جس نے اپنے مکمل کنبہ کو حمایت نبوی ﷺ میں لگا دیا تھا، شعب ابی طالب میں محصور ہو کر فاقہ کشی کرتا رہا، اُس کا کنبہ حمایت اسلام میں کفر سے لڑتا رہا اور پھر اُسی کا کنبہ بعد از وصال نبوی ﷺ بھی ظلم و ستم کا شکار رہا۔ اگر اپنی سرکار کی طرف داری کرتے ہوئے حمایت معاویہ میں آیات و احادیث نظر انداز ہو گئیں تو حمایت ابی طالب میں مرسل و منقطع روایات کو کیوں نہیں چھوڑا جاسکتا؟ اگر بقول کسے سیدنا ابوطالب ؑ نے علی الاعلان خود کلمہ نہیں پڑھا تو کیا اس میں کوئی حکمت نہیں ہو سکتی؟ اگر وہ کفر پر دل سے ڈٹے ہوئے ہوتے تو پھر انہوں نے کبھی اپنے کنبہ کے کسی فرد کے اسلام قبول کرنے پر برہمی نہیں تو کم از کم خفگی اور ناگواری کا اظہار تو کیا ہوتا!

سیدنا ابوطالب ؑ عجیب کا فرحتے کہ اُن کی زوجہ اُن کا دین چھوڑ کر مسلمان ہو گئیں تو وہ خفا نہ ہوئے، سیدنا علی ؑ نے اُن کے دین کے برعکس اظہار اسلام فرما دیا تو وہ ناراض نہ ہوئے، سیدنا جعفر طیار ؑ نے اُن کے دین کو خیر باد کہہ کر اسلام قبول کر لیا تو وہ شس سے مس نہ ہوئے بلکہ فرمایا: اپنے چچا زاد کے دست و بازو بن جاؤ! اور سیدنا حمزہ بن عبدالمطلب ؑ نے طیش میں آ کر اعلان اسلام فرما دیا تو انہیں فرمایا: تم نے جو فیصلہ کیا ہے اس پر ثابت قدم رہنا اور پھر خود بھی اپنے دین کے دشمن بھتیجے کی اس قدر زوردار حمایت کرتے رہے کہ اُن کے پیارے بھتیجے ﷺ اُن کے انتقال کے بعد بھی اُن کی حمایت کو بھلا نہ سکے۔

کیا دنیا میں ایسے کافر کی کوئی نظیر پیش کی جاسکتی ہے جو اپنے دین کے دشمن کو اُس کے بچپن سے جانتا ہو اور بشمول بحیرتی راہب متعدد اہل کتاب علماء و احبار سے سن رکھا ہو کہ اُس کا یہ بھتیجا رب العالمین کا رسول ہے، رحمۃ للعالمین اور خاتم النبیین ہے اور پھر بھی وہ اُس کی نہ صرف یہ کہ اُس کے بچپن سے پرورش کرتا رہا ہو بلکہ اُس کے اعلان نبوت کے بعد اپنے اور قوم کے دین کی کھلی بغاوت کو دیکھنے کے باوجود اُس کے مشن کی حمایت کرتا رہا ہو اور اپنے پورے کنبہ کو بھی اُس کی حمایت میں لگا دیا ہو؟ اگر کرہ ارضی پر کوئی ایسا کافر گزرا ہو

تو بطور نمونہ کوئی مثال تو پیش فرمائیے!

خلاصہ یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلی رحمۃ اللہ علیہ نے معاویہ بن ابی سفیان کی بے جا حمایت کی ہے، اُن کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ کسی طرف جھکتے تو پروا نہیں کرتے تھے اور دوسری سمت کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ اس مقام پر مجھے اعتراف کرنا ہی پڑے گا کہ درج ذیل مصرع اُن پر پورا پورا صادق آتا ہے بع
جس سمت آگئے ہو سکے بٹھا دیے ہیں

اتباع میں مقدم کون، بزرگ یا حق؟

بہود و تعطل میں جکڑا ہوا انسان ہمیشہ حق کو سو خراور اپنے پیرو بزرگ کو مقدم سمجھتا ہے، اگرچہ اُس کا پیرو بزرگ نفس مسئلہ میں غلط ہی کیوں نہ ہو۔ اسی صورت حال کا شکار وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو کسی شخصیت کو مذہب و مسلک کی پہچان بنا لیتے ہیں، مثلاً ہمارے دور میں بعض طبقات نے پہلے بعض علماء ہند کو بانی مسلک تصور کر لیا اور پھر خود کو اُن کے مسلک کا علمبردار سمجھ لیا، حالانکہ وہ بعض علماء امام مذہب تھے اور نہ ہی امام عقیدہ، وہ مذہبِ حنفی اور عقیدہ ماتریدی تھے، وہ خود کو کسی مسلک کا امام، واضح یا بانی تصور نہیں کرتے تھے، لیکن جو لوگ اُن کے نام سے دکان داری کرتے ہیں، اُن کے جبر و ظلم کا عالم یہ ہے کہ وہ اُن کی ہر ہر بات کو منوالا لازم سمجھتے ہیں اور جو نہ مانے اُسے اہل سنت سے خارج سمجھتے ہیں، جبکہ خود اُس عالم دین نے جا بجا لکھا ہے کہ قرآن کے علاوہ کوئی کتاب اغلاط سے پاک نہیں اور انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ کوئی انسان غلط و خطا سے معصوم نہیں، لہذا غلط، لغزش اور غلطی کسی بھی غیر نبی انسان سے ممکن ہے۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر جان لیجئے کہ زیر بحث مسئلہ میں اُن بعض علماء ہند پر حق واضح نہیں ہو سکا۔ اس مسئلہ میں حق وہ نہیں جو انہوں نے سمجھا بلکہ حق وہ ہے جو اُن کے اور ہم سب کے ائمہ نے سمجھا۔

قوت اقتدار کا سحر

یقین فرمائیے! میں حیرت میں ڈوب جاتا ہوں اور سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہوں جب دیکھتا ہوں کہ قد آور علماء و فضلاء کسی بادشاہ کے ناجائز دفاع میں اس حد تک آگے چلے جاتے ہیں کہ بہت سی آیات و احادیث

بھی انہیں یاد نہیں رہتیں اور ترجمہ قرآن کو بھی ایک مخصوص رُخ پر معین کرنے میں انہیں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی۔ بسیار سوچ و بچار کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ اُن کا قصور نہیں بلکہ یہ اولین ملوکیت کا جادو ہے جس کی وجہ سے بڑی بڑی عقلیں متاثر ہو گئیں۔ اولین دور اقتدار کے قریبی لوگ جس سحر اقتدار سے متاثر ہوئے تھے یہ اُسی کی نحوست ہے جس سے اب تک جان نہیں چھوٹی۔ متاخرین کی اکثریت اُسی جادو سے متاثر ہے جس سے حقد میں متاثر ہوئے تھے۔ قوت اقتدار اور سحر اقتدار کی بدولت ہر شعبہ زندگی کے لوگ کھچے چلے آتے ہیں۔ سلطان کے ارد گرد ایسے نام نہاد دانشور، شعراء، خطباء، علماء اور فقہاء کی ایک کھیپ تیار ہو جاتی ہے جو حرام کو حلال اور ظلم کو عدل باور کرانے میں مہارت رکھتی ہے۔ یہ بات نہیں کہ انہیں برے بھلے، حلال و حرام اور خیر و شر کی تمیز نہیں ہوتی، وہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہیں مگر دنیوی منفعت میں اندھے ہو جاتے ہیں۔ ایسے ظالم لوگ اپنے علم و فن سے شر کو خیر اور ظلم کو عدل دکھلانے میں اتنا مہارت رکھتے ہیں کہ ارباب تقویٰ اہل علم و دانش بھی اُن کے دھوکے میں آ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی امت کے معاملے میں ایسے پڑھے لکھے ماہرین کو سب سے بڑا خطرہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ خلیفہ ثانی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: إِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمْ كُلُّ مُنَافِقٍ عَلِيمٍ اللِّسَانِ.

”میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا تھا: میں تمہارے بارے میں ہر منافق عالم زبان اور کوسب سے بڑا خطرہ سمجھتا ہوں۔“

(صفة النفاق ونعت المنافقين لأبي نعيم ص ۱۶۲، ۱۶۳، حدیث ۱۵۰)

ایسے ماہرین کی مہارت اُس وقت خوب آشکار ہوتی ہے جب انہیں اُن کے علم و فن کے خریدار مل جاتے ہیں۔ نیز ایسے ماہرین صرف ہمارے دور میں ہی نہیں بلکہ دور نبوی ﷺ میں بھی چھپے ہوئے تھے لیکن اُن کے سودے کا خریدار کوئی نہیں تھا، پھر جب خلافت راشدہ کے اختتام پر انہیں اُن کے قدر دان مل گئے تو اُن کی پانچوں گھی میں تھیں۔ چنانچہ امام بخاری لکھتے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس کچھ لوگوں

نے آکر کہا:

إِنَّا نَدْخُلُ عَلَى سُلْطَانِنَا فَنَقُولُ لَهُمْ بِخِلَافِ مَا نَتَكَلَّمُ إِذَا خَرَجْنَا مِنْ عِنْدِهِمْ ، قَالَ : كُنَّا نَعْدُوهَا يَفَاقًا .

”ہم اپنے سلطان کے پاس جاتے ہیں تو اُن کے لیے ایسی گفتگو کرتے ہیں جو ہماری باہر کی گفتگو کے خلاف ہوتی ہے، اُنہوں نے فرمایا: ہم اس کو نفاق شمار کرتے تھے۔“
(بخاری: کتاب الأحکام، باب ما یکرہ من ثناء السلطان وإذا خرج قال غیر ذلک، حدیث

(۷۱۷۸)

عروہ بن زبیر بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کو عرض کیا:
إِنَّا نَحْضُرُ الْإِمَامَ فَبِحُكْمٍ بِالْحُكْمِ نَرَاهُ جَوْرًا ، فَنَقُولُ : وَفَقَّكَ
اللَّهُ ، وَنَنْظُرُ إِلَى الرَّجُلِ مِنَّا فَيُثَنِّي عَلَيْهِ بِذَلِكَ ، قَالَ ابْنُ عُمَرَ : إِنَّمَا مَعَشَرُ
أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ كُنَّا نَعْدُو هَذَا يَفَاقًا ، فَأَمَّا أَنْتُمْ فَمَا أَذْرِي مَا
تَعْدُونَهُ .

”ہم جب اپنے امام (نام نہاد خلیفہ) کے پاس جاتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کوئی ظالمانہ فیصلہ کرتا ہے تو ہم کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ تجھے اچھی توفیق دے، اور ہم اپنے ساتھیوں میں سے بعض کو دیکھتے ہیں کہ وہ اُس کے اُس فیصلہ پر اُس کی تعریف کرتے ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ہم رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کی جماعت اس کو منافقت شمار کرتے تھے، لیکن میں نہیں جانتا کہ تم لوگ اب اس کو کیا سمجھتے ہو۔“

(صفة النفاق ونعت المنافقين لأبي نعيم ص ۱۲۵ حدیث ۹۵)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ دو صحابہ میں ایسے کون سے حکمران ہوں گے جن کی مجلس میں اُن کی جھوٹی تعریف کی جاتی ہوگی؟ اس کا کچھ اندازہ درج ذیل حدیث سے ہو سکتا ہے۔ حافظ ابن عساکر اور امام ذہبی لکھتے ہیں:

كَانَ عِبَادَةُ بْنُ الصَّامِتِ مَعَ مُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِي سُفْيَانَ فِي عَسْكَرِهِ،
فَإِذْ ذَاكَ يَوْمًا فَقَامَ خَطِيبٌ يَمْدَحُ مُعَاوِيَةَ وَيُثْنِي عَلَيْهِ، فَقَامَ عِبَادَةُ بِحُرَابٍ
فِي يَدِهِ، فَخَنَاهُ فِي قِمِّ الْخَطِيبِ، فَغَضِبَ مُعَاوِيَةُ، فَقَالَ لَهُ عِبَادَةُ: إِنَّكَ
لَمْ تَكُنْ مَعَنَا حِينَ بَايَعْنَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ بِالْعَقَبَةِ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ لِي
مَنْشُطِنَا وَمَكْرَهِنَا وَمُكْسَلِنَا، وَالثَّرَةِ عَلَيْنَا، وَالْأَنْسَارِغَ الْأُمُرَ أَهْلَهُ، وَأَنْ
نَقُومَ بِالْحَقِّ حَيْثُ كُنَّا لَا نَخَافُ فِي اللَّهِ لَوْمَةً لَانِيْم. وَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ
ﷺ: إِذَا رَأَيْتُمُ الْمَذَاحِيْنَ، فَاخْشَوْا فِي أَلْوَاهِيهِمُ التُّرَابَ.

”سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ معاویہ بن ابی سفیان کے لشکر میں تھے کہ ایک دن
انہوں نے اذان کہی تو ایک خطیب کھڑے ہو کر معاویہ کی شان و تعریف کرنے لگا۔
حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ اٹھے اور خاک کی ایک مٹھی بھر کر خطیب کے منہ پر پھینک دی۔ اس
پر معاویہ غضبناک ہوا تو اس کو سیدنا عبادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم اس وقت نہیں تھے جب
ہم نے عقبہ میں رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی تھی کہ ہم اپنی پسند اور ناپسند میں آپ کی
اطاعت کریں گے اور اپنی پسند پر آپ کے فرمان کو ترجیح دیں گے، کسی امر میں ناحق
تعارض نہیں کریں گے اور ہر حال میں حق کی خاطر کھڑے ہوں گے اور اللہ کے معاملہ
میں کسی ملامت گر کی پرواہ نہیں کریں گے اور آپ نے فرمایا تھا: جب تم تعریف کرنے
والوں کو دیکھو تو ان کے مونہوں (بوتھوں) میں مٹی ٹھوسنا۔“ (۱)

(تاریخ دمشق لابن عساکر ج ۲۶ ص ۱۹۶؛ سیر أعلام النبلاء ج ۲ ص ۷؛ عبادہ بن الصامت
رضی اللہ عنہ لکھنؤ و حیدرآباد دکن ۱۳۳، ۱۳۴)

- (۱) امام ابو نعیم کہتے ہیں: مُشْبِلٌ وَهَبٌ مِنَ الْمُنَافِقِ؟ قَالَ: الَّذِي يُحِبُّ الْحَمْدَ وَيَكْفُرُ الدَّمَّ. ”وہب بن
منہبہ سے پوچھا گیا: منافق کون؟ فرمایا: جو تعریف کو پسند کرے اور برائی کو ناپسند۔“
(صفة النفاق ونعت المنافقين لأبي نعیم ص ۱۵۱، أثر: ۱۳۳)

نوٹ:

یہ وہی عبادہ بن الصامت انصاری رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے معاویہ بن ابی سفیان کو سودی معاملہ میں ٹوکا تھا اور ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی پرواہ نہ کرنے پر اُن کے ساتھ بول چال بھی بند کر دی تھی، اور یہی ہیں وہ جنہوں نے خمر (شراب) کی مشکوں کو چھری سے پھاڑ ڈالا تھا تو معاویہ بن ابی سفیان اُن پر غضبناک ہوا تھا، وہ شراب اونٹوں کی قطار پر لدی ہوئی تھی اور انہوں نے پوری قطار ہی ضائع کر دی تھی۔ یہ مکمل واقعہ درج بالا کتب میں دیکھا جاسکتا ہے۔ جو لوگ ”الصَّحَابَةُ عَذُوْلٌ“ ہی نہیں بلکہ بلا استثنا ”كُلُّهُمْ عَذُوْلٌ“ کے مدعی ہیں انہیں ایسے حقائق کو ضرور مد نظر رکھنا چاہیے۔

جب سلطان کو ایسا دھندہ پسند آ جائے تو پھر سودا گروں اور ضمیر فروشوں کی کوئی کمی نہیں رہتی۔ شر و ظلم کی صورت میں سودا گر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر سلطان وقت کا دور زمانہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہو تو پھر اُس کی شان میں از خود احادیث گھڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے والے ماہرین علم بھی میدان میں آ جاتے ہیں اور ایسی طمع سازی کرتے ہیں کہ بعض مرتبہ علماء حق بھی اُن کے جھوٹ کو بچ تصور کرتے ہوئے قبول کر لیتے ہیں۔ چنانچہ صحاح ستہ کے حاذق محدثین کرام رحمۃ اللہ علیہم بھی ایسے مکاروں اور منافقوں کے مکر و فریب سے محفوظ نہیں رہ سکے، حتیٰ کہ صحیح مسلم جیسی کتاب میں بھی اسلام کے پہلے بادشاہ کی شان میں جھوٹی حدیث گھس گئی اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کو محسوس تک نہ ہوا، جیسے کہ ہم ”شرح خصائص علی رضی اللہ عنہ“ اور ”الاحادیث الموضوعة فی فضائل معاویہ“ میں تحقیق کے ساتھ لکھ چکے ہیں۔ سنن ترمذی میں ”اللَّهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مُّهْدِيًا وَاهْدِيْهِ“ بھی ایسے ہی مکار کار یگروں کا کمال ہے کہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ جیسے عظیم محدث بھی دھوکہ کھا گئے۔

علماء حق سے ناجائز دفاع کیوں؟

سو جب قرونِ اولیٰ کے بعض کذاب لوگوں کی دیسہ کاریوں سے امام مسلم اور امام ترمذی ایسے ماہر محدثین کرام رحمۃ اللہ علیہم بھی دھوکہ کھا بیٹھے تو پھر بعد والے تو اپنے حسن ظن کی بنا کر انہیں کے نقش قدم پر

چلیں گے، الایہ کہ کوئی سر پھر شخص تحقیق کی چھائی اٹھالے تو وہ اختلاف کرنے پر مجبور ہو جائے۔ خود سوچئے! آخر کیا وجہ ہوئی کہ بعض قد آور علماء نے سورۃ الحدید کی آیت [۱۰] کا ایسا ترجمہ کر دیا جس سے فتح مکہ سے لے کر [۶۰ھ] تک بعض طلقاء کے تمام اعمال کو بلا حساب بنا دیا؟ یقیناً اس کا سبب وہی جھوٹی احادیث ہیں جو پہلی بادشاہی کے دور میں گھڑی گئیں۔ چنانچہ بعض ایسی احادیث بھی بنائی گئیں جن کے ذریعے بعض طلقاء کے تاریک مستقبل پر مہر سکوت لگانے کی کوشش کی گئی، اور پھر امت کی بد قسمتی دیکھئے کہ ایسی جھوٹی روایات کو کتب صحاح میں بھی جگہ مل گئی۔

”لَا تَذْكُرُوا مُعَاوِيَةَ إِلَّا بِخَيْرٍ“ کا بطلان

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يَحْيَى حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مُحَمَّدٍ النَّفِيلِيُّ حَدَّثَنَا
عَمْرُو بْنُ وَاقِدٍ عَنْ يُونُسَ بْنِ حَلْبَسٍ عَنْ أَبِي إِدْرِيسَ الْخَوْلَانِيِّ قَالَ لَمَّا
عَزَلَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ عُمَيْرَ بْنَ سَعْدٍ عَنْ حِمَصَ وَلِي مُعَاوِيَةَ فَقَالَ
النَّاسُ: عَزَلَ عُمَيْرًا وَلِي مُعَاوِيَةَ فَقَالَ عُمَيْرٌ: لَا تَذْكُرُوا مُعَاوِيَةَ إِلَّا
بِخَيْرٍ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ اللَّهُمَّ اهْدِ بِهِ. قَالَ أَبُو عِيسَى:
هَذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ، قَالَ: وَعَمْرُو بْنُ وَاقِدٍ يُضَعَّفُ.

”ابو ادريس خولانی سے روایت ہے جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حمص سے عمیر بن سعد کو معزول کر کے معاویہ کو والی بنایا تو لوگوں نے کہا: انہوں نے عمیر کو معزول کر دیا اور معاویہ کو امیر مقرر کر دیا۔ اس پر عمیر بن سعد نے کہا: معاویہ کا ذکر خیر سے کیا کرو، کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا تھا: اے اللہ! اس کے ذریعہ لوگوں کو ہدایت دے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث غریب ہے، عمرو بن واقد کی تضعیف کی گئی ہے۔“

(الجامع الکبیر وهو سنن الترمذی ج ۶ ص ۱۵۸ حدیث ۱۸۴۳)

علامہ البانی کا تضاد

ہر چند کہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ ”وَعَمْرُو بْنُ وَاقِدٍ يُضَعَّفُ“ کے الفاظ استعمال کر کے اس حدیث کو قبول کرنے یا مسترد کرنے کی ذمہ داری دوسروں پر ڈال گئے، تاہم اُن کا اپنی جامع میں اس کو درج کرنا بھی باعث حیرت ہے، کیونکہ عمرو بن واقد کی تصحیف ہی نہیں بلکہ تکذیب بھی کی گئی ہے اور یہ حدیث ضعیف نہیں بلکہ موضوع ہے۔ اس سے زیادہ حیرت اُن لوگوں پر ہے جنہوں نے اس جعلی حدیث کو صحیح قرار دے دیا ہے، اور یہ غلطی علامہ ناصر الدین البانی سے ہوئی، وہ لکھتے ہیں:

صَحِيحٌ بِمَا قَبْلَهُ.

”یہ پہلی حدیث کی وجہ سے صحیح ہے۔“

(صحیح سنن الترمذی للالبانی ج ۳ ص ۵۶۱ حدیث ۳۸۴۳)

یہ علامہ البانی کی سنگین غلطی ہے، کیونکہ اس کی سند میں عمرو بن واقد راوی کو کئی حضرات نے کذاب کہا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

”یزید بن محمد بن عبد الصمد کہتے ہیں: ابو مسہر نے کہا: وہ جھوٹ بولتا تھا۔ امام بخاری

ابو حاتم، دُحیم اور یعقوب بن سفیان نے کہا: وہ بیکار آدمی تھا۔ یعقوب بن سفیان نے

دُحیم سے نقل کیا ہے: ہمارے مشائخ اُس سے حدیث نہیں لیتے تھے، وہ کہتے ہیں: گویا

کہ دُحیم کو اس میں شک نہیں تھا کہ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ عبد اللہ بن احمد بن ذکوان کہتے

ہیں: محمد بن مبارک صوری عمرو بن واقد سے مروان طاطری کی وفات تک حدیث روایت

نہیں کرتے تھے، اور مروان کہا کرتا تھا: عمرو بن واقد بڑا جھوٹا ہے۔ ابراہیم جوزجانی کہتا

ہے: میں نے محمد بن مبارک سے اُس کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے کہا: وہ سلطان

کی پیروی کرتا تھا اور سچا تھا، ابراہیم جوزجانی کہتے ہیں: میں نہیں سمجھ سکا کہ محمد بن مبارک

صوری کے اس قول کا کیا مطلب ہے؟ اُس کی احادیث معضل اور منکر تھیں اور ہم مدت

سے اُس کی حدیث کو منکر سمجھتے تھے۔ امام ابن حبان نے کہا: یہ سندوں کو تبدیل کرتا ہے،

مشہور راویوں سے منکر احادیث روایت کرتا ہے، لہذا یہ ترک کر دینے کا مستحق ہے۔

(تہذیب التہذیب ملخصاً ج ۵ ص ۱۰۴، ۱۰۵)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے ”تہذیب التہذیب“ کی تلخیص میں ان تمام اقوال کا خلاصہ اور نتیجہ

یوں بیان کیا ہے:

عَمْرُو بْنُ وَاقِدٍ الدِّمَشْقِيُّ أَبُو حَفْصٍ مَوْلَى قُرَيْشٍ مَتْرُوكٌ.

”قریش کا غلام ابو حفص عمرو بن واقد دمشقی متروک (مسترد کیا ہوا) ہے۔“

(تقریب التہذیب ص ۷۴۸؛ تحریر تقریب التہذیب ج ۳ ص ۱۱۱)

لطف کی بات یہ ہے کہ خود علامہ ناصر الدین البانی نے بھی اس راوی کے بارے میں اپنی دو کتابوں

میں لکھا ہے:

وَعَمْرُو بْنُ وَاقِدٍ مَتْرُوكٌ ، كَمَا فِي ”التَّقْرِيبِ“.

”عمرو بن واقد متروک ہے، جیسا کہ ”تقریب التہذیب“ میں ہے۔“

(سلسلة الأحادیث الضعيفة ج ۲ ص ۳۴۱؛ سلسلة الأحادیث الصحيحة ج ۱ ص ۵۱۴)

حیرت ہے کہ علامہ البانی نے عمرو بن واقد کو متروک تسلیم کرنے کے باوجود اس کی روایت کردہ

حدیث کو صحیح کہہ دیا؟ ظاہر ہے کہ کسی راوی کے متروک ہونے کی کوئی وجہ ہوتی ہے، اور جب ”تہذیب

التہذیب“ میں اس کے متروک ہونے کی دوسری وجہ کے علاوہ اس کا سندوں کو تبدیل کرنا اور کذاب ہونا

واضح طور پر لکھ دیا گیا ہے اور علامہ البانی بھی اس کو متروک تسلیم کر چکے ہیں تو پھر اس کی روایت کردہ حدیث

صحیح کیسے ہو گئی؟ علامہ البانی نے اس حدیث کو جس پہلی حدیث کی بنا پر صحیح کہا ہے وہ بھی تو موضوع ہے،

کیونکہ اس کا وہ راوی جس کو صحابی تصور کیا گیا ہے اس کی صحابیت میں اختلاف ہے تو پھر وہ سند اس سند کی

موید کیوں کر ہو سکتی ہے؟

”لَا تَذْكُرُوا مُعَاوِيَةَ إِلَّا بِخَيْرٍ“ کے شان و رود کا جھوٹا ہونا

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس حدیث کے شان و رود میں جو حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ عنہ کی معزولی اور

اُن کی جگہ پر معاویہ کی تقرری کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، وہ واقعہ ہی سراسر جھوٹ ہے، کوئی مائی کال ل یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ سیدنا عمرؓ نے حضرت عمیر بن سعدؓ کو معزول کر کے اُن کی جگہ پر معاویہ کو لگایا تھا۔ راقم الحروف نے اس سلسلے میں جو مطالعہ کیا ہے اُس کی تفصیل فی الحال سپرد قلم کرنا مناسب نہیں سمجھتا، سر دست اتنا سمجھ لیں کہ حضرت عمرؓ کو حضرت عمیر بن سعدؓ اس قدر پسند تھے کہ وہ چاہتے تھے کہ اُن کی مثل کچھ اور بھی قابل حضرات ہوتے تو اُن سے مسلمانوں کی بہبود کا کام لیا جاتا۔ چنانچہ متعدد علماء کرام لکھتے ہیں:

كَانَ عُمَرُ يَقُولُ : وَدِدْتُ أَنَّ لِي رَجُلًا مِثْلَ عُمَيْرِ بْنِ سَعْدٍ أَسْتَعِينُ بِهِمْ عَلَى أَعْمَالِ الْمُسْلِمِينَ.

”سیدنا عمرؓ فرمایا کرتے تھے: میرا جی چاہتا ہے کہ مجھے عمیر بن سعد جیسے کچھ اور حضرات بھی مل جاتے تو میں اُن سے مسلمانوں کے کاموں میں مدد حاصل کرتا۔“

(الإصابة ج ۴ ص ۵۹۶؛ تاریخ دمشق ج ۶ ص ۴۸۵؛ أسد الغابة ج ۴ ص ۲۸۱؛ تہذیب الکمال ج ۲۲ ص ۳۷۵؛ تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۱۳۴)

سیدنا عمرؓ ان کو پسند فرماتے تھے اور ان کی کارکردگی پر حیران ہوتے تھے، حتیٰ کہ وہ انہیں اُن کی خوبیوں کی وجہ سے فرمایا کرتے تھے:

لَيْسَ بَخٍ وَخَدٍ.

”وہ اپنی مثال آپ ہے۔“

(الإصابة ج ۴ ص ۵۹۶؛ تاریخ دمشق ج ۶ ص ۴۸۵؛ الاستيعاب ج ۲ ص ۵۱۱؛ أسد الغابة ج ۴ ص ۲۸۱؛ تہذیب الکمال ج ۲۲ ص ۳۷۵؛ البداية والنهاية ج ۱۱ ص ۴۰۴؛ تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۱۳۴)

علامہ عبد الحفیظ بلیاوی نے اس لفظ کا معنی یوں کیا ہے:

”صفات محمودہ میں بے نظیر و لا ثانی۔“

(مصباح اللغات ص ۸۷۰)

ایسے شخص کو سیدنا عمرؓ جیسی صاحب عزیمت ہستی کیوں معزول کرتی؟ مذکورہ بالا کتب میں سے اکثر میں ہے کہ سیدنا عمرؓ نے تادم وصال ان کو معزول نہیں کیا تھا۔ ہاں بعض وہ حضرات جو عزیمت پر قائم نہ رہ سکے اُن کے بارے میں روایات ملتی ہیں کہ انہوں نے ان کو معزول کیا تھا یا اُن سے معزول کرا لیا گیا تھا اور ان کی جگہ پر معاویہ بن ابی سفیان کو مقرر کیا گیا تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ بعض حضرات کون تھے؟ اس پر میں اتنا عرض کرتا ہوں کہ ”یہ کہانی پھر سہی“۔

فی الجملہ یہ کہ جب سیدنا عمرؓ کی طرف حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ عنہما کی معزولی کی نسبت کا واقعہ کذب پر مبنی ہے تو پھر وہ روایت از خود جھوٹی قرار پائی جس کی بنیاد یہ جھوٹا واقعہ ہے۔

ایک اور قابل غور بات یہ ہے کہ بعض محدثین کے مطابق سیدنا عمیر بن سعدؓ سے فقط ایک حدیث منقول ہے اور وہ یہ زیر بحث حدیث نہیں ہے۔ چنانچہ امام ذہبی لکھتے ہیں:

عُمَيْرُ بْنُ سَعْدٍ الْأَنْصَارِيُّ الْأَوْسِيُّ الزَّاهِدُ، نَسِيحٌ وَحَدِيثُهُ، لَهُ حَدِيثٌ وَاحِدٌ..... لَا غَدْوَى، وَلَا طَيْرَةَ، وَلَا هَامَةَ.

”سیدنا عمیر بن سعد الانصاری الاوسی الزاہدؓ صفات محمودہ میں یکتا تھے، اُن

سے فقط ایک حدیث نبوی منقول ہے..... لَا غَدْوَى، وَلَا طَيْرَةَ، وَلَا هَامَةَ“۔

(میر اعلام النبلاء ج ۲ ص ۱۰۳، ۱۰۴)

اس سے معلوم ہوا کہ سنن الترمذی کی یہ روایت: ”لَا تَلْكُوهَا مُعَاوِيَةَ إِلَّا بِخَيْرٍ.....“ سراسر جھوٹ ہے۔ تعجب ہے کہ جب صحاح ستہ کے محدثین کرام میں سے کسی نے بھی ”باب مناقب معاویہ“ قائم نہیں کیا تو نہ معلوم امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ خواہ مخواہ کیوں تکلف میں پڑ گئے، جبکہ دو موضوع روایات کے علاوہ کچھ لا بھی نہیں سکے۔

سوجب کتب صحاح تک میں ایسی جھوٹی روایات آگئیں جن میں آیا ہے کہ بعض طلقاء کا تذکرہ خیر کے علاوہ کیا ہی نہ جائے تو پھر ایسی احادیث سے دھوکہ کھا کر بعد والے لوگ ﴿وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ کے ترجمہ سے اُن طلقاء کے مستقبل کے معاملات کو محفوظ کرنے کی کوشش نہ کرتے تو اور کیا کرتے؟

متن حدیث درست نہ ہو تو اُس کا راوی صحابی نہیں

علامہ البانی نے ”لَا تَذْكُرُوا مُعَاوِنَةَ إِلَّا بِخَيْرٍ.....“ کے متن کی صحت کو جس پہلی حدیث کی بنا پر صحیح ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے وہ یہ ہے: ”اللَّهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مُهْدِيًا وَاهْدِيْهُ“ یہ روایت بھی موضوع ہے، کیونکہ اس کے راوی عبدالرحمان ابن ابی عمیرہ کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے، اور بعض حافظ محدثین کرام نے لکھا ہے کہ جب کسی حدیث کا متن درست نہ ہو تو سمجھ لو کہ اُس کا مرکزی راوی صحابی نہیں ہے۔ بطور نمونہ ایک مثال ملاحظہ فرمائیے! ایک مشہور جھوٹی روایت ہے:

أَطْلُبُوا الْخَيْرَ عِنْدَ حَسَنِ الْوُجُوهِ.

”خیرات حسین چہروں سے طلب کرو۔“

اس متن کو رسول اللہ ﷺ سے نقل کرنے میں جس شخص کو صحابی ظاہر کیا گیا ہے اُس کو ابو مصعب انصاری کہا گیا ہے۔ حافظ ابونعیم، امام ابن اثیر جزری اور حافظ علاء الدین مغلطائی لکھتے ہیں:

مُخْتَلَفٌ فِيهِ.

”اس میں اختلاف ہے۔“

(معرفۃ الصحابة لأبي نعیم ج ۵ ص ۳۰۳۱ ترجمہ: ۳۴۶۴؛ أسد الغابة ج ۶ ص ۲۸۵؛ الإنابة إلى

معرفۃ المختلف فيهم من الصحابة ج ۲ ص ۲۸۶)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُس میں کیا اختلاف تھا؟ اس کی وضاحت حافظ ابن حجر عسقلانی کے کلام سے ہو جاتی ہے۔ انہوں نے اس کی صحابیت کی نفی میں بڑے کام کی بات کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

قَالَ أَبُو نَعِيمٍ فِي ”مَعْرِفَةِ الصَّحَابَةِ“: أَبُو مُصْعَبٍ مُخْتَلَفٌ فِي

صَحْبِهِ. قُلْتُ: لَوْ كَانَ صَحَابِيًا لَكَانَ هَذَا الْخَبَرُ صَحِيحًا لِصَحَّةِ

إِسْنَادِهِ إِلَيْهِ، وَقَدْ حَكَّمَ أَئِمَّةُ الْحَدِيثِ بِأَنَّ هَذَا الْمَتْنَ بَاطِلٌ، فَوَجِبَ

الْحُكْمُ بِأَنَّهُ غَيْرُ صَحَابِيٍّ، وَهُوَ غَيْرُ مَعْرُوفٍ فِي التَّابِعِينَ أَيْضًا.

حافظ ابونعیم نے ”معرفۃ الصحابة“ میں کہا ہے کہ ابو مصعب کے صحابی ہونے

میں اختلاف ہے۔ میں (عسقلانی) کہتا ہوں: اگر وہ صحابی ہوتا تو یہ حدیث اُس تک صحت و سند کے ساتھ صحیح ہوتی، اور بلاشبہ ائمہ حدیث نے اس کے متن پر بطلان کا حکم لگایا ہے، پس یہ امر ثابت ہو گیا کہ وہ صحابی نہیں ہے، اور وہ تابعین میں بھی معروف نہیں۔“

(لسان المیزان ج ۹ ص ۱۶۳)

اس سے معلوم ہوا کہ بعض اردار میں ظالم لوگ فقط حدیثیں ہی نہیں گھڑتے رہے بلکہ اپنی طرف سے صحابہ بھی تیار کرتے رہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

سوجب "اَطْلُبُوا الْخَيْرَ عِنْدَ حَسَنِ الْوُجُوْهِ" کے متن کی دلالت کی وجہ سے ابو مصعب انصاری کا غیر صحابی ہونا ثابت ہو گیا تو پھر "اللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مُّهْدِيًا وَاهْدِيْہِ" کے متن کا راوی بھی تو اسی طرح مختلف فیہ ہے، اور یہ متن بھی اُس شخص پر صادق نہیں آتا جس کے لیے وضع کیا گیا ہے تو پھر اس متن کے راوی عبد الرحمان ابن ابی عمیرہ کے غیر صحابی ہونے پر حکم واجب کیوں نہیں ہوتا؟ صرف اس لیے کہ یہاں مذہبی تعصب آڑے آجاتا ہے؟

خلاصہ یہ ہے کہ اس طرح کی موضوع، جعلی اور باطل روایات محض شاہی برکات کی بدولت وجود میں آتی رہیں، ورنہ طلقاء تو اور بھی بہت تھے۔ بس یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ اسلام کی پہلی بادشاہی کا سکہ ہے جو کسی نہ کسی صورت میں اب تک چلا آ رہا ہے۔ اس میں خال المومنین ہونے کی عظمت، کتابت اور صحابیت کا کوئی دخل نہیں، اس لیے کہ ان باتوں میں دوسرے حضرات ان سے بڑھ کر تھے مگر انہیں اس قدر طویل بادشاہت کی کرامت حاصل نہیں ہوئی تھی، موصوف کو بادشاہت حاصل ہوئی تو اُس کی بدولت لوگوں نے انہیں ہر اُس فضیلت سے متصف کر دیا جو خلفاء راشدین اور دوسرے صحابہ کرام ؓ میں سے کسی کو بھی حاصل تھی۔ یہ محض اُن کی بادشاہی کی کرامت تھی کہ بعض دنیوی چالاک لوگوں نے انہیں عشرہ مبشرہ کے بعد فضیلت میں گیارہویں ہستی بنا دیا تھا اور دوسرے تمام مہاجرین و انصار ؓ کو ایک طریق سے پیچھے دھکیل دیا تھا اور یہ بھی اُن کی بادشاہی کا کرشمہ تھا کہ بعض ماہر بد بختوں نے انہیں شیخین کریمین رضی اللہ عنہما سے بھی "اَسْوَدُ" (بڑا

سر دار) کہہ ڈالا تھا اور افسوس کی بات ہے کہ نواصب میں یہ کھوٹے سٹے اور جھوٹے کرشمے آج تک چل رہے ہیں۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى رَاسِ رَسُوْلِكَ مُحَمَّدٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ پَرِ تَقْدِيْمِ؟

ابن آكلۃ الاكباد معاویہ بن ابی سفیان کی بے جا حمایت اور ناجائز دفاع کرنے والے لوگ محض اُن کی خاطر اس قدر فیاضی و سخاوت کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ غفلت میں اُن سے اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى رَاسِ رَسُوْلِكَ مُحَمَّدٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ پر بھی تقدیم ہو جاتی ہے۔ قرآن و سنت میں تمام کے تمام صحابہ کو جنتی نہیں کہا گیا مگر یہ لوگ محض اپنے ممدوح و محبوب کی خاطر بلا استثناء سب کے سب اور تمام کے تمام صحابہ کہے جانے والوں کو جنتی قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ بعض نامور علماء کرام دفاع معاویہ کے جذبہ سے سرشار ہو کر لکھتے ہیں:

”سب سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ فرمایا اور ساتھ ہی اُن کے افعال کی تفتیش کرنے والوں کا منہ بند فرمادیا ”وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ“ (اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرنے والے ہو) با ایں ہمہ وہ تم سب سے بھلائی کا وعدہ فرما چکا پھر دوسرا کون ہے کہ اُن میں سے کسی کی بات پر طعن کرے؟“۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۲۹ ص ۳۳۷)

ایک اور عالم انہیں صاحب کی خاطر بات بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

”جس طرح سارے نبی گناہ سے معصوم ویسے ہی سارے صحابہ فسق سے مامون و محفوظ ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم نے اُن سب کے عادل متقی پر ہی زگار ہونے کی گواہی دی اور اُن سے وعدہ فرمایا مغفرت و جنت کا، اِلٰی اَنْ قَالَ: وَكُلًّا وَعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی (اور سارے صحابہ سے اللہ نے جنت کا وعدہ فرمایا)۔“

(امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ص ۲۰۱۹)

اسی ناجائز دفاع میں کچھ اور حضرات سورۃ التوبہ کی آیت نمبر ۱۰۰ کے تحت لکھتے ہیں:

”اس آیت کے تحت تفسیر صراط الجنان جلد ۴، صفحہ ۲۱۹ پر ہے: اس سے معلوم ہوا

کہ سارے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم عادل اور جنتی ہیں ان میں سے کوئی گنہگار اور فاسق نہیں۔“

(فیضان امیر معاویہ ص ۱۶۳)

پہلی بات تو یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں ”مِنْ“ بمعنیہ ہے، سورۃ التوبہ کی آیت میں نہ تو تمام مہاجرین و انصار کا ذکر ہے اور نہ ہی اُن کے بعد آنے والے تمام لوگوں کا ذکر ہے بلکہ فقط اُن کا ذکر ہے جنہوں نے اُن کی اتباع بالاحسان کی، اسی طرح سورۃ الحدید کی آیت میں تمام صحابہ کا ذکر نہیں ہے بلکہ فقط پہلے یا بعد میں اتفاق و قتال کرنے والوں کا ذکر ہے۔ اگر ﴿مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ﴾ اور ﴿مِنْكُمْ مَنْ اتَّفَقَ﴾ میں ہی غور کر لیا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر سارے کے سارے صحابہ کہے جانے والے عادل اور جنتی ہوں تو پھر متعدد احادیث کی تکذیب لازم آتی ہے۔ مثلاً ارشاد نبوی ﷺ ہے:

فِي أَصْحَابِي اثْنَا عَشَرَ مَنْفِقًا ، فِيهِمْ ثَمَانِيَةٌ لَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّى يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ .

”میرے صحابہ میں بارہ منافق ہیں، اُن میں سے آٹھ جنت میں داخل نہیں ہوں گے حتیٰ کہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل ہو۔“

(صحیح مسلم : کتاب صفات المنافقین وأحكامهم، ص ۱۲۸۲ حدیث ۲۷۷۹، الجامع بین

الصحيحين للشامي ج ۱ ص ۵۴ حدیث ۷۶)

اس حدیث میں تو بارہ کا عدد ہے جبکہ بعض احادیث میں بلا عدد مذکور ہے کہ قیامت کے دن صحابہ میں سے کچھ لوگوں کو نبی کریم ﷺ سے دور کر دیا جائے گا۔ چنانچہ صحیحین میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حوض کوثر کے ذکر میں صحابہ کرام ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

”تم میں سے کچھ لوگ میرے پاس لائے جائیں گے پھر انہیں مجھ سے دور کر دیا جائے گا،

تو میں عرض کروں گا: اے رب! یہ تو میرے صحابہ ہیں۔ کہا جائے گا: آپ نہیں جانتے کہ

انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا کیا؟“۔

(بخاری: کتاب الرقاق، باب فی الحوض، ص ۹۰۹ حدیث ۶۵۷۶؛ صحیح مسلم: باب

إثبات حوض نبینا ﷺ ۱۰۸۶ حدیث ۲۲۹۰، ۲۲۹۱، ۲۲۹۲، ۲۲۹۳، ۲۲۹۴، ۲۲۹۵)

مشہور قول ”الصُّحَابَةُ كُلُّهُمْ عَدُوٌّ“ کو حدیث گمان کرنے والے بعض لوگ مغالطہ آفرینی سے کام لیتے ہوئے اس حدیث سے صحابی نہیں بلکہ امتی مراد لینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن دوسری احادیث سے اُن کی ہیرا پھیری کا پول کھل جاتا ہے۔ چنانچہ بعض احادیث کے الفاظ ہیں:

لَيُورِدَنَّ عَلَيَّ الْحَوْضَ رِجَالٌ مِمَّنْ صَحِبَنِي وَرَأَى، حَتَّى إِذَا رَفَعُوا إِلَيَّ
وَرَأَيْتُهُمْ اخْتَلَجُوا ذُنُوبِي.

”حوض پر میرے پاس کچھ ایسے اشخاص آئیں گے جو میری صحبت میں رہے ہوں گے اور جنہوں نے مجھے دیکھا ہوگا، حتیٰ کہ جب وہ میری طرف بلند ہوں گے اور میں انہیں دیکھوں گا تو وہ مجھ سے دور کر دیے جائیں گے۔“

(مسند احمد بتحقیق احمد شاہ کرج ۱۵ ص ۲۳۰ حدیث ۲۰۳۷۳؛ مجمع الزوائد ج ۱۰ ص

۳۶۴ و ط: ج ۲۲ ص ۱۳۷ حدیث ۱۸۴۱۰؛ فتح الباری [دار طیبہ] ج ۱۵ ص ۳۳)

سوطی کی دکان پر نانا جی کی فاتحہ دلانے والے فیاض لوگوں سے گزارش ہے کہ وہ جس جس کو جنت میں لے جانے کی استطاعت رکھتے ہوں بے شک لے جائیں لیکن تمام کے تمام صحابہ کو عادل اور جنتی قرار دے کر اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ پر تقدیم سے گریز فرمائیں۔

قارئین کرام! دراصل روافض اور نواصب دونوں افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ چنانچہ روافض اکثر صالحین کو ظالمین قرار دیتے ہیں اور نواصب بعض ظالمین کو صالحین ثابت کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں، جبکہ اعتدال ان دونوں کے وسط میں ہے۔

دستِ طلقاء پر بیعتِ اطاعت؟

فتاویٰ رضویہ ج ۲۹ ص ۳۷۸ پر قوسین میں دو مقام پر لکھا ہوا ہے کہ امام حسن علیہ السلام نے معاویہ کے

ہاتھ پر بیعت اطاعت فرمائی تھی۔ قوسین کے وہ الفاظ فاضل بریلی کے نہیں بلکہ کسی اور شخص کے ہیں، لیکن چونکہ نام نہاد مسلک رضا کے ٹھیکیدار فتاویٰ رضویہ میں مرقوم ہر بات کو حجت سمجھتے اور جبراً منواتے ہیں، اس لیے ہم پہلے اُس مقام کے الفاظ مع سیاق و سباق مکمل نقل کرتے ہیں پھر اُن پر تبصرہ کریں گے۔ فتاویٰ رضویہ میں ہے:

”ہمارے شہزادہ اکبر حضرت سبط (اکبر، حسن) مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حسب بشارت اپنے جد امجد سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ (وآلہ) وسلم کے، بعد اختتام مدت (خلافت راشدہ کہ منہاج نبوت پر تیس سال رہی اور سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چھ ماہ مدت خلافت پر ختم ہوئی) عین معرکہ جنگ میں (ایک فوج جوار کی ہمراہی کے باوجود) ہتھیار رکھ دیے (بالقصد والاختیار) اور ملک (اور امور مسلمین کا انتظام و انصرام) امیر معاویہ کو سپرد کر دیا (اور اُن کے ہاتھ پر بیعت اطاعت فرمائی) اگر مدت خلافت ختم ہو چکی تھی اور آپ (خود) بادشاہت منظور نہیں فرماتے تو صحابہ حجاز میں کوئی اور قابلیت نظم و نسق دین نہ رکھتا تھا جو انہیں کو اختیار کیا (اور انہیں کے ہاتھ پر بیعت اطاعت کر لی)“۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۲۹ ص ۳۷۸)

قوسین کے مابین ”اور اُن کے ہاتھ پر بیعت اطاعت فرمائی“ کے الفاظ سے بعض نواصب زمانہ نے انتہائی سفیہانہ نتائج اخذ کیے ہیں، انہوں نے اس بیعت اطاعت سے یہ سمجھ لیا کہ معاویہ امام حسن و حسین علیہما السلام کے پیرومرشد تھے، جیسا کہ ہم ”شرح کعب الاربعین فی فضائل آل البيت الطاہرین“ میں اُن کی حماقت پر تبصرہ کر چکے ہیں، جبکہ بعض لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ معاویہ بن ابی سفیان، سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو پسند تھے۔ ہم اس قول کی کافی تردید کر چکے ہیں، یہاں ہم آپ کے سامنے کسی سربراہ مملکت اسلامیہ کی بیعت کی حقیقت بیان کر رہے ہیں تاکہ آپ خود ہی فیصلہ کر سکیں کہ امام پاک نے بیعت اطاعت فرمائی تھی یا انہیں مجبوراً معاہدہ صلح کرتے ہوئے ہاتھ بڑھانا پڑا تھا۔

خلیفہ یا حاکم اسلام کی بیعت کی حقیقت

نواصب اور وکلاء طلقاء راگ الاپتے رہتے ہیں کہ چونکہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے ابن سحر کی بیعت کر لی تھی، لہذا وہ خلیفہ ہو گئے تھے۔ اس غلط فہمی کا شکار قدیم و جدید بڑے بڑے لکھاری ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ تو امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے بیعت اطاعت فرمائی تھی اور نہ ہی معاویہ بن ابی سفیان خلیفہ تھا۔ اہل سنت کے نزدیک خلیفہ وہ ہوتا ہے جس کو اہل عقد و صل (با اثر علماء و فقہاء) بلا جبر و اکراہ منتخب کریں۔ چنانچہ امام ماموردی شافعی اور قاضی ابویعلیٰ حنبلی لکھتے ہیں:

فَإِذَا اجْتَمَعَ أَهْلُ الْعَقْدِ وَالْحَلِ لِلْإِخْتِيَارِ تَصَفَّحُوا أَحْوَالَ أَهْلِ
الْإِمَامَةِ الْمَوْجُودَةِ فِيهِمْ شُرُوطًا ، فَقَدَّمُوا لِلْبَيْعَةِ مِنْهُمْ أَكْثَرَهُمْ فَضْلًا وَ
أَكْمَلَهُمْ شُرُوطًا ، وَمَنْ يَسْرِعُ النَّاسُ إِلَى طَاعَتِهِ وَلَا يَتَوَقَّفُونَ عَنْ بَيْعَتِهِ ،
فَإِذَا تَعَيَّنَ لَهُمْ مِنْ بَيْنِ الْجَمَاعَةِ مَنْ أَذَاهُمْ الْإِجْتِهَادُ إِلَى إِخْتِيَارِهِ
عَرَضُوهَا عَلَيْهِ ، فَإِنْ أَجَابَ إِلَيْهَا بِإِعْوَدٍ عَلَيْهَا ، وَالْعَقْدُ بَيْنَهُمْ لَهُ
الْإِمَامَةُ فَلَسِرَ كَافَّةُ الدُّخُولِ فِي بَيْعَتِهِ وَالْإِقْبَادُ لِمَطَاعَتِهِ ، وَإِنْ اِمْتَنَعَ عَنِ
الْإِمَامَةِ وَلَمْ يُجِبْ إِلَيْهَا لَمْ يُجْبَرْ عَلَيْهَا ، لِأَنَّهَا عَقْدٌ مُرَاضَاةٌ وَإِخْتِيَارٌ ، لَا
يَدْخُلُهُ إِكْرَاهٌ وَلَا إِجْبَارٌ ، وَعَدَلَ عَنْهُ إِلَى مَنْ سِوَاهُ مِنْ مُسْتَحِقِّهَا فَبُيِعَ
عَلَيْهَا .

”پس جب اہل عقد و صل انتخاب کے لیے جمع ہو جائیں تو ان لوگوں کے کوائف و احوال کی تحقیق کریں جن میں امامت (اقتدار) کی شرائط موجود ہوں، پھر ان میں اُس شخص کو مقدم رکھیں جو ان سب سے افضل اور شرائط میں اکمل ہو، جس کی اطاعت میں لوگ دلچسپی لیں اور اُس کی بیعت سے گریز نہ کریں۔ پس جب اہل عقد و صل کی سوچ جماعت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے پر متفق ہو جائے تو وہ اُس سوچ کو اُس اہل شخص کے سامنے پیش کریں۔ پھر اگر وہ اُسے قبول کر لے تو سب اُس کی بیعت کر

لیں، اُن کی بیعت سے اُس کی امامت منعقد ہو جائے گی تو پوری امت پر اُس کی بیعت میں داخل ہونا اور اُس کی اطاعت کے لیے سر تسلیم خم کرنا لازم ہو جائے گا، اور اگر وہ شخص امامت سے منع کرے اور اُس کو قبول نہ کرے تو اُس کو اُس پر مجبور نہیں کیا جائے گا، کیونکہ یہ جانبین سے رضا اور اختیار کا سودا ہے، اس میں زور و جبر کا کوئی دخل نہیں۔ اُس کے انکار کی صورت میں اُس کو چھوڑ کر دوسرے استحقاق رکھنے والوں کا رخ کیا جائے اور بیعت امامت کی جائے۔“

(الاحکام السلطانیة للماوردی ص ۸۰۷؛ الاحکام السلطانیة لأبی یعلیٰ الحنبلی ص ۲۴)

اس اقتباس کی چند موٹی موٹی باتوں میں غور فرمائیے:

۱۔ اس اقتباس میں خلافت و امامت کے بہت زیادہ امیدواروں کی نہیں بلکہ اہلیت رکھنے والے کتنی کے چند لوگوں کی بات ہو رہی ہے۔

۲۔ اس اقتباس میں خلافت و امامت کے لیے خود کو پیش کرنے کی بات نہیں ہو رہی بلکہ اہل شخص کو تلاش کرنے کی بات ہو رہی ہے۔

۳۔ امام و خلیفہ کو منتخب کرنا اور ارباب عقد و حل کی سوچ و پچار کے بعد اُس کا منتخب ہونا دونوں باتیں جانبین کی رضامندی سے ہوتی ہیں، اس میں جبر و اکراہ کا کوئی دخل نہیں۔

ایمان و انصاف سے بتائیے! صلح امام حسن علیہ السلام و معاویہ میں ان میں سے کوئی ایک بھی بات پائی جاتی ہے؟

❖ کیا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے اہلیت خلافت رکھنے والے متعدد لوگوں میں سے معاویہ کو منتخب کیا تھا، یا انہیں مجبوراً معاویہ سے ہی صلح کرنا پڑی تھی؟

❖ کیا معاویہ آرام سے گھر میں بیٹھے تھے کہ ارباب عقد و حل نے انہیں سب سے بہتر جان کر انہیں خلافت کی پیش کش کی تھی؟

❖ کیا معاویہ بن ابی سفیان خلافت کو مسترد کرتے رہے؟

- ❖ کیا ارباب عقد و حل نے انہیں خلافت سنبھالنے پر مجبور کیا تھا؟
- ❖ کیا یہ معاملہ جاہلین سے محض رضا و اختیار سے تھا؟
- ❖ اگر ان ساری باتوں کا جواب ہاں میں ہو تو پھر ”هَذَنَ عَلَى دَخْنٍ“ کا کیا مطلب ہوگا؟
- ❖ امام حسن مجتبیٰ (علیہ السلام) کے اُس ارشاد کا کیا مطلب ہوگا کہ انہوں نے فرمایا: معاویہ جس بات کی طرف بلا رہا ہے اُس میں عزت ہے اور نہ ہی انصاف؟
- ❖ اگر سیدنا امام حسن مجتبیٰ (علیہ السلام) نے معاویہ کو قصہ خود اور رضا و رغبت سے اختیار فرمایا تھا تو پھر انہوں نے اُسے فتنہ کیوں کہا تھا؟
- ❖ اگر امام حسن مجتبیٰ (علیہ السلام) نے رضا و رغبت سے بیعت اطاعت کی تھی تو بعد از بیعت معاویہ کے خلاف جنگ کرنے کو خوارج کی جنگ سے بہتر کیوں فرمایا تھا؟
- ❖ اگر امام حسن مجتبیٰ (علیہ السلام) اور معاویہ کے مابین یہ معاملہ باہمی رضامندی سے تھا تو پھر معاویہ نے امام حسن (علیہ السلام) کی اچانک شہادت کو مصیبت کیوں نہ سمجھا؟
- ❖ اگر امام حسن مجتبیٰ (علیہ السلام) نے اپنی خوشی اور رضا سے معاویہ کو اقتدار سپرد فرمایا تھا تو پھر وہ معاویہ کے محسن ہوئے اور اگر بندہ احسان فراموش نہ ہو تو اُسے اُس کا محسن محبوب ہوتا ہے لیکن کیا وجہ ہے کہ جب معاویہ کے روبرو ایک بد بخت نے امام پاک کو انگارہ کہا تو معاویہ اُس پر غضبناک نہ ہوا؟
- ❖ کیا خاندانی آدمی کے نزدیک محسن شخص کا اچانک شہید ہو جانا مصیبت نہیں ہوتا؟

بیعت اور پھر نافرمانی؟

بیعت رضامندی سے ہوتی ہے، خواہ بیعت امامت (اقتدار) ہو یا بیعت طریقت۔ چنانچہ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

إِعْلَمُ أَنَّ الْبَيْعَةَ هِيَ الْعَهْدُ عَلَى الطَّاعَةِ.

”جان لو کہ بیعت اطاعت کا عہد ہے۔“

علامہ خازن لکھتے ہیں:

وَأَصْلُ الْبَيْعَةِ: الْعَقْدُ الَّذِي يَغْتَبِذُهُ الْإِنْسَانُ عَلَى نَفْسِهِ مِنْ بَذْلِ الطَّاعَةِ لِلْإِمَامِ، وَالْوَفَاءُ بِالْعَهْدِ الَّذِي التَّزَمَهُ لَهُ.

”بیعت کی حقیقت وہ عقد (گروہ) ہے جو انسان خود پر لگاتا ہے امام کی اطاعت کے لیے، اور اُس عہد کو نبھانا ہے جس کو اُس نے خود پر لازم کر لیا۔“

(لباب التأویل ج ۴ ص ۱۵۶)

بتائیے! کیا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام اور اُن کے پیروکاروں نے اپنی مرضی اور رغبت سے معاویہ بن صفور کی بیعت کو خود پر لازم کیا تھا؟ اگر نہیں تو پھر کیونکر سمجھ لیا گیا کہ معاویہ حقیقی امام و خلیفہ ہو گیا اور امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام اُس کے پیروکاروں میں شامل ہو گئے؟ حیرت ہے کہ امام پاک تو محض کشت و خون سے بچنے کی خاطر شرعی اصولوں کے تحت اُس کے ساتھ شرائط طے کر کے خود اقتدار سے دست بردار ہو گئے مگر نواصب و ملوکیت پسند لوگوں نے اس مجبوری کو امام پاک کی رضا و رغبت اور بیعت اطاعت کا نام دے دیا، اور بعض نامرادوں نے تو اس کو پیری مریدی کی بیعت سمجھ لیا۔۔۔ تف ہے ایسی عقل مندی پر، انسوس ہے ایسے پڑھنے پڑھانے پر اور پھٹکار ہے ایسی نام نہاد دین داری پر۔

اگر امام پاک علیہ السلام نے از خود بیعت معاویہ کا قلابہ زبہ گردن فرمایا ہوتا تو کیا وہ معاویہ کے اولین حکم کو ہی مسترد کر دیتے؟ ذرا سوچئے تو سہی! جب امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے معاویہ کے پہلے حکم کو ہی ٹھوکر مارتے ہوئے فرمایا تھا کہ خوارج کے خلاف جنگ کرنے سے تیرے خلاف جنگ کرنا زیادہ بہتر ہے تو پھر اُن کی صلح کو بیعت اطاعت کہنا کہاں کی دانش مندی ہے؟ غور کر کے بتائیے کہ متقی اور اصول پسند بندہ جس شخص کو فتنہ سمجھتا ہو تو اُس کی بیعت اطاعت قبول کر سکتا ہے؟ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے تو صلح اور دست برداری کے بعد بھی معاویہ کو فتنہ قرار دیا تھا، تو پھر وہ اُس کی بیعت اطاعت کیسے قبول کرتے؟

تنبیہ:

یاد رکھنا چاہیے کہ بیعت اطاعت کے الفاظ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے نہیں ہیں، لیکن چونکہ موجود

انہیں کے فتاویٰ میں ہیں، اس لیے بعض لوگ دھوکہ کھا جاتے ہیں جبکہ کچھ ٹھیکیدار قسم کے لوگ اُن الفاظ کو قولِ اعلیٰ حضرت گردانتے ہوئے حجت بنا لیتے ہیں، لہذا ملحوظ خاطر رہے کہ یہ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ نہیں ہیں۔ بالفرض اگر یہ اُن کے اپنے الفاظ بھی ہوتے تو پھر بھی مسترد کر دیے جاتے، کیونکہ ”کُلُّ مَا خُوذَ مِنْ قَوْلِهِ وَمَوْذُوذَ عَلَيْهِ إِلَّا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ“ (رسول اللہ ﷺ کے علاوہ ہر ایک کا کلام مقبول بھی ہوتا ہے اور مردود بھی)

مملکت بذریعہ قوت و بغاوت

رضا و رغبت، بیعتِ اطاعت اور اہلیتِ معاویہ وغیرہ الفاظ یہ سب بعد والوں کے ڈھکوسلے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ معاویہ بن ابی سفیان تختِ اقتدار پر مکرو فریب، لاؤ لشکر اور زور و جبر سے پہنچا تھا، اور اس انداز سے حاصل کیا جانے والا اقتدار خلافت نہیں سلطنت ہوتا ہے اور تختِ اقتدار پر براجمان ہونے والا انسان خفیہ نہیں بلکہ ملک (بادشاہ) ہوتا ہے۔ بعد والے لوگ خلیفہ یا خلیفہ راشد کی رٹ لگا لگا کر بیشک سادہ لوح عوام کو گمراہ کرتے رہیں لیکن اُس دور کے باہوش، معتبر اور حقائق شناس لوگ بخوبی سمجھتے تھے کہ موصوفِ اقتدار پر کیسے پہنچے؟ آئیے! پہلے ہم آپ کے سامنے اُس دور کی بعض معتبر ہستیوں کا قول پیش کرتے ہیں پھر پوچھیں گے کہ کس کا قول زیادہ معتبر ہے؟ امام ذہبی لکھتے ہیں:

”عمر بن الحکم عوانہ سے روایت کرتے ہیں کہ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

معاویہ کے پاس گئے تو انہیں امیر المؤمنین کے الفاظ سے سلام نہ کیا (اور کہا: السَّلَامُ

عَلَيْكَ أَيُّهَا الْمَلِكُ! أنساب الأشراف) معاویہ نے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں

نے فرمایا: ہم مومن ہیں اور ہم نے آپ کو اپنا امیر نہیں بنایا، پھر سیدنا سعد بن ابی وقاص

رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم تو اس حال میں بہت خوش ہو، اور اللہ کی قسم! میں اگر اس مقام پر ہوتا

جہاں اب تم ہو تو مجھے اس میں خوشی نہ ہوتی کہ میں ذرہ برابر خون بہا کر یہ مقام حاصل

کرتا۔“

۳۵۹، حلم معاویہ لابن ابی الدنیا ص ۲۴، مسالك الأبطال لابن فضل الله العمري ج ۲ ص ۲۷۲، أنساب الأشراف للبلاذري، في ترجمة معاوية ج ۵ ص ۳۱، مختصر تاريخ دمشق ج ۹ ص ۲۶۹

سوال پیدا ہوتا ہے کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے ساتھ تو معاویہ کی صلح ہوئی تھی اور کسی قسم کی خون ریزی نہیں ہوئی تھی، پھر سیدنا سعد بن ابی وقاص علیہ السلام نے معاویہ کو کیوں فرمایا تم خون بہا کر اقتدار پر پہنچے ہو؟ جواب ظاہر ہے کہ اس حقیقت کا اظہار سیدنا سعد بن ابی وقاص علیہ السلام نے موصوف کی سابقہ تمام کوششوں کو مد نظر رکھتے ہوئے فرمایا تھا، کیونکہ موصوف نے سیدنا علی علیہ السلام کے ساتھ جنگ بھی اقتدار کی خاطر کی تھی، پھر تحکیم کی چال بھی اسی لیے چلی تھی اور تحکیم کے بعد سیدنا علی علیہ السلام کے پیروکاروں کے علاقہ جات، مکہ، مدینہ اور یمن وغیرہ پر حملے اور لوٹ مار کی غرض بھی یہی تھی۔ سو سیدنا سعد بن ابی وقاص علیہ السلام نے ماضی قریب میں تسلسل کے ساتھ رونما ہونے والے خونی واقعات کو مد نظر رکھتے ہوئے مذکورہ بالا الفاظ میں اظہار خیال فرمایا تھا۔ اب بتائیے کہ کس کی بات حق ہے، آیا صحابہ میں سے سیدنا سعد بن ابی وقاص اور دوسرے متعدد حضرات کا یہ مشاہدہ حق ہے کہ موصوف خون ریزی اور زور و جبر سے اقتدار پر پہنچے یا چودھویں صدی کے بعض علماء ہند کا یہ لکھنا حق ہے کہ امام حسن علیہ السلام نے معاویہ کو یورے حجاز سے زیادہ اہل سمجھ کر اُسے اقتدار سونپا تھا؟

بیٹا خون بہانے سے مجتنب رہا اور بابا نے خون بہا دیا؟

گذشتہ سطور میں تفصیلاً بیان ہو چکا ہے کہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام معاویہ بن ابی سفیان کے خلاف جنگ کرنے کو خوارج کے خلاف جنگ سے زیادہ اہم سمجھتے تھے مگر انہوں نے جنگ نہ فرمائی اور اس کی وجہ بیان فرمائی ”لِحَقْنِ دِمَاءِ الْمُسْلِمِينَ“ (مسلمانوں کے خون کے تحفظ کی خاطر) یہاں اکثر ذہنوں میں سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ بیٹا خونِ مسلمین کی خاطر جس شخص کے ساتھ جنگ کرنے سے مجتنب رہا اُس کے بابا نے اُس شخص کے ساتھ جنگ کر کے خون کیوں بہایا تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اُس کے بابا پر جنگ مسلط کر دی گئی تھی۔ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے بابا کریم علیہ السلام نے بارہا اُس شخص کو کتاب و سنت کی طرف بلایا تھا مگر بسیار کوششوں کے باوجود وہ شخص اپنی بغاوت

سے باز نہ آیا اور جنگ پر آمادہ رہا تو اُس بیکرِ صدق و صفا کو مجبوراً قرآن پر عمل کرتے ہوئے جنگ کرنا پڑی۔ نبی کریم ﷺ پہلے ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو فرما چکے تھے کہ ”تم میں سے ایک شخص تاویلِ قرآن پر اسی طرح جنگ کرے گا جس طرح میں نے تنزیلِ قرآن پر جنگیں کیں“۔ دوسری حدیث میں فرمایا کہ ”وہ جہاں ہوگا حق اُسی کے ساتھ ہوگا“۔ موصیٰ عثمان رضی اللہ عنہ کا دعویٰ محض بہانہ تھا اصل ہدف اقتدار کو پانا تھا۔ ابنِ مضر کی تو پہلے سے ہی خواہش تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قتل ہو جائیں تاکہ انہیں کا کاروبار چلے، جیسا کہ اس سے قبل امام ذہبی اور دوسرے محدثین کے حوالے سے لکھا جا چکا ہے۔ سوسیدنا علی رضی اللہ عنہ بغاوت کو کچلنے پر مجبور ہوئے تھے، وہ بغاوت ختم ہونے کو تھی کہ قرآن مجید کو نیزوں پر اٹھا لیا گیا تو پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ حکیم کو ماننے پر مجبور ہو گئے۔ حکیم میں کیے ہوئے معاہدوں پر معاویہ بن ابی سفیان قائم نہ رہا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ پھر اُس کی بغاوت کو کچلنے کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ انہیں شہید کر دیا گیا اور پھر اُسی لشکر کو لے کر سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ نے شام کا رخ فرمایا تو معاویہ نے انہیں صلح کی پیش کش کر دی تو امام پاک نے سمجھ لیا کہ قصاص تو اس کا صلحِ نظر ہی نہیں ہے، اس کا مقصد تو فقط کرسی ہے تو انہوں نے شرائط طے فرما کر باقاعدہ معاہدہ نامہ پر دستخط کرا کر صلح فرمائی۔ صلح کی وہ موٹی موٹی شقیں آپ پڑھ چکے ہیں، اُن میں دوسری شرائط کے ساتھ ساتھ باقاعدہ یہ شرط بھی تھی کہ مولا علی رضی اللہ عنہ کے پیروکار جہاں جہاں بھی ہوں انہیں چھیڑا نہیں جائے گا۔ اس شرط پر مخالف بول سکتا تھا کہ نہیں قاتلین سے تو قصاص لیا جائے گا مگر وہ نہیں بولا۔ اس سے ثابت ہوا کہ قصاص اُس کا مقصد نہیں تھا، اُس کا مقصد اقتدار تھا، اگر قصاص ہی مقصد ہوتا تو وہ بول اُٹھتا کیونکہ مقصد کبھی بھولا نہیں جاتا۔ پورا تو اُس نے دوسری شرائط کے ساتھ ساتھ اس شرط کو بھی نہیں کیا تھا، چونکہ بعد میں اُس نے سیدنا حجر بن عدی، اُن کے ساتھیوں اور دوسرے کئی حضرات کو تیغ کیا تھا مگر فی الفور اُس نے اس شرط کو اس لیے تسلیم کر لیا تھا کہ اُس کی دلی خواہش پوری ہو رہی تھی۔ گو یا سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ نے شرائط لکھواتے وقت ہی اُس کے دعوئے قصاص عثمان رضی اللہ عنہ کی قلعی کھول کر رکھ دی تھی۔ بعد میں بھی لوگوں پر امام پاک کی بصیرت عیاں ہو گئی کہ ابنِ مضر نے مطلق العنان بادشاہ ہونے کے باوجود باقاعدہ شرعی طریقے سے گواہیاں قائم کر کے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے قاتلین سے قصاص نہ لیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح سیدنا علی المرتضیٰؑ کو مجبوراً جنگ کرنا پڑی اور مجبوراً ہی حکیم کو قبول کرنا پڑا، اسی طرح سیدنا امام حسن مجتبیٰؑ کو بھی مجبوراً ایک نا اہل شخص کے ساتھ صلح کرنا پڑی۔ یہ دنیا عالم اسباب ہے، اس میں ظاہری اسباب کو مد نظر رکھتے ہوئے فیصلے کرنے ہوتے ہیں اور بسا اوقات غلط لوگوں کی الٹی شرائط کو بھی ماننا پڑتا ہے۔ بتائیے! صلح حدیبیہ میں الٹی شرائط ماننے کی آخر ظاہری وجہ کیا تھیں؟ سو جس طرح حضور اکرم ﷺ کو قریش کے غلط لوگوں کے ساتھ مجبوراً معاہدہ کرنا پڑ گیا تھا اسی طرح سیدنا علی مرتضیٰ اور امام حسن مجتبیٰ علیہما السلام کو بھی قریش کے غلط لوگوں کے ساتھ مجبوراً معاہدہ کرنا پڑ گیا تھا۔ اہل اسلام کو کبھی بھی وقت کے تقاضوں کے مطابق دشوار فیصلے کرنے پڑ جائیں تو ایسے فیصلے اُن کے لیے اُسوہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ علامہ آلوسی سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۹۵ کے الفاظ ﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

وَأُسْعِدُ بِالْآيَةِ عَلَى تَحْرِيمِ الْإِقْدَامِ عَلَى مَا يَخَافُ مِنْهُ تَلْفُ
النَّفْسِ، وَجَوَازِ الصُّلْحِ مَعَ الْكُفَّارِ وَالْبَغَاةِ إِذَا خَافَ الْإِمَامُ عَلَى نَفْسِهِ
أَوْ عَلَى الْمُسْلِمِينَ.

”اس آیت سے ایسا قدم اٹھانے کی حرمت کی دلیل حاصل کی گئی ہے جس سے جان ضائع ہونے کا اندیشہ ہو، اور اس میں یہ بھی دلیل ہے کہ کفار اور باغیوں کے ساتھ ایسے حالات میں صلح جائز ہے جب امام کو اپنی یہ مسلمانوں کی جان کا خوف ہو۔“

(روح المعانی ج ۳ ص ۱۷۰)

شیخ محمد جمال الدین قاسمی نے اس بات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

كَذَلِكَ الْآيَةُ عَلَى جَوَازِ الْهَزِيمَةِ فِي الْجِهَادِ إِذَا خَافَ عَلَى النَّفْسِ،
وَتَذَلُّ عَلَى جَوَازِ تَرْكِ الْأَمْرِ بِالْمَعْرُوفِ إِذَا خَافَ، لِأَنَّ كُلَّ ذَلِكَ
إِلْقَاءُ النَّفْسِ إِلَى التَّهْلُكَةِ، وَتَذَلُّ عَلَى جَوَازِ مُصَالَحَةِ الْكُفَّارِ وَالْبَغَاةِ إِذَا
خَافَ الْإِمَامُ عَلَى نَفْسِهِ أَوْ عَلَى الْمُسْلِمِينَ، كَمَا فَعَلَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ

عَامَ الْحَدِيثِ، وَكَمَا فَعَلَهُ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ عَلِيُّ عليه السلام بِصَفَيْنَ، وَكَمَا
فَعَلَهُ الْحَسَنُ عليه السلام مِنْ مُصَالَحَةِ مُعَاوِيَةَ.

”یہ آیت دلالت کر رہی ہے کہ جب انسان کو اپنی جان کا خدشہ ہو تو اُس وقت
جہاد سے پیچھے ہٹنا جائز ہے، اور یہ کہ جب خوف ہو تو امر بالمعروف ترک کرنا جائز ہے،
کیونکہ یہ صورتیں خود کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہیں، اور اس جواز پر بھی دلالت
کرتی ہے کہ جب امام وقت کو اپنی اور مسلمانوں کی جانوں کا خدشہ ہو تو وہ کافروں اور
باغیوں کے ساتھ مصالحت کر لے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کے سال کی
تھی اور جیسا کہ سیدنا مولیٰ علی عليه السلام نے جب صفین میں کی تھی اور جیسا کہ سیدنا امام حسن
عليه السلام نے معاویہ کے ساتھ صلح فرمائی تھی۔“

(محاسن التأویل ج ۳ ص ۴۸۱)

علامہ محمد جمال الدین قاسمی کی بیان کردہ ترتیب سے معلوم ہوا کہ بنو ہاشم کو حق کے تسلسل کی خاطر بار
بار باطل سے صلح کرنا پڑی، لہذا اس میں مستقبل میں اکابرین امت مسلمہ کے لیے بھی اسوہ ہے کہ انہیں بھی
کبھی مجبوراً باطل سے سمجھوتہ کرنا پڑ جائے تو وہ باطل کو باطل سمجھتے ہوئے اُس کے ساتھ بالشرائط معاہدہ صلح کر
سکتے ہیں۔

فی الجملہ یہ کہ مجبوری کے عالم میں سیدنا علی عليه السلام کے اقدام سے معاویہ اور اُن کے گروہ کا باغی ہونا
ظاہر ہوا، اور جب سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد بھی باغی لوگوں کی جہم بصیرت دانہ ہوئی تو پھر
یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آگئی کہ اُن کی تمام تر تک و دو فقط اقتدار کی خاطر تھی۔ اس سے سیدنا علی عليه السلام کا حق
پر ہونا اور مخالف کا باطل پر ہونا روز روشن سے بھی زیادہ عیاں ہو گیا، یہی وجہ ہے کہ سیدنا علی عليه السلام پر جب قاتلانہ
ہوا تو انہوں نے نعرہ مارا ”قُذِثَ وَزَبَّ الْكُفْبَةُ“ (رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا) نعرہ مارنے کا
مطلب یہ تھا کہ وہ اُس وقت بھی باغیوں کی وعدہ خلافی کو مد نظر رکھتے ہوئے بار و گران کے خلاف جہاد کی
تیار یوں میں مصروف تھے اور چونکہ یہ نبوی اور قرآنی مشن کی تکمیل کی مصروفیات تھیں اور اسی دوران اُن پر

حملہ ہو گیا تو انہوں نے خود کو بارگاہِ الہی میں سرخرو سمجھتے ہوئے یہ نعرہ مارا۔

امام حسن ؑ پر چونکہ یہ تمام تر حقائق و احوال عیاں ہو چکے تھے اور وہ سمجھ چکے تھے کہ مخالف قصاص عثمان ؑ یا دین کی خاطر برسرِ پیکار نہیں بلکہ اُس کا ^{مط} نظر فقط دنیا ہے تو وہ اپنے لشکر کے تمام معاملات اور مخالف کی تمام چالوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُمتِ مسلمہ کی بھلائی کی خاطر چند روزہ اقتدار سے دست بردار ہو گئے۔ یوں سمجھئے کہ سید العالمین محمد رسول اللہ ﷺ ہوں، سید المسلمین علی المرتضیٰ ؑ ہوں یا سید اشباب اہل البیتِ حسین کریمین علیہما السلام ہوں، سب اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی ذمہ داریاں پوری فرما کر اُس مقام کی طرف روانہ ہو گئے جہاں ہمیشہ کے لیے اُن کا اقتدار ہوگا۔

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ.

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ. وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ.

وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

مأخذ ومراجع

حديث

- ١- الأحاد والمثاني: أبو بكر أحمد بن عمرو بن أبي عاصم، متوفى ٢٨٧ هـ، دار الراية، الرياض، الطبعة الأولى ١٤١١ هـ.
- ٢- إتحاف الخيرة المهرة بزرائد المسانيد العشرة: أحمد بن أبي بكر بن إسماعيل البوصيري، متوفى ٨٤٠ هـ، دار الوطن، الرياض، الطبعة الأولى ١٤٢٠ هـ. وط: مكتبة الرشد، الرياض، الطبعة الأولى ١٤١٩ هـ.
- ٣- الأحاديث المختارة مما ليس في الصحيحين: ضياء الدين محمد بن عبد الواحد الحنبلي، متوفى ٦٤٣ هـ، مكتبة النهضة الحديثة، مكة المكرمة، الطبعة الأولى ١٤١٠ هـ.
- ٤- الإحسان بترتيب صحيح ابن حبان: أبو حاتم محمد بن حبان البستي، متوفى ٣٥٤ هـ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الثالثة ١٤١٨ هـ.
- ٥- أخبار الحسن: أبو القاسم سليمان بن أحمد الطبراني، متوفى ٣٦٠ هـ، دار الأوراد، الكويت، ١٤١٢ هـ.
- ٦- تقريب البغية بترتيب أحاديث الحلية: نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي، متوفى ٨٠٧ هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٠ هـ.
- ٧- الجامع الصحيح المسند من حديث رسول الله ﷺ ومسنده وأيامه: (بخاري) إمام محمد بن إسماعيل البخاري، متوفى ٢٥٦ هـ، دار السلام، الرياض، الطبعة الثانية ١٤١٩ هـ.
- ٨- الجامع الصغير في أحاديث البشير النذير ﷺ: جلال الدين عبد الرحمن بن أبي بكر السيوطي، متوفى ٩١١ هـ، مكتبة نزار المصطفى الباز، مكة المكرمة، الطبعة الأولى ١٤١٨ هـ.
- ٩- الجامع الكبير وهو سنن الترمذي: إمام أبو عيسى محمد بن عيسى الترمذي، متوفى ٢٧٩ هـ، دار الغرب الإسلامي، بيروت، الطبعة الأولى ١٩٩٦ هـ.

- ١٠- جامع المساليد: أبو الفرج عبد الرحمن بن علي الجوزي الحنبلي، متوفى ٥٩٧هـ، مكتبة الرشيد، الرياض، الطبعة الأولى ١٤٢٦هـ.
- ١١- جامع المساليد والسنن: أبو الفداء إسماعيل بن كثير الدمشقي، متوفى ٧٧٤هـ، دار الفكر، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٠هـ.
- ١٢- الجمع بين الصحيحين: محمد بن فتوح الحميدي، متوفى ٤٨٨هـ، دار ابن حزم، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ.
- ١٣- جمع الجوامع: حافظ جلال الدين عبد الرحمن بن أبي بكر السيوطي، متوفى ٩١١هـ، دار السعادة، مصر ١٤٢٦هـ.
- ١٤- حلية الأولياء وطبقات الأصفياء: أبو نُعَيْم أحمد بن عبد الله الأصبهاني، متوفى ٤٣٠هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ، وط: دار الفكر، بيروت، ١٤١٦هـ.
- ١٥- خصائص أمير المؤمنين علي بن أبي طالب عليه السلام: إمام أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب النسائي، متوفى ٣٠٣هـ، دار الكتاب العربي، بيروت، الطبعة الثانية ١٤١٧هـ. وط: بتحقيق البلوشي، مكتبة المعلى، الكويت، الطبعة الأولى ١٤٠٦هـ.
- ١٦- السنة: إمام أحمد بن عمرو بن أبي عاصم الشيباني، متوفى ٢٨٧هـ، المكتب الإسلامي، بيروت، الطبعة الثالثة ١٤١٣هـ، وط: دار الصميعي، الرياض، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ.
- ١٧- سنن ابن ماجه: إمام أبو عبد الله محمد بن يزيد متوفى ٢٧٣هـ، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الثانية ١٤١٨هـ.
- ١٨- سنن أبي داود: أبو داود سليمان بن الأشعث السجستاني، متوفى ٢٧٥هـ، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٣هـ، وط: دار ابن حزم، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ.
- ١٩- سنن الدارمي: إمام أبو عبد الله عبد الرحمن الدارمي، متوفى ٢٥٥هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٧هـ.
- ٢٠- سنن سعيد بن منصور: إمام سعيد بن منصور خراساني مكي، متوفى ٢٢٧هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٥هـ.

- ٢١- السنن الكبرى: إمام أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب النسائي، متوفى ٣٠٣هـ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢١هـ، وط: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١١هـ.
- ٢٢- السنن الكبرى: إمام أبو بكر أحمد بن حسين البیهقي، متوفى ٤٥٨هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٤هـ، وط: مركز هجر للبحوث والدراسات العربية والإسلامية، القاهرة، الطبعة الأولى ١٤٣٢هـ.
- ٢٣- السنن المجتبى (سنن النسائي): إمام أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب النسائي، متوفى ٣٠٣هـ، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الثالثة ١٤١٤هـ.
- ٢٤- شرح السنة: إمام حسين بن مسعود الفراء البغوي، متوفى ٥١٦هـ، المكتب الإسلامي، بيروت، الطبعة الثانية ١٤٠٣هـ.
- ٢٥- شرح مشكل الآثار: إمام أبو جعفر أحمد بن محمد الطحاوي، متوفى ٣٢١هـ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٥هـ.
- ٢٦- شرح معاني الآثار: إمام أبو جعفر أحمد بن محمد الطحاوي، متوفى ٣٢١هـ، عالم الكتب، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٤هـ.
- ٢٧- صحيح الجامع الصغير وزيادته: محمد ناصر الدين الألباني، متوفى ١٤٢٠هـ، المكتب الإسلامي، بيروت، الطبعة الثالثة ١٤٠٨هـ.
- ٢٨- غاية المقصد في زوائد المستند: نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي، متوفى ٨٠٧هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢١هـ.
- ٢٩- كتاب الأموال: إمام أبو عبيد القاسم بن سلام، متوفى ٢٢٤هـ، دار الهدى النبوي، مصر، الطبعة الأولى ١٤٢٨هـ.
- ٣٠- كتاب الأموال: إمام حميد بن زنجويه، متوفى ٢٥١هـ، مركز الملك فيصل للبحوث والدراسات الإسلامية، الرياض، الطبعة الأولى ١٤٠٦هـ.
- ٣١- كتاب الأموال: أبو جعفر أحمد بن نصر الداودي المالكي، متوفى ٤٠٢هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٩هـ.

- ٣٢- كتاب الفن: حافظ أبو عبدالله نعيم بن حماد المروزي، متوفى ٢٢٨هـ، مكتبة التوحيد، القاهرة، الطبعة الأولى ١٤١٢هـ، وط: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ.
- ٣٣- كشف الاستار عن زوائد البزار: حافظ نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي، متوفى ٨٠٧هـ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٤هـ.
- ٣٤- كنز العمال في سنن الأقوال والأفعال: علامة علي متقي بن حسام الدين برهانپوري، متوفى ٩٧٥هـ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٥هـ.
- ٣٥- مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: حافظ نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي، متوفى ٨٠٧هـ، دار الفكر، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٤هـ. وط: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثانية ٢٠٠٩، طوط: دار المنهاج، جدة، الطبعة الأولى ١٤٣٦هـ.
- ٣٦- مختصر زوائد مسند البزار: حافظ أحمد بن علي بن حجر العسقلاني، متوفى ٨٥٢هـ، مؤسسة الكتب الثقافية، الصنائع، الطبعة الثالثة ١٤١٤هـ.
- ٣٧- المستدرک على الصحيحين: إمام أبو عبد الله محمد بن عبد الله الحاكم نيشاپوري، متوفى ٤٠٥هـ، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ، وط: قديمة، دار المعرفة، بيروت، وط: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثانية ١٤٢٢هـ.
- ٣٨- مسند أبي يعلى الموصلي: إمام أحمد بن علي المشي التميمي، متوفى ٣٠٧هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ. وط: دار المأمون، دمشق، الطبعة الأولى ١٤٣٠هـ.
- ٣٩- المسند: إمام أحمد بن حنبل، متوفى ٢٤١هـ، عالم الكتب، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ. وط: دار الحديث القاهرة، الطبعة الأولى ١٤١٦هـ، وط: مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢١هـ، وط: دار المنهاج، الرياض، ١٤٢٩هـ.
- ٤٠- مسند الشافعي مع شرح الشافعي لابن الأثير: إمام محمد بن إدريس الشافعي، متوفى ٢٠٤هـ، مكتبة الرشد، الرياض، الطبعة الأولى ١٤٢٦هـ.
- ٤١- مسند الشاميين: إمام أبو القاسم سليمان بن أحمد الطبراني، متوفى ٣٦٠هـ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٦هـ.

- ٤٢- مسند فاطمة الزهراء عليها السلام: إمام جلال الدين سيوطي، متوفى ٨٩١١هـ، مؤسسة الكتب الثقافية، الصنائع، الطبعة الأولى ١٤١٣هـ.
- ٤٣- المسند: إمام سليمان بن داود بن جارود الطيالسي، متوفى ٢٠٣هـ، دار المعرفة، بيروت. وط: دار الكتب العلمية، الطبعة الأولى ١٤٢٥هـ، وط:
- ٤٤- المسند الجامع: دكتور بشار عواد معروف وشركاء، دار الجيل، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٣هـ.
- ٤٥- مشكاة المصابيح: إمام عبدالله محمد بن عبدالله الخطيب التبريزي، متوفى ٨٧٤١هـ، دار الأرقم، بيروت. وط: المكتب الإسلامي، بيروت، الطبعة الثانية ١٣٩٩هـ.
- ٤٦- المصنف: إمام عبد الرزاق بن همام الصنعاني، متوفى ٢١١هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢١هـ. وط: المجلس العلمي، جنوب إفريقيا، الطبعة الأولى ١٣٩٠هـ.
- ٤٧- المصنف: إمام أبو بكر عبدالله بن محمد بن أبي شيبة، متوفى ٢٣٥هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٦هـ. وط: مكتبة الرشد، الرياض، الطبعة الأولى ١٤٢٥هـ.
- ٤٨- المطالب العالية بزوائد المسانيد الثمانية: أحمد بن علي بن حجر العسقلاني، متوفى ٨٥٢هـ، دار العاصمة، الرياض، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ.
- ٤٩- المعجم الكبير: أبو القاسم سليمان بن أحمد الطبراني، متوفى ٣٦٠هـ، دار إحياء التراث العربي، بيروت، وط: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٨هـ. وط: مكتبة ابن تيمية، القاهرة.
- ٥٠- المقصد العلي في زوائد مسند أبي يعلى الموصلي: حافظ نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي، متوفى ٨٠٧هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ.
- ٥١- موطأ الإمام مالك، رواية محمد بن الحسن الشيباني: [موطأ محمد] متوفى ١٨٩هـ، دار القلم، دمشق، الطبعة الأولى ١٤١٣هـ.
- ٥٢- المهذب في اختصار السنن الكبير للبيهقي: إمام أبو عبد الله محمد بن أحمد الذهبي، متوفى ٧٤٨هـ، دار الوطن، الطبعة الأولى ١٤٢٢هـ.

تَفْصِيْلٌ

- ٥٣- أحكام القرآن: حجة الإسلام إمام أبي بكر أحمد بن علي الرازي الجصاص، متوفى ٣٧٠هـ، دار إحياء التراث العربي، بيروت، ١٤١٢هـ.
- ٥٤- البحر المحيط: علامة أبو الحيان بن محمد بن يوسف أندلسي، متوفى ٧٥٤هـ، دار الفكر، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٢هـ، وط: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٣هـ.
- ٥٥- تأويلات أهل السنة: أبو منصور محمد بن محمد بن محمود الماتريدي، متوفى ٣٣٣هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٦هـ.
- ٥٦- التحرير والتنوير: محمد الطاهر بن عاشور، دار التنسية، تونس، ١٩٨٤هـ.
- ٥٧- تفسير عثمانى: مولانا شبير أحمد عثمانى، متوفى ١٣٦٩هـ، دار الإذاعة، كراچی، ١٤٢٨هـ.
- ٥٨- تفسير القرآن العزيز: إمام عبد الرحمن بن محمد إدريس بن أبي حاتم الرازي، متوفى ٣٢٧هـ، مكتبة نزار مصطفى الباز، مكة المكرمة، الطبعة الثانية ١٤١٩هـ.
- ٥٩- تفسير القرآن العظيم: عماد الدين إسماعيل بن عمر بن كثير الشافعي، متوفى ٧٧٤هـ، دار طيبة، الرياض، الطبعة الثانية ١٤٢٠هـ، وط: مؤسسة قرطبة، الطبعة الأولى ١٤٢١هـ.
- ٦٠- جامع البيان عن تأويل آي القرآن: إمام أبو جعفر محمد بن جرير الطبري، متوفى ٣١٠هـ، دار هجر، جيزة، الطبعة الأولى ١٤٢٢هـ.
- ٦١- خزائن العرفان: صدر الأفاضل سيد محمد نعيم الدين مراد آبادي، متوفى، تاج كمبني.
- ٦٢- الدر المنثور في التفسير بالمأثور: إمام جلال الدين السيوطي، متوفى ٩١١هـ، مركز هجر للبحوث والدراسات العربية والإسلامية، القاهرة، طبعة الأولى ١٤٢٤هـ.
- ٦٣- روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني: أبو الفضل سيد محمود أنوسي حنفي بغدادي، متوفى ١٢٧٠هـ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٣١هـ.
- ٦٤- ضياء القرآن: جعفر علامه بير محمد كرم شاه الأزهرى، متوفى ١٤١٨هـ، ضياء القرآن پبلى كيشنر، لاهور.

- ٦٥- فتح البيان في مقاصد القرآن: سيد محمد صديق حسن خان بهوبالي، متوفى ١٣٠٧هـ، المكتبة العصرية، بيروت، الطبعة ١٤١٢هـ.
- ٦٦- فتح القدير: قاضي محمد بن علي الشوكاني، متوفى ١٢٥٠هـ، دار ابن كثير، دمشق، الطبعة الأولى ١٤١٤هـ.
- ٦٧- في رحاب التفسير: عبد الحميد كشك، المكتب المصري الحديث، القاهرة.
- ٦٨- لباب التأويل في معاني التنزيل: علي بن محمد البغدادي الشهير بالخبازن، متوفى ٧٥٢هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٥هـ.
- ٦٩- معاسن التأويل: الشيخ محمد جمال الدين القاسمي، متوفى ١٣٣٢هـ، دار إحياء الكتب العربية، عيسى البابي الحلبي وشركاه، الطبعة الأولى ١٣٧٦هـ.
- ٧٠- المحرر الوجيز في تفسير الكتاب العزيز: علامة أبوبكر قاضي عبد الحق بن غالب بن عطية الأندلسي، متوفى ٥٤٦هـ، دار الخير، دمشق، الطبعة الثانية ١٤٢٨هـ.
- ٧١- معارف القرآن: مفتي محمد شفيع عثمان ديوبندي، متوفى ١٣٩٩هـ، مكتبة معارف القرآن، كراچی ١٤٢٤هـ.
- ٧٢- نور العرفان على كنز الإيمان: مفتي أحمد يار خان نعمي، متوفى ١٣٩١هـ، نعمي كتب خانة، لاهور.

شُرُوحٌ مُبِيدَةٌ

- ٧٣- إرشاد الساري لشرح صحيح البخاري: أحمد بن أبي بكر الخطيب القسطلاني، متوفى ٩٤٢هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٦هـ.
- ٧٤- إكمال إكمال المعلم: أبو عبد الله محمد بن خليفة الوشتاني أبي المالكي، متوفى ٨٢٨هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ.
- ٧٥- إكمال المعلم بفوائد مسلم: قاضي عياض بن موسى مالكي الأندلسي، متوفى ٥٤٤هـ، دار الوفاء، المنصورة، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ.
- ٧٦- البحر المحيط الفجاج، في شرح صحيح الإمام مسلم بن الحجاج: محمد بن علي

- بن آدم الإتيوبي، دار ابن الجوزي، الدمام، السعودية، الطبعة الأولى ١٤٢٦ هـ.
- ٧٧- بذل المجهود في حل سنن أبي داود: علامة خليل أحمد سهارتهوري، متوفى ١٣٤٦ هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثانية ١٤٣٦ هـ، وط: الإمارات العربية، دبي، الطبعة الأولى ١٤٢٧ هـ.
- ٧٨- تحفة الأحوزي بشرح جامع الترمذي: عبد الرحمن مباركهوري، متوفى ١٣٢٥ هـ، دار إحياء التراث العربي بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٩ هـ، وط: دار الفكر، بيروت.
- ٧٩- التوضيح لشرح الجامع لصحيح: أبو حفص عمر بن علي المعروف بابن الملقن، ٨٠٤ هـ، دار الفلاح، مصر، الطبعة الأولى ١٤٢٩ هـ.
- ٨٠- حاشية الفاودي على البخاري: محمد التاودي بن محمد الطالب بن علي بن سودة الفاسي المالكي، متوفى ١٢٠٩ هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٨ هـ.
- ٨١- حاشية السندهي على مسند أحمد: أبو الحسن محمد بن عبد الهادي السندي، التوي، متوفى ١١٣٨ هـ، وزارة الأوقاف والشؤون الإسلامية، قطر، الطبعة الأولى ١٤٢٨ هـ.
- ٨٢- (شرح ابن بطلال على البخاري: أبو الحسن علي بن خلف بن عبد الملك، متوفى ٤٤٩ هـ، مكتبة الرشد، الرياض.
- ٨٣- شرح سنن أبي داود: شهاب الدين أبو العباس أحمد بن حسين بن علي بن رسلان الرملي الشافعي، متوفى ٨٤٤ هـ، دار الفلاح، القاهرة، ١٤٣٧ هـ.
- ٨٤- شرح صحيح مسلم: علامة غلام رسول سعيد، متوفى ٢٠١٦ هـ، فريد بك ستال، لاهور.
- ٨٥- عمدة القاري شرح صحيح البخاري: حافظ بدر الدين محمود بن أحمد العيني الحنفي، متوفى ٨٥٥ هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢١ هـ، وط: السخار للطباعة والنشر، القاهرة، الطبعة الأولى.
- ٨٦- عون المعبود شرح سنن أبي داود: شمس الحق عظيم آبادي، متوفى ١٣٢٩ هـ، دار ابن حزم، الطبعة الأولى ١٤٢٦ هـ، وط: المكتبة السلفية، المدينة المنورة، الطبعة الثانية ١٣٨٩ هـ.

- ٨٧- فتح الباري شرح صحيح البخاري: أحمد بن علي بن حجر العسقلاني، متوفى ٨٥٢هـ، دار الفكر، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٦هـ، وط: دار طيبة، الرياض، الطبعة الأولى ١٤٢٦هـ.
- ٨٨- فتح الملهم بشرح إمام المسلم: علامة شبير أحمد عثمان، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٦هـ.
- ٨٩- فتح المنعم شرح صحيح مسلم: دكتور موسى شاهين لاشين، دار الشروق، مصر، الطبعة الأولى ١٤٢٣هـ.
- ٩٠- فتح الودود في شرح سنن أبي داود: أبو الحسن نور الدين محمد بن عبد الهادي السندي، متوفى ١١٣٨هـ، مكتبة لينة، دمنهور، مصر، الطبعة الأولى ١٤٣١هـ.
- ٩١- فيض القدير شرح جامع الصغير: محمد عبد الرؤف المناوي، متوفى ١٠٠٣هـ، دار المعرفة، بيروت، الطبعة الثانية ١٣٩١هـ، وط: مكتبة نزار مصطفى الباز مكة المكرمة، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ.
- ٩٢- لمعات التنقيح في شرح مشكاة المصابيح: الشيخ عبد الحق محدث دهلوي، متوفى ١٠٥٢هـ، دار النوادر، دمشق، الطبعة الأولى ١٤٣٥هـ.
- ٩٣- مرآة المناجيح أردو ترجمة وشرح مشكاة المصابيح: مفتي أحمد يار خان نعيم، متوفى ١٣٩١هـ، ضياء القرآن پبلي كيشنز، لاهور.
- ٩٤- مرآة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: ملا علي القاري، متوفى ١٠١٤هـ، المكتبة التجارية، مكة المكرمة، وط: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٢هـ.
- ٩٥- المعلم بفوائد مسلم: أبو عبد الله محمد بن علي بن عمر المازري، متوفى ٥٣٦هـ، دار التونسية، تونس، ١٩٨٨هـ.
- ٩٦- المفهم لمّا أشكال من تلخيص كتاب مسلم: إمام أبو العباس أحمد بن عمر القرطبي المالكي، متوفى ٦٥٦هـ، دار ابن كثير، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٧هـ.
- ٩٧- مكمل إكمال الأكمال: علامة محمد بن محمد السنوسي المالكي، متوفى ٨٩٥هـ، دار

الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٥ هـ.

٩٨- المنتقى شرح موطأ: قاضي أبو الوليد سليمان بن خلف بن سعد بن أيوب الباجي

المالكي، متوفى ٤٩٤ هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٠ هـ.

٩٩- المنهاج بشرح مسلم لابن الحاج: علامة يحيى بن شرف النووي، متوفى ٦٧٦ هـ، دار

المعرفة، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٤ هـ، موطأ: مؤسسة قرطبة، الطبعة الثانية ١٤١٤ هـ.

سُيُوت وَفَضَائِلُ

١٠٠- إشراق مصابيح السيرة المحمدية بمزج أسرار المواهب اللدنية (شرح الزرقاني

على المواهب): محمد عبد الباقي الزرقاني، متوفى ١١٢٢ هـ، دار الكتب العلمية، بيروت،

الطبعة الأولى ١٤١٧ هـ.

١٠١- دلائل النبوة ومعرفة أحوال صاحب الشريعة: إمام أبو بكر أحمد بن حسين البيهقي،

متوفى ٤٥٨ هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٥ هـ.

١٠٢- دلائل النبوة: أبو نعيم أحمد بن عبد الله الأصفهاني، متوفى ٤٣٠ هـ، دار النفائس، بيروت

الطبعة الثالثة ١٤٠٦ هـ.

١٠٣- الروض الأثف: أبو القاسم عبد الرحمان بن عبد الله السهيلي، متوفى ٥٧١ هـ، دار الكتب

العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٨ هـ.

١٠٤- سبل الهدى والرشاد في سيرة خير العباد: إمام محمد بن يوسف الصالحي الشامي،

متوفى ٩٤٢ هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٤ هـ.

١٠٥- سيرة النبي: علامة شبلي نعماني، علامة سيد سليمان الندوي، الفيصل ناشران وتاجران

كتب، لاهور.

١٠٦- السيرة النبوية: محمد بن إسحاق بن يسار المطلبي المدني، متوفى ١٥١ هـ، دار الكتب

العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٤ هـ.

١٠٧- شرح الشفا: علي بن سلطان القاري، متوفى ١٠١٤ هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة

الأولى ١٤٢١ هـ.

- ١٠٨ - الطبقات الكبرى: محمد بن سعد بن منيع الظهري، متوفى ٢٣٠هـ، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٧هـ. وط: مكتبة الخانجي القاهرة، الطبعة الأولى ١٤٢١هـ، وط: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثانية ١٤٣٣هـ.
- ١٠٩ - عيون الأثر في فنون المغازي والشمال والسير: أبو الفتح محمد بن محمد بن سيد الناس البصري، متوفى ٧٣٤هـ، مكتبة دار التراث، المدينة المنورة،
- ١١٠ - كفاية الطالب اللبيب في خصائص الحبيب ﷺ (الخصائص الكبرى): إمام جلال الدين السيوطي، متوفى ٩١١هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٥هـ. وط: دار الكتب الحديثية، القاهرة.
- ١١١ - مدارج النبوة فارسي: شيخ عبد الحق محدث دهلوي، متوفى ١٠٥٢هـ، نورية رضوية بيلشنگ كهن، لاهور، طبع دوم ١٩٩٧هـ، وط: مترجم اردو، شبير اندرز، لاهور.
- ١١٢ - مزيل الخفاء عن ألفاظ الشفاء: علامة أحمد بن محمد الشمسي، متوفى ٨٧٢هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثانية ١٤٢٢هـ.
- ١١٣ - المواهب اللدنية بالمنح المحمدية: إمام أحمد بن محمد القسطلاني، متوفى ٩٢٣هـ، المكتب الإسلامي، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٢هـ.
- ١١٤ - نسيم الرياض في شرح الشفاء القاضي عياض: علامة أحمد شهاب الدين الخفاجي المصري، متوفى ١٠٦٩هـ، المطبعة الأزهرية المصرية، الطبعة الأولى ١٣٢٧هـ. وط: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢١هـ.
- ١١٥ - نور العيون في تلخيص سيرة الأمين المأمون: أبو الفتح محمد بن محمد بن سيد الناس البصري، متوفى ٧٣٤هـ، دار المنهاج، جدة، الطبعة الرابعة ١٤٣١هـ.

أُصُولُ حَدِيثِ

- ١١٦ - التبصرة والتذكرة: الحافظ الشيخ زكريا بن محمد الأنصاري السنكي، متوفى ٩٢٥هـ، دار الكتب العلمية، بيروت.

- ١١٧- تحفة الأخيار بإحياء سنة سيد الأبرار: أبو الحسنات محمد عبد الحي اللكنوي،
متوفى ١٣٠٤هـ، دار القلم، دمشق، الطبعة الأولى ١٤١٢هـ.
- ١١٨- فتح المفتاح شرح الفية الحديث: شمس الدين محمد بن عبد الرحمن السخاوي،
متوفى ٩٠٢هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٤هـ، مكتبة دار المنهاج،
الرياض، الطبعة الأولى ١٤٢٦هـ.

أَسْمَاءُ الرِّجَالِ

- ١١٩- الاستيعاب في معرفة الأصحاب: إمام أبو عمرو يوسف بن عبد الله بن محمد بن عبد البر
القرطبي، متوفى ٤٦٣هـ، دار الفكر، بيروت، ١٤٢٦هـ.
- ١٢٠- الإصابة في تمييز الصحابة: حافظ شهاب الدين أحمد بن علي بن حجر العسقلاني،
متوفى ٨٥٢هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٥هـ. وط: مركز هجر للبحوث
والدراسات العربية والإسلامية، القاهرة، الطبعة الأولى ١٤٢٨هـ.
- ١٢١- الإنابة إلى معرفة المختلف فيهم من الصحابة: أبو عبد الله علاء الدين بن قليج
الحنفي، متوفى ٧٦٢هـ، مكتبة الرشد، الرياض، الطبعة الأولى ١٤٢٠هـ.
- ١٢٢- أسد الغابة في معرفة الصحابة: إمام أبو الحسن علي بن محمد المعروف بابن الأثير
الجزري، متوفى ٦٣٠هـ، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٧هـ.
- ١٢٣- إكمال تهذيب الكمال في أسماء الرجال: حافظ علاء الدين مغلطاي بن قليج
الحنفي، متوفى ٧٦٢هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ٢٠١١هـ.
- ١٢٤- التاريخ الصغير: إمام محمد بن إسماعيل البخاري، متوفى ٢٥٦هـ، دار المعرفة، بيروت،
الطبعة الأولى ١٤٠٦هـ.
- ١٢٥- التاريخ الكبير: إمام محمد بن إسماعيل البخاري، متوفى ٢٥٦هـ، مطبعة دائرة المعارف
العثمانية، حيدرآباد دكن.
- ١٢٦- تحرير تقريب التهذيب: دكتور يشار عواد معروف، الشيخ شعيب الأرناؤوط، مؤسسة
الرسالة، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٧هـ.

- ١٢٧- تهذيب تهذيب الكمال في أسماء الرجال: شمس الدين محمد بن أحمد الذهبي، متوفى ٧٤٨هـ، الفاروق الحديثة، القاهرة، الطبعة الأولى ١٤٢٥هـ.
- ١٢٨- تقريب التهذيب: حافظ شهاب الدين أحمد بن علي بن حجر العسقلاني، متوفى ٨٥٢هـ، دار الفكر، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٥هـ.
- ١٢٩- تهذيب التهذيب: حافظ شهاب الدين أحمد بن علي بن حجر العسقلاني، متوفى ٨٥٢هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٥هـ.
- ١٣٠- تهذيب الكمال في أسماء الرجال: حافظ جمال الدين يوسف المزني، متوفى ٧٤٢هـ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الثانية ١٤٠٣هـ.
- ١٣١- لسان الميزان: أحمد بن علي بن حجر العسقلاني، متوفى ٨٥٢هـ، دار البشائر الإسلامية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٣هـ.
- ١٣٢- معرفة الصحابة: أحمد بن عبد الله بن أحمد أبو نعيم الأصبهاني، متوفى ٤٣٠هـ، دار الوطن، الرياض، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ.

مُكْتَبَاتُ عَقَائِدٍ وَكَلَامٍ

- ١٣٣- الإبانة عن شريعة الفرق الناجية ومجانبة الفرق المذمومة: أبو عبد الله عبيد الله بن محمد بن بطة العكبري الحنبلي، متوفى ٣٨٧هـ، دار الريعة، الرياض، الطبعة الأولى ١٤٠٩هـ.
- ١٣٤- الإذاعة لما كان وما يكون بين يدي الساعة: أبو الطيب محمد صديق حسن بخاري قنوجي، متوفى ١٣٠٧هـ، دار ابن حزم، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢١هـ.
- ١٣٥- الأساليب البديعة في فضل الصحابة وإقناع الشيعة، ملحق بشواهد الحق: يوسف بن إسماعيل النبهاني، ١٣٥٠هـ، دار لكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثالثة ١٤٢٨هـ.
- ١٣٦- الإشاعة لأشراط الساعة: محمد بن رسول البرزنجي، متوفى ١١٠٣هـ، دار المنهاج، جدة، الطبعة الثالثة ١٤٢٦هـ.
- ١٣٧- إمام باك اوريزيد پليد: مولانا محمد شفيق أوكازوي، متوفى ١٩٨٤هـ، ضياء القرآن پبلى كيشنر، لاهور، سال اشاعت ٢٠١٧هـ.

- ١٣٨ - أمير معاوية براك نظر: مفتي أحمد يارخان نعمي، متوفى ١٣٩١هـ، مكتبة اسلامية،
ميان مار كيت، غزني ستريت، اردو بازار، لاهور.
- ١٣٩ - أجوبه أربعين، ردرواقص: مولانا محمد قاسم نانوتوي، متوفى ١٢٩٧هـ، اداره
نشرو اشاعت، مدرسه نصره العلوم گوجرانواله، طباعت اول ١٤٠٢هـ.
- ١٤٠ - تحفة انباء عشويه: شاه عبد العزيز محدث دهلوي، متوفى ١٢٢٩هـ، مير محمد كتب خانہ
آرام باغ کراچی.
- ١٤١ - تطهير الجنان واللسان عن ثلب معاوية بن أبي سفيان: علامة أحمد بن حجر الهيتمي
المكي الشافعي، متوفى ٩٧٥هـ، دار الصحابة للتراث بطنطا، الطبعة الأولى ١٤١٣هـ.
- ١٤٢ - حادثه كربلا کاپس منظر: علامة محمد عبد الرشيد النعماني، مكتبة الحسن، لاهور.
- ١٤٣ - حضرت علي اور قصاص عثمان غني: علامة عبد الرشيد نعماني، مكتبة اهل سنت
وجماعت، لياقت آباد، کراچی.
- ١٤٤ - السيف المسلول على من سب الرسول ﷺ: الشيخ تقي الدين علي بن عبد الكافي
السبكي، متوفى ٧٥٦هـ، دار ابن حزم، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٦هـ، وط: دار الفتح
عمان، الأردن، الطبعة الأولى ١٤٢١هـ.
- ١٤٥ - السيف المسلول: قاضي ثناء الله پاني پتي نقشبدي، متوفى ١٢٢٥هـ، مطبع
أحمدي، دهلوي، سنة الطبع ١٢٦٨هـ.
- ١٤٦ - شرح أصول اعتقاد أهل السنة والجماعة: أبو القاسم هبة الله بن الحسن الطبري
المعروف باللالکائي، متوفى ٤١٨هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٣هـ.
- ١٤٧ - شرح العقائد النسفية: إمام مسعود بن عمر سعد الدين تفتازاني، متوفى ٧٩٠هـ، مكتبة
رشيدية، کوئٹہ، وط: مكتبة الحسن، لاهور.
- ١٤٨ - شرح العقيدة الطحاوية: محمد بن علاء الدين بن أبي العز الحنفي، متوفى ٧٩٢هـ،
بتحقيق عبد الله التركي، وشعيب الأرناؤوط، مل مسند ار ساله، بيروت، الطبعة الثانية ١٤١١هـ.

- ١٤٩- شرح العقيدة الطحاوية: محمد بن علاء الدين بن أبي العز الحنفي، متوفى ٧٩٢هـ،
بتخريج الألباني، المكتب الإسلامي، بيروت، الطبعة الثامنة ١٤٠٤هـ.
- ١٥٠- شرح العقيدة الطحاوية: محمد بن علاء الدين بن أبي العز الحنفي، متوفى ٧٩٢هـ،
بتحقيق محمد أحمد شاكر، وزارة الشؤون الإسلامية، الرياض، ١٤١٨هـ.
- ١٥١- شرح المقاصد: إمام مسعود بن عمر الشهير بسعد الدين تفتازاني، متوفى ٧٩٣هـ، عالم
الكتب، بيروت، الطبعة الثانية ١٤١٩هـ.
- ١٥٢- شرح المواقف: السيد الشريف علي بن محمد الجرجاني، متوفى ٨١٦هـ، دار الكتب
العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ.
- ١٥٣- الصواعق المحرقة: أحمد بن حجر الهيتمي المكي الشافعي، متوفى ٩٧٥هـ، مكتبة فياض
منصورة، الطبعة الأولى ١٤٢٩هـ، وط: دار الوطن، الرياض، الطبعة الأولى ١٤١٧هـ.
- ١٥٤- العواصم من القواصم: أبوبكر بن العربي المالكي، متوفى ٥٤٣هـ، دار الكتب العلمية،
بيروت، الطبعة الثالثة ١٤٢٥هـ.
- ١٥٥- العواصم والقواصم في الذب عن سنة أبي القاسم: محمد بن إبراهيم الوزير اليماني،
متوفى ٨٤٠هـ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الثانية ١٤١٥هـ.
- ١٥٦- الفرق بين الفرق: عبد القاهر بن طاهر الإسفرائيني التميمي، متوفى ٤٢٩هـ، دار الكتب
العلمية، بيروت.
- ١٥٧- فيضان أمير معاوية ﷺ: مجلس المدينة العلمية، مكتبة المدينة، كراچی، باراول ٢٠١٦هـ.
- ١٥٨- القول السديد في حكم يزيد: محمد سراج أحمد سعيدي، معاصر، ناشر سنهوا ادبي
اكاديمي، بهاول پور.
- ١٥٩- كتاب الاعتقاد: قاضي أبو العلا صاعد بن محمد بن أحمد الاستوائی النيسابوري، متوفى
٤٣٢هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٦هـ.
- ١٦٠- مختصر تطهير الجنان: اختصره: سليمان بن صالح الخراشي، دار علوم السنة، الرياض،
الطبعة الأولى ١٤٢٢هـ.

١٦١- المعتمد في المعتقد: المروف رساله توريشتي: أبو عبد الله فضل الله التوريشتي، متوفى ٦٦١هـ، نوريه ييلشنگ كميني، لاهور.

١٦٢- المستند المعتمد شرح المعتقد المعتقد: إمام أحمد رضا خان الحنفي الماتريدي، متوفى ١٣٤هـ، النورية الرضوية بيلي كيشنز، لاهور، الطبعة الأولى ١٤٣٥هـ.

١٦٣- منهاج السنة النبوية: أبو العباس أحمد بن عبد الحليم بن تيمية، متوفى ٧٢٨هـ، ناشر جامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامية، الطبعة الأولى ١٤٠٦هـ.

١٦٤- النبراس على شرح العقائد: محمد عبد العزيز فرهاروي، متوفى، مكتبة حقانية، ملتان، وط: مكتبة رشيدية كوثه.

١٦٥- هدية الشيعة: مولانا محمد قاسم نانوتوي، متوفى ١٢٩٧هـ، ادارة تاليفات اشرفيه، ملتان.

علم الأصول

١٦٦- الرسالة: إمام محمد بن إدريس الشافعي، متوفى ٢٠٤هـ، مطبعة مصطفى البابي الحلبي، مصر، الطبعة الأولى ١٣٥٨هـ.

مكتبة فقه كنف

١٦٧- الاختصار لتعليل المختار: إمام عبد الله بن محمد الموصلي الحنفي، متوفى ٦٨٣هـ، دار الرسالة العالمية، الطبعة الأولى ١٤٣٠هـ.

١٦٨- البحر الرائق شرح كنز الدقائق: زين الدين بن إبراهيم المعروف بابن نجيم المصري، الحنفي، متوفى ٩٧٠هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ.

١٦٩- البناية في شرح الهداية: محمود بن أحمد المعروف ببدر الدين العيني، متوفى ٨٥٥هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٠هـ.

١٧٠- بهار شريعت: مولانا أمجد علي أعظمي، متوفى ١٣٧٦هـ، مكتبة المدينة، كراچي.

١٧١- تبين الحقائق شرح كنز الدقائق: فخر الدين عثمان بن علي الزبيعي، ٧٤٣هـ، المطبعة الكبرى الأميرية، ببولاق مصر، الطبعة الأولى ١٣١٤هـ.

- ١٧٢- حاشية الشلبي على تبين الحقائق: شهاب الدين أحمد الشلبي، متوفى ١٠٢١هـ، المطبعة الكبرى الأميرية، بولاق مصر، الطبعة الأولى ١٣١٤هـ.
- ١٧٣- حجة الله البالغة: شيخ أحمد بن عبد الرحيم [شاه ولي الله دهلوي] متوفى ١١٧٦هـ، دار الجيل، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٦هـ.
- ١٧٤- رد المحتار على الدر المختار: سيد محمد أمين ابن عابدين الشامي متوفى ١٢٥٢هـ، دار إحياء التراث العربي، بيروت ١٤١٩هـ.
- ١٧٥- شرح أدب القاضي: حسام الدين عمر بن عبد العزيز مازة البخاري، المعروف بالصدر الشهيد، متوفى ٥٣٦هـ، مطبعة الإرشاد، بغداد، الطبعة الأولى ١٣٩٧هـ.
- ١٧٦- شرح الهداية: أبو الحسنات محمد عبد الحي المكنوي، ١٣٠٣هـ، إدارة القرآن والعلوم الإسلامية، كراچی، الطبعة الأولى ١٤١٧هـ.
- ١٧٧- العناية في شرح الهداية: أكمل الدين محمد بن محمود البابر تي، متوفى ٧٨٦هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٥هـ.
- ١٧٨- فتاوى رضوية: إمام أحمد رضا حنفی، متوفى ١٣٤٠هـ، مكتبة رضوية آرام باغ، كراچی، وط: رضا فاؤنڈیشن، نظامية رضوية، لاہور.
- ١٧٩- فتاوى عزيزي: شاه عبد العزيز محدث دهلوي، متوفى ١٢٢٩هـ، مترجم اردو، ايچ ايم سعيد كمپني، كراچی، سنة الطبع ١٣٨٧هـ.
- ١٨٠- فتاوى قاضي خان: أبو المحاسن الحسن بن منصور المعروف بقاضي خان الأوزجندی افرغاني، متوفى ٥٩٢هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ٢٠٠٩هـ.
- ١٨١- فتح القدير في شرح الهداية: إمام كمال الدين محمد بن عبد الواحد المعروف بابن الهمام، متوفى ٦٨١هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٥هـ.
- ١٨٢- لسان الحكام في معرفة الأحكام: أبو الوليد إبراهيم بن محمد المعروف بابن الشحنة الحلبي، متوفى ٨٨٢هـ، مطبعة الجريدة البرهان، اسكندرية، ١٢٩٩هـ.

- ١٨٣- المبسوط: شمس الأئمة أبو بكر محمد بن أحمد بن أبي سهل السرخسي، متوفى ٥٤٩هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢١هـ، وط: دار المعرفة، بيروت.
- ١٨٤- المحيط البرهاني في الفقه النعماني: برهان الدين أبو المعالي محمود بن أحمد بن عبد العزيز ابن مازة البخاري، متوفى ٦١٦هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٤هـ.
- ١٨٥- النهر الفائق شرح كنز الدقائق: سراج الدين عمر بن إبراهيم ابن نجيم الحنفي، متوفى ١٠٠٥هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٢هـ.
- ١٨٦- الهداية شرح بداية المبتدي: أبو الحسن عبي بن أبي بكر المرغيناني، متوفى ٥٩٣هـ، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٦هـ.

فقه شافعي

- ١٨٧- كفاية الأخيار في حل غاية الاختصار: تقي الدين أبو بكر بن محمد بن عبد المؤمن الحصيني الشافعي، متوفى ٨٢٩هـ، وزارة الأوقاف والشؤون الإسلامية، قطر، الطبعة الخامسة ١٤٣٧هـ.
- ١٨٨- منهج الطلاب: زكريا بن محمد الأنصاري الشافعي، متوفى ٩٢٦هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٧هـ.

مصنفات

- ١٨٩- شرح مذاهب أهل السنة: أبو حفص عمر بن أحمد بن عثمان بن شاهين، متوفى ٣٨٥هـ، الطبعة الأولى ١٤١٥هـ.
- ١٩٠- فتاوى ثنائية: أبو الوفاء الله امرتسري، داره ترجمان السنة، لاهور، تاريخ طباعت فروري ١٩٧٢هـ.

- ١٩١- الموسوعة الفقهية: وزارة الشؤون الإسلامية، الكويت، الطبعة الثانية ١٤٠٤هـ.

ترويج وترويج

- ١٩٢- بغض و كينه: دعوت إسلامي، شعبه اصلاحي كتب، مكتبة المدينة، كراچی.

- ١٩٣- التذكرة في أحوال الموتى وأمور الآخرة : إمام أبو عبد الله محمد بن أبي بكر القرطبي، متوفى ٤٦٨هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٩هـ، وط: مكتبة دار المنهاج، الرياض، الطبعة الأولى ١٤٢٥هـ.
- ١٩٤- تعظيم قدر الصلاة: محمد بن نصر المروزي، متوفى ٣٩٤هـ، مكتبة الدار بالمدينة المنورة، الطبعة الأولى ١٤٠٦هـ.
- ١٩٥- جامع بيان العلم وفضله: إمام أبو عمرو يوسف بن عبد الله بن محمد بن عبد البر القرطبي، متوفى ٤٦٣هـ، دار ابن الجوزي، الدمام، الطبعة الرابعة ١٤١٩هـ.
- ١٩٦- درأ تعارض العقل والنقل: أبو العباس أحمد بن عبد الحليم ابن تيمية، متوفى ٧٢٨هـ، إدارة الثقافة والنشر بالجامعة، السعودية، الطبعة الثانية ١٤١١هـ.
- ١٩٧- ذم الكلام وأهله: أبو إسماعيل عبد الله بن محمد الأنصاري الهروي، متوفى ٤٨١هـ، مكتبة العلوم والحكم، المدينة المنورة، الطبعة الأولى ١٤١٦هـ.
- ١٩٨- صفة النفاق ونعت المنافقين: أبو نعيم أحمد بن عبد الله الأصبهاني، متوفى ٤٣٠هـ، دار البشائر الإسلامية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٢هـ.
- ١٩٩- فضائل صدقات: مولانا محمد زكريا سهارنپوري، متوفى ١٤٠٢هـ، دار الإذاعة، كراچی.
- ٢٠٠- ما ثبت بالسنة عن أعمال السنة: عربي وارث: شيخ عبد الحق محدث دهلوي، متوفى ١٠٥٢هـ، دار الإذاعة، كراچی ١٤٠٣هـ.
- ٢٠١- المحاسن والمساوي: إبراهيم بن محمد البيهقي، كان حياً في سنة ٣٢٠هـ، دار المعارف، مصر.

مُكْتَبَةُ الْأَخْلَاقِ وَتَصَوُّفُ

- ٢٠٢- الطبقات الكبرى: عبد الوهاب الشعراني، متوفى ٩٧٣هـ، مكتبة الثقافة الدينية، القاهرة، الطبعة الأولى ١٤٢٦هـ.

- ٢٠٣- الفترحات المكية: أبو عبد الله محمد المعروف بابن عربي، متوفى ٦٣٨هـ، دار الفكر، بيروت، ١٤١٤هـ، وط: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الثالثة ٢٠١١هـ..

فَضَائِلُ وَمَنَاقِبُ

- ٢٠٤- حضرت سيدنا عمر بن عبد العزيز كي 425 حكايات، منجانب: دعوت إسلامي شعبه اصلاح، مكتبة المدينة، كراچی)

- ٢٠٥- در السحابة في مناقب القراة والصحابه: قاضي محمد بن علي الشوكاني، متوفى ١٢٥٠هـ، دار الفكر، دمشق، الطبعة الأولى ١٤٠٤هـ.

- ٢٠٦- الرياض النضرة في مناقب العشرة: أحمد بن عبد الله الطبري، متوفى ٦٩٤هـ، دار الغرب الإسلامي، بيروت، الطبعة الأولى ١٩٩٦م، وط: دار المعرفة، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٨هـ.

- ٢٠٧- ربحانة النبي ﷺ، سيدنا إمام حسن الطويل: پروفیسر ڈاکٹر محمد حسین آزاد، معاصر، اداره جمالی مصطفیٰ ملتان، اشاعت دوم ٢٠١٩هـ.

- ٢٠٨- شهادت حسین: محی الدین أحمد، المعروف مولانا أبو الکلام آزاد، متوفى ١٩٥٨هـ، مكتبة جمال كرم، لاهور، اشاعت ٢٠١٤هـ.

- ٢٠٩- شهيد كربلاء: مفتي محمد شفيع عثمانى ديوبندى، متوفى ١٣٩٩هـ، دار الإِشاعت، كراچی، طباعت ٢٠٠٧هـ.

- ٢١٠- عبادة بن الصامت ؓ: دكتور و هبة الزحيلي، دار القلم، دمشق، الطبعة الثالثة ١٤٠٨هـ.

- ٢١١- عمار بن ياسر ؓ، رجل المحنة وميزان الفتنة: أسامة بن أحمد سلطان، معاصر، المكتبة المكية، مكة المكرمة، الطبعة الأولى ١٤٣٠هـ.

- ٢١٢- الفصول المهمة في معرفة أحوال الأئمة: علي بن محمد المشهور بابن الصباغ المالكي المكي، متوفى ٨٥٥هـ، دار الأضواء، بيروت، الطبعة الثانية ١٤٠٩هـ.

- ٢١٣- فضائل الصحابة: إمام أبو عبد الله أحمد بن محمد بن حنبل، متوفى ٢٤١هـ، دار ابن الجوزي، الدمام، الطبعة الثالثة ١٤٢٦هـ.

- ٢١٤- كتاب الأربعين في فضائل آل البيت الطاهرين: عبد الله بن صالح بن محمد العبيد، دار البشائر الإسلامية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٣١ هـ.
- ٢١٥- المرتضى عليه السلام: علامة أبو الحسن علي الندوي، متوفى ١٤٢٠ هـ، دار القلم دمشق، الطبعة الثانية ١٤١٩ هـ، وط: مترجم اردو، مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد، كراچی ١٤١٢ هـ.
- ٢١٦- مقصد حسين عليه السلام: علامة محمد إسحاق مدني فيصل آبادي، متوفى ١٣٠١ هـ، سلطان العلماء اكيڈمي، جيلاني پورہ، فيصل آباد.
- ٢١٧- مناقب الإمام أبي حنيفة: إمام موفق بن أحمد الخوارزمي، متوفى ٥٦٨ هـ، دائرة المعارف انظرانية، حيدرآباد دکن ١٣٣٢ هـ.
- ٢١٨- مناقب الإمام أبي حنيفة: إمام محمد بن محمد المعروف بابن البزاز الكردي، متوفى ٨٢٧ هـ، دائرة المعارف انظرانية، حيدرآباد دکن ١٣٣٢ هـ.
- ٢١٩- مناقب سيدنا امير معاوية عليه السلام: ترجمة: تطهير الجنان: مولانا عبد الشكور لکهنوي، مكتبه امداديه، ملتان.

لُغَةٌ

- ٢٢٠- الكامل في اللغة والأدب: إمام أبو العباس محمد المبرد، متوفى ٢٨٥ هـ، مؤسسة الرسالة ناشرون، دمشق، الطبعة الأولى ١٤٢٧ هـ، وط: وزارة الأوقاف والشؤون الإسلامية، السعودية.
- ٢٢١- مصباح اللغات: عبد الحفيظ بليايوي، مدينة ييلشنگ كمپني، كراچی، الطبعة الأولى ١٩٨٢ هـ.
- ٢٢٢- موسوعة كشف اصطلاحات الفنون: علامة محمد بن علي التهانوي، متوفى بعد ١١٥٨ هـ، مكتبة لبنان ناشرون، الطبعة الأولى ١٩٩٦ هـ.
- ٢٢٣- النهاية في غريب الحديث: علامة محمود بن أنير الجزري، متوفى ٦٠٦ هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٨ هـ.

سير و تاريخ

- ٢٢٤- أسماء الخلفاء والولاة وذكر مددهم: ملحق بجوامع السيرة: أبو محمد علي بن أحمد بن سعيد بن حزم، متوفى ٤٥٦هـ، دار المعارف بمصر.
- ٢٢٥- الإعلام بمن في تاريخ الهند من الأعلام، المسمى: عبد الحفي بن فخر الدين الحسيني، اللكهنوي، متوفى ١٣٤١هـ، دار ابن حزم، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٠هـ.
- ٢٢٦- أنساب الأشراف: أحمد بن يحيى المعروف بابن الأثير، متوفى ٢٧٩هـ، دار الفكر، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٧هـ.
- ٢٢٧- البداية والنهاية: عماد الدين إسماعيل بن عمر بن كثير الدمشقي الشافعي، متوفى ٧٧٤هـ، دار ابن كثير، دمشق، الطبعة الأولى ١٤٢٨هـ، وط: دار هجر، الطبعة الأولى ١٤١٧هـ، وط: مترجم اردو، نفيس اكيديمي كراچي، طبع أول ١٩٨٧هـ.
- ٢٢٨- بغية الطلب في تاريخ حلب: كمال الدين عمر بن أحمد المعروف بابن العديم، ٦٦٠هـ، دار الفكر، بيروت.
- ٢٢٩- تاريخ ابن خلدون: عبد الرحمان بن خلدون، متوفى ٨٠٨هـ، دار الفكر، بيروت، ١٤١٢هـ.
- ٢٣٠- تاريخ الإسلام ووفيات المشاهير والأعلام: إمام شمس الدين محمد بن أحمد بن عثمان الذهبي، متوفى ٧٤٨هـ، دار الكتاب العربي، بيروت، الطبعة الثانية ١٤١٠هـ.
- ٢٣١- تاريخ الخلفاء: الإمام الحافظ جلال الدين عبد الرحمان بن أبي بكر السيوطي، متوفى ٩١١هـ، وزارة الشؤون ال.سلامية، قطر، الطبعة الثانية ١٤٣٤هـ.
- ٢٣٢- تاريخ الأمم والملوك: إمام أبو جعفر محمد بن جرير الطبري، متوفى ٣١٠هـ، دار المعارف، بمصر، الطبعة الثانية ١٣٨٧هـ.
- ٢٣٣- تاريخ خليفة بن خياط: إمام أبو عمرو خليفة بن خياط العصفري، متوفى ٢٤٠هـ، دار طيبة، الرياض، الطبعة الثانية ١٤٠٥هـ.
- ٢٣٤- تاريخ دعوت وعزيمت: علامة سيد أبو الحسن علي لندوي، متوفى ١٤٢٠هـ، مجلس

- نشریات اسلام، کراچی.
- ٢٣٥- تاریخ مدینہ دمشق: إمام أبو القاسم علي بن الحسن بن هبة الله بن عبد الله بن عساكر، متوفى ٥٧١هـ، دار الفكر، بيروت، ١٤١٦هـ.
- ٢٣٦- تاريخ مكة: أبو الوليد محمد بن عبد الله الأزرقى، متوفى ٢٤٤هـ، المكتبة التجارية الكبرى، مكة المكرمة، الطبعة الأولى ١٤١٦هـ.
- ٢٣٧- التبيين في أنساب القرشيين: موفق الدين أبو محمد عبد الله بن أحمد ابن قدامة، متوفى ٦٢٠هـ، منشورات المجمع العلمي العراقي، ١٤٠٢هـ.
- ٢٣٨- الجواهر المضية في طبقات الحنفية: محي الدين عبد القادر بن محمد أبو الوفا القرشي الحنفي، متوفى ٧٧٥هـ، دار هجر، جيزة، الطبعة الثانية ١٤١٣هـ.
- ٢٣٩- رجال الفكر والدعوة: علامة سيد أبو الحسن علي الندوي، متوفى ١٤٢٠هـ، دار ابن كثير، دمشق، الطبعة الثالثة ١٤٢٨هـ.
- ٢٤٠- سير أعلام النبلاء: شمس الدين محمد بن أحمد بن عثمان الذهبي، متوفى ٧٤٨هـ، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الحادية العشرة ١٤٢٢هـ.
- ٢٤١- سير الصحابة: شاه معين الدين أحمد ندوي، متوفى ١٩٧٤هـ، دار الإشاعت اردو بازار، كراچی، طباعت ٢٠٠٤هـ.
- ٢٤٢- شفاء الغرام بأخبار البلد الحرام: أبو الطيب تقي الدين محمد بن أحمد بن علي الفاسي، متوفى ٨٣٢هـ، دار الكتاب العربي، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٥هـ.
- ٢٤٣- العبر في خبر من غير: شمس الدين محمد بن أحمد بن عثمان الذهبي، متوفى ٧٤٨هـ، دائرة المطبوعات والنشر، الكويت، ١٩٦٠هـ.
- ٢٤٤- عيون الأخبار: أبو محمد عبد الله بن مسلم بن قتيبة الدينوري، متوفى ٢٧٦هـ، دار الكتاب العربي، بيروت، تصوير ١٣٤٣هـ.
- ٢٤٥- كتاب المعين: محمد بن أحمد بن تميم التميمي، متوفى ٣٣٣هـ، دار الغرب الإسلامي، بيروت، الطبعة الثالثة ١٤٢٧هـ.

- ٢٤٦- كنز الدرر والغرر: أبو بكر بن عبد الله بن أيك الدواداري، بيروت، ١٤١٤هـ.
- ٢٤٧- الكامل في التاريخ: عز الدين أبو الحسن علي بن محمد الشهير بابن الأثير الجزري، متوفى ٦٣٠هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الرابعة ١٤٢٤هـ.
- ٢٤٨- مختصر تاريخ دمشق: إمام محمد بن مكرم المعروف بابن منظور، متوفى ٧١١هـ، دار الفكر، دمشق، الطبعة الأولى ١٤٠٩هـ.
- ٢٤٩- المختصر في أخبار البشر: عماد الدين إسماعيل أبو الفداء، متوفى ٧٣٢هـ، المطبعة الحسينية، مصر.
- ٢٥٠- مرآة الزمان في تواريخ الأعيان: أبو المظفر يوسف بن قزأوغلي، المعروف بسبط ابن الجوزي، متوفى ٦٥٤هـ، الرسالة العالمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٣٤هـ.
- ٢٥١- مروج الذهب ومعدن الجواهر: أبو الحسن علي بن الحسين بن علي المسعودي، متوفى ٣٤٦هـ، المكتبة العصرية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٥هـ.
- ٢٥٢- مسالك الأبصار في ممالك الأمصار: شهاب الدين أحمد بن يحيى، متوفى ٧٤٩هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ٢٠١٠هـ.
- ٢٥٣- المعرفة والتاريخ: أبو يوسف يعقوب بن سفيان الفسوي، متوفى ٢٧٧هـ، مكتبة الدار بالمدينة المنورة، الطبعة الأولى ١٤١٠هـ.
- ٢٥٤- المنتظم في تاريخ الملوك والأمم: أبو الفرج عبد الرحمان بن الجوزي، متوفى ٥٩٧هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤١٢هـ.
- ٢٥٥- وفيات الأعيان وأنباء أبناء الزمان: شمس الدين أحمد بن محمد بن أبي بكر بن خلكان، متوفى ٦٨١هـ، دار صادر، بيروت، سنة الطبع ١٤١٤هـ.

سياسة

- ٢٥٦- الأحكام السلطانية والولايات الدينية: أبو الحسن علي بن محمد بن حبيب الماوردي، متوفى ٤٥٠هـ، مكتبة دار ابن قتيبة، الكويت، الطبعة الأولى ١٤٠٩هـ.
- ٢٥٧- الأحكام السلطانية: قاضي أبو يعلى محمد بن حسين الفراء الحنبلي، متوفى ٤٥٨هـ.

١٤٥٨هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، ١٤٢١هـ.

٢٥٨- اسلام اور جمهوريت: محي الدين أحمد، المعروف مولانا ابوالكلام آزاد، متوفى

١٩٥٨هـ، مكتبة جمال كرم، لاهور، اشاعت ٢٠١٧هـ.

٢٥٩- اسلام کا نظام حکومت: مولانا حامد انصاري غازي، متوفى ١٤١٢هـ، القصص ناشران

وتاجران [تصوير] ٢٠١٥هـ.

٢٦٠- فلسفة ابن رشد: دكتور فرح انطون، مؤسسة هنداوي للتعليم والثقافة، القاهرة،

الطبعة ٢٠١٢هـ.

٢٦١- مآثر الإنافة في معالم الخلافة: أحمد بن عبد الله القلقشندي، متوفى ٨٢١هـ، عالم

الكتب، بيروت.

٢٦٢- مسلمانوں کا عروج و زوال: مولانا سعيد أحمد اكبر آبادي، متوفى ١٤٠٦هـ، ادارہ

اسلامیات، انارکلی، لاهور، اشاعت ١٩٨٣هـ.

٢٦٣- منصب امامت: شاه محمد اسماعيل شهيد متوفى ١٢٤٦هـ، طيب پبلشرز، يوسف

مارکیٹ، اردو بازار، لاهور، اشاعت چہارم ٢٠٠٨هـ.

کُتُب مُتَفَرِّقَة

٢٦٤- الأوائل: حسن بن عبد الله بن سهل أبو هلال العسكري، متوفى ٣٩٥هـ، دار البشير للثقافة

والعلوم الإسلامية، طنطا، الطبعة الأولى ١٤٠٨هـ.

٢٦٥- الأجوبة الفاضلة للأسئلة العشرة الكاملة: عبد الحي اللكنوي، متوفى ١٣٠٤هـ،

مكتب المطبوعات الإسلامية، بحلب، الطبعة الثالثة ١٤١٤هـ.

٢٦٦- الإمام الصادق (عليه السلام): شيخ محمد أبو زهرة مصري، متوفى ١٣٩٤هـ، مطبعة أحمد علي

مخير، مصر.

٢٦٧- حلم معاوية: أبو بكر عبد الله بن محمد بن عبيد بن سفيان المعروف بابن أبي الدنيا،

متوفى ٢٨١هـ، دار البشائر الإسلامية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٣هـ.

٢٦٨- حياة الحيوان الكبرى: كمال الدين محمد بن موسى الدميري، متوفى ٨٠٨هـ، دار

- البشائر، دمشق، الطبعة الأولى ١٤٢٦هـ.
- ٢٦٩- رسائل ابن حزم: أبو محمد علي بن أحمد بن حزم الأندلسي، متوفى ٤٥٦هـ، المؤسسة العربية، بيروت، الطبعة الثانية ١٩٨٧هـ.
- ٢٧٠- عطار الجنان ترجمه حيات الحيوان: أبوزين محمد اقبال قادري، معاصر، أكبر بك سيلرز، لاهور، اشاعت ٢٠١٣هـ.
- ٢٧١- العقد الفريد: أحمد بن محمد بن عبدربه الأندلسي، متوفى ٣٢٨هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٠٤هـ.
- ٢٧٢- كتاب الأوائل: أبريك أحمد بن عمرو بن أبي عاصم، متوفى ٢٨٧هـ، دار الخلفاء للكتاب الإسلامي. وط: دار البشائر الإسلامية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٥هـ.
- ٢٧٣- كليات اقبال (أردو): علامة محمد اقبال، متوفى ١٩٣٨هـ، الفيصل، شيخ غلام علي ايند سنز، لاهور.
- ٢٧٤- مقدمة ابن خلدون: عبد الرحمان بن محمد بن خلدون، متوفى ٨٠٨هـ، دار نهضة مصر، الطبعة السابعة ٢٠١٤هـ.
- ٢٧٥- ملفوظات اعلى حضرت: إمام أحمد رضا بريلوي، متوفى ١٣٤٠هـ، مكتبة المدينة كراچي، اشاعت ١٤٣٩هـ.
- ٢٧٦- النصيحة للراعي والرعية: أبو الخير بدل بن أبي المعمر بن إسماعيل التبريزي، متوفى ٦٣٦هـ، دار الصحابة للتراث بطنطا، الطبعة الأولى ١٤١١هـ.
- ٢٧٧- نهاية الأرب في فنون الأدب: شهاب الدين أحمد بن عبد الوهاب النويري، متوفى ٧٣٣هـ، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٤هـ.

فہرست مضامین

۳۷	۶	۱	ہدایہ
۳۸	۷	۲	اظہار تشکر
۳۸	۹	۳	حمد و صلاۃ
۴۰	۹	۴	مقصد تالیف
۴۱	۱۱	۵	انعام یافتہ اور انعام پذیر
۴۴	۱۳	۶	ازلی منتخب ہستیوں سے بھی لڑائی؟
۴۵	۱۵	۷	نشہ خمار اور نشہ اقتدار
۴۸	۱۷	۸	طلاق کے متعلق الفاظ نبوی ﷺ کا پورا ہونا
۴۸	۲۳	۹	حب اقتدار پھر اجتہاد؟
۵۰	۲۹	۱۰	زاویہ نگاہ اپنا پنا
۵۰	۳۰	۱۱	اعتناء
۵۰	۳۰	۱۲	ضروری وضاحت
۵۱	۳۱	۱۳	تذکرہ صلح از کتب حدیث و تاریخ
۵۲	۳۱	۱۴	صلح امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام از حدیث نبوی ﷺ
۵۲	۳۳	۱۵	امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی خصوصیت
۵۴	۳۴	۱۶	دست برداری امام میں صوفیانہ نکتہ
۵۶	۳۵	۱۷	امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی خصوصیت کلمہ از
۵۷	۳۶	۱۸	امام حسن علیہ السلام کو سید فرمانے میں لطیف حکمت
۵۷	۳۶	۱۹	کیا صلح میں اہیت معاویہ مد نظر تھی؟

۵۸	معادیہ کی معزولی اور بغاوت	۹۹	﴿وَنَزَعْنَا مَا فِيهِمْ﴾ کا مصداق کون؟
۶۰	امت مسلمہ کی تقسیم کا سبب اول	۱۰۰	جنتی ہونا کس خاتمہ پر موقوف
۶۱	نااہل کو منصب سونپنے کا نتیجہ	۱۰۶	کیا رجس سے پاک سینے میں بھی کینہ؟
۶۱	کیا معاویہ کو اختیار (پسند) کیا گیا تھا؟	۱۰۷	ارجس اور طہارت کا اجتماع ممکن ہے؟
۶۳	اقتدار کے لیے معاویہ کی تیاریاں اور کوششیں	۱۰۹	مرقعی علیہ السلام کے سینے میں بھی کینہ؟
۶۶	نزاکت حالات اور امام کی دست برداری	۱۱۱	عی کے خلاف سینے بھر پورا زکینے
۶۷	بعض اکابر کی تضاد بیانی	۱۱۳	صحابی کا سیدہ اور کینہ؟
۶۸	چند محدثین کرام کا تکلف	۱۱۶	شاہ عبدالعزیز اور حکیم کے اقواس کا جائزہ
۷۰	اقتدار چھوڑنے کی وجہ خود امام پاک کی زبانی	۱۱۶	قول ابن عباس اور قول اعلیٰ حضرت میں غور
۷۲	امام پاک کے سامنے دو مصیبتیں تھیں	۱۹	ملت عثمان علیہ السلام یا ملت محمد ﷺ؟
۷۳	امام پاک کو صلح پسند تھی یا معاویہ؟	۱۲۶	کیا ملت معاویہ بھی تھی؟
۷۸	کیا اقتدار ملنا پسندیدگی کی دلیل ہے؟	۱۲۸	نص کے مقابلہ میں رائے کا حکم
۷۹	”هَذَنَةُ عَلِيٍّ ذَخِينٌ“ نبوی پیش گوئی	۱۳۰	نص کے مقابل ذاتی رائے شیخین کی نظر
۸۱	عام البراءت کی حقیقت	۱۳۳	بعض حکماء سے سوال
۸۲	ظلمات و کدورت پر جماعت	۱۳۳	معاویہ کو امام پاک کیوں ناپسند تھے؟
۸۵	خلیفہ اور سلطان میں فرق، از قاضی بریلی	۱۳۵	تنبیہ
۸۷	”أَصْحَابِي كَالنَّجُومِ“ کے مؤیدین سے	۱۳۷	ایک ہی صف میں معاویہ و ابن العاص
۸۹	میں بعض مضیلین کو معاون نہیں بنا سکتا، علیؑ	۱۳۸	قتل و قصاص سے مطلوب تک رسائی
۹۳	مولانا بنوری کا بصیرت افروز تبصرہ	۱۳۹	وہی قاتل وہی نوحہ خواں
۹۵	ہماری عقیدت کا عالم	۱۴۰	امام حسن کے لیے کہنے کی تصریح
۹۶	صلح امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام و معاویہ	۱۴۳	حدیث مقدم بن معدیکرب کی تحقیق
۹۷	جامعین کے قلوب میں کدورت تھی	۱۴۵	”أَتَرَاهَا مُصِيبَةً؟“ کا قائل کون؟
۹۸	بعض حکماء کی حکمتیں	۱۴۶	شہادت حسن پر قلب کو اطمینان ہو گیا

۱۹۴	مولیٰ علیؑ سے سوتیلے سلوک، لمحہ فکر یہ	۱۵۱	بعض شارحین کا تکلف اور اس کا بطلان
۱۹۴	شرائط صلح	۱۵۴	اہل بیت سے بغض تو سلطان خوش
۱۹۴	خلفت پھر امام کو لوٹنا ناہوگی	۱۵۷	حدیث مقدمہؑ کی روشنی میں چند سوالات
۱۹۵	بعض معاصرین کی غلط فہمی	۱۶۲	ناصبیت کہاں سے چلی؟
۱۹۹	معاویہ صلح پر اتنا خوش کیوں؟	۱۶۵	حیاء الحیوان کے ترجمہ میں خیانت
۲۰۰	تبعین عی کو چھیڑا نہیں جائے گا	۱۶۷	صلح اور پسند میں فرق
۲۰۰	کتاب وسنت پر عمل کرنا ہوگا	۱۶۸	لفظ صلح کی غوی اور اصطلاحی تعریف
۲۰۱	معاویہ کسی کو اپنا ولی عہد نہیں بنائے گا	۱۶۹	مصلح کون اور مقصد کون؟
۲۰۲	خلفاء راشدینؑ کے طریقے پر چلنا ہوگا	۱۷۱	فسادی اور فساد کو اختیار کیا جاتا ہے یا دفع؟
۲۰۲	معاویہ کے بعد معاملہ شوریٰ طے کرے گی	۱۷۲	امام حسن کو فساد کا امکان نہیں یقین تھا
۲۰۳	مولیٰ علیؑ پر سب و شتم نہیں کیا جائے گا	۱۷۳	صلح کے باوجود مکرو خدع کا خدشہ
۲۰۴	کچھ مالی شرائط	۱۷۳	جامعین سے کدورت تھی، اب مسلم کیا کرے؟
۲۰۴	شرائط مذکورہ پر عمل کتنا ہوا؟	۱۷۴	وجود صلح
۲۰۵	پہلی شرط کی دھجیاں کیسے اڑائی گئیں؟	۱۷۷	سیدنا امام حسن مجتبیٰؑ کی فراست
۲۰۶	دوسری شرط کا حشر و نشر	۱۷۸	امام حسن مجتبیٰ اور مولانا رضیؑ کی یقینی ہم آہنگی
۲۰۶	تیسری شرط کا ستیاناس	۱۸۱	اہل بیت محفوظ یا معصوم؟
۲۰۷	خلفاء راشدینؑ کی سیرت کی شرط کیوں؟	۱۸۳	محفوظ الاقوال کا معاویہ کے بارے میں موقف
۲۰۷	علامہ پرہاروی کی تضاد بیانی	۱۸۴	امام حسینؑ کے ہاں مقام معاویہ
۲۱۰	خلیفہ اور ملک... میں زمین و آسمان کا فرق	۱۸۵	بعض علماء ہند کا محل نظر استدلال
۲۱۲	بعض نامور علماء کا تکلف	۱۸۶	صلح میں امام حسنؑ کی مجبوریاں
۲۱۵	خلیفہ اور بادشاہ کے لیے الگ الگ قانون؟	۱۸۸	معاویہ کے ساتھ صلح میں عزت نہیں
۲۱۶	کیا تقدیر کا بہانہ چلے گا؟	۱۸۸	اکابر پرستی یا حق پرستی؟
۲۱۸	شوریٰ کی شرط کا کیا حشر ہوا؟	۱۸۸	مضطر کیلئے ممنوعات کا استعمال مباح یا محبوب؟

۲۱۹	مشورہ کی بجائے دھمکی اور کذب بیانی	۲۵۴	سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کا تدبیر
۲۲۳	شاہی لغت میں رضا و رغبت کا مفہوم	۲۵۴	بادشاہ پھر اعتراضات و مواخذہ سے مستثنیٰ؟
۲۲۶	مشورہ تو کیا کتاب و سنت ہی مسترد	۲۵۵	سب و شتم نہ کرنے کی شرط دہجیاں
۲۲۷	جو برسر اقتدار، جائز و ناجائز پر اُسی کا اختیار	۲۵۶	صلح حسن کی رٹ لگانے والوں سے سوال
۲۲۹	حاکم کے ”جائز“ سے کتنے ”جائز“ ناجائز	۲۵۶	چھٹی شرط کا حلیہ کیسے بگاڑا؟
۲۳۰	تقریر یزید میں بعض حکماء امت کی فکر	۲۵۷	کیا کوئی ایک شرط پوری بھی ہوئی؟
۲۳۱	بعض حکماء امت کی تردید میں عبارات علماء	۲۶۰	تنبیہ
۲۳۲	مشہور فقیہ و فلسفی ابن رشد کی فکر اسلام	۲۶۱	عہد شکن کے بارے میں حکم
۲۳۳	مولانا ابوالکلام آزاد کی فکر اسلام	۲۶۳	مالکان کو شرمناک اور طلاق و ذوالحطاء؟
۲۳۵	شیخ ابو ہریرہ مصری کی فکر اسلام	۲۶۳	کیا رعایا کا حق رعایا کو دینا سخاوت ہے؟
۲۳۶	کیا فکر صدیق اور فکر طلحہ برابر ہیں؟	۲۶۶	در بار معاویہ میں اُس کی سخاوت کا پول
۲۳۷	کیا خلیفہ اول نے ... اپنا ولی عہد بنایا تھا؟	۲۶۸	انصار سے ترجیحی سلوک کا اولین مرتکب
۲۴۰	مولانا حامد انصاری غازی کی فکر اسلام	۲۷۱	کچھ دے کر اترانا بھی تو واضح؟
۲۴۲	مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی فکر اسلام	۲۷۲	تنبیہ:
۲۴۳	مولانا محمد اسماعیل روپڑی کی فکر اسلام	۲۷۲	اعلیٰ ظرف ہستیوں کا انداز
۲۴۴	مولانا شبلی نعمانی کی فکر اسلام	۲۷۳	کیا حق دار کو اُس کا اپنا مال دینا سخاوت ہے؟
۲۴۵	اسلام میں استبداد کا آغاز کب ہوا؟	۲۷۵	حُب دنیا میں مبتلا بنی کیونکر؟
۲۴۵	بنو امیہ کی حکومت غیر اسلامی تھی	۲۷۶	کیا صحابی بھی حُب دنیا میں مبتلا ہو سکتا ہے؟
۲۴۸	عبارات علماء میں فرق اور اُس کی وجہ	۲۷۹	ائم یزید کے ساتھ شادی پر شاہ خرچیاں
۲۴۹	حکیم الامت کی فکر ملوکیت	۲۸۴	امام حسن علیہ السلام پر انزام کیوں آئے گا؟
۲۵۰	حکیم الامت کی انوکھی حکمت	۲۸۵	امام البغاة اور فسق
۲۵۲	حاکم اگر صحابی ہو تو مواخذہ سے مستثنیٰ ہوتا ہے؟	۲۸۷	امام البغاة اور ظلم
۲۵۳	نبوت کے علاوہ کوئی چیز گناہ پر دلف نہیں	۲۹۰	معیار اہلیت میں صحابہ اور فاضل بریلی میں

۳۳۸	بے جا حمایت میں حد ہی کر دی	۲۹۳	معاذ اللہ کیا اسلاف کرام فاجر تھے؟
۳۳۹	اتباع میں مقدم کون، بزرگ یا حق؟	۲۹۵	"وَمَنْ يَكُنْ يَطْعُنْ فِي مُعَاوِيَةَ" کا جائزہ
۳۴۰	قوت اقتدار کا سحر	۲۹۶	نیکی و بدی کی جزا و سزا کا تعین، کس کا منصب؟
۳۴۲	علماء حق سے ناجائز دفع کیوں؟	۲۹۸	صحابی غیر عادل اور تابعی، دل تو افضل کون؟
۳۴۵	"لَا تَذْكُرُوا مُعَاوِيَةَ إِلَّا" کا بطلان	۳۰۰	عمر بن... افضل یا معاویہ، یہ سوال کیوں پیدا ہوا؟
۳۴۶	علامہ البانی کا تضاد	۳۰۲	سب شروع کرنے اور بند کرنے والا برابر؟
۳۴۷	"لَا تَذْكُرُوا" کے شان و رو کا جھوٹا ہونا	۳۰۳	تعصب سے حقائق اوجھل ہو جاتے ہیں
۳۵۰	متن درست نہ ہو تو اُس کا راوی صحابی نہیں	۳۱۰	﴿وَكَلَّا وَعَدَ اللَّهُ﴾ سے استدلال کا جائزہ
۳۵۲	اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ پر تقدیم؟	۳۱۳	اصل فتح صلح حدیبیہ ہے، قول محقق
۳۵۳	دستِ حلقاء پر بیعتِ اطاعت؟	۳۱۵	حدیبیہ کی بجائے فتح مکہ کیوں مشہور ہو گئی؟
۳۵۶	خلیفہ یا حاکم اسلام کی بیعت کی حقیقت	۳۲۰	﴿وَكَلَّا وَعَدَ اللَّهُ﴾ کی حیران کن تفسیر
۳۵۸	بیعت اور پھر تافرمائی؟	۳۲۲	طلاق کو بھی مکمل مستقبل معاف؟
۳۵۹	تنبیہ:	۳۲۳	کتاب و سنت کے منافی تفسیر
۳۶۰	مملکت پذیر یقوت و بغاوت	۳۲۶	تفسیر رضوی سے اکابر صحابہ و... کی بے خبری
۳۶۱	بیٹا خون بہانے سے مجتنب رہا اور پایا نے؟	۳۲۷	امام حسن بصری ؒ کی بے خبری
۳۶۶	ماخذ و مراجع	۳۲۹	سیدنا حجر بن عدی ؒ کی بے خبری
۳۹۲	فہرست مضامین	۳۲۹	سیدنا غمار بن یاسر ؒ کی بے خبری
۳۹۷	مصنف کی دوسری تصانیف	۳۳۱	امام عالی مقام رحمہ اللہ کی بے خبری
		۳۳۱	ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ کی بے خبری
		۳۳۲	سیدنا علی ؒ کی بے خبری
		۳۳۳	نبی کریم ﷺ کی (معاذ اللہ) بے خبری
		۳۳۴	﴿وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ کی صحیح تفسیر
		۳۳۷	بعض طلقاء کی خاطر ترجمہ میں تبدیلی

أشواہ المرفان فی أسماء القرآن (کامیابی قیاد)

رکاوٹیں اور ان کا ازالہ، ختم قرآن میں شمولیت اور ختم قرآن کے وقت دعا کی مقبولیت وغیرہ۔

شَرْحُ خَصَائِصِ عَلِيِّ ؑ (مطبوع، الطبعة السادسة)

چند خصوصیات :

- ✽ مکمل عربی متن مع سند
- ✽ سابقہ عربی طبعات کی غلطیوں کی اصلاح
- ✽ ہر حدیث کی کھس تخریج و تشریح
- ✽ سند کے لحاظ سے علماء اصول حدیث سے ہر حدیث پر حکم
- ✽ ہر حدیث پر وارد ہونے والے تمام اعتراضات کا متین جواب
- ✽ مصنف (امام نسائی رحمہ اللہ) کے قائم فرمودہ عنوانات کی روشنی میں خصوصیات مرتضوی
- ✽ متن میں مذکور بیہمتی پاک رحمہ اللہ کا تعارف اور ان کے اہم فضائل و خصائص
- ✽ جدید و قدیم تمام نامحیی اعتراضات کا انتہائی علمی اور مہذب رد
- ✽ علماء و مشائخ اہل سنت و اہل بیت پر کاتھم کی گرا نقدر تقریظات
- ✽ پانچ سو سے زائد آخذ و مراجع (کتابیات) کی فہرست مع سند طباعت اور مطبع و غیرہ
- ✽ صفحات (1150) گیارہ سو پچاس
- ✽ مکمل بیرونی طرز طباعت و با سندنگ اور امپورٹڈ کاغذ۔



ۛ اذان مغرب و اقامت کے مابین وقفہ (مطبوع)

مغرب کی اذان اور اقامت (تکبیر) کے درمیان مناسب وقفہ کے ثبوت میں پہلی کاوش۔

لطافت حسب مصطفیٰ ﷺ (مطبوع)

افانک مصطفیٰ

نبی کریم ﷺ کے جسم اقدس کی نفاست و لطافت
اور فضلات شریفہ کی طہارت و برکت کے موضوع پر
اپنی مثال آپ کتاب۔

تصنیف:

قاری ظہور احمد فیضی

مکتبہ باب العلاء
لاہور، پاکستان

مطبوع

أسنى المطالب في مناقب
أمير المؤمنين علي بن أبي طالب عليه السلام

تصنيف:

امام ابو الخير شمس لدين محمد بن محمد الجزري المقرئ الشافعي متوفى ٨٣٣هـ،
صاحب "حصن حصين" اور صاحب "المقدمة الجزرية"۔

ترجمة، تحرير، تحقيق، نشر
قاری ظہور احمد فیضی

مکتبۃ اہل العلم
کراچی، پاکستان

مطبوع

اللَّهُمَّ إِنَّهُمْ مِنِّي وَأَنَا مِنْهُمْ
 "اے اللہ! یہ مجھے ہیں اور میں ان سے ہوں"

اہل بیت کرام کے ساتھ
 ”الْعَلَيْهِ السَّلَامُ“

کہنے / لکھنے کا مسئلہ

تالیف:

قاری ظہور احمد فیضی

مکتبۃ باب العلم
 لاہور، پاکستان

مطبوع

كِتَابُ

الْإِبْعَارِيَّةُ

فِي فَصَائِلِ آلِ الْبَيْتِ الطَّاهِرِينَ

تَصْنِيفُ

عَبْدُ اللَّهِ بْنُ صَالِحِ بْنِ مُحَمَّدٍ الْعَبِيدِ

أستاذ كلية الشريعة ووكيل مركز دراسات الطالبات
بجامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامية، الرياض

ترجمة، تحرير، تحقيق، نشر

قاري ظهوز أحمد فيضي

مكتبة باب العلم

لأنهم لا ينطقون

زیر طبع وزیر ترتیب تصانیف و شروح

الشَّيْخُ الْإِسْلَامُ الْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ

لِلْإِمَامِ أَبِي عَيْسَى مُحَمَّدَ بْنَ عَيْسَى التِّرْمِذِيِّ

(٢٠٩ - ٢٧٩ هـ)

ترجمة، تخريج، تحقيق، نشر
قاري ظهوزاحد فيضی

مكتبة باب العلم
لا اله الا الله

مطبوع

شیخ

انوار العرفان

فی

اسماء القرآن

اسماء قرآن کی مدنی میں فضائل و علوم قرآن اور مقام
صاحب قرآن ﷺ پر ان کی نوعیت کی پہلی کتاب

تصنیف

قاری ظہور احمد فیضی

ریفرج کال: جامعہ اسلامیہ لاہور

مکتبہ باب العلم

لاہور پاکستان

مطبوع

اتقوا الناس ثم اتقوا الله من الخیر والشر
وإذا كنتم في شك من شيء من ما كنتم
تفعلون فاستشارواهم

الاحادیث الموضوعة
في
فضائل معاوية

تأليف
قاری ظہور احمد فضلی

ریسرچ سکار: جامعہ اسلامیہ لاہور

مکتبۃ باب العلم

لاہور، پاکستان

مطبوع

بِخِصِّ
إِمَامِ السَّالَةِ الْفَاطِمِيَّةِ
فِي الْمَنَاقِبِ وَالْفَضَائِلِ

المعروف

مَنَاقِبُ الزَّهْرِ

تصنيف

إِمَامُ زَيْنِ الدِّينِ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ الرَّؤُوفِ الْمَنَافِي
مُتَوَفَى ٨١٠ هـ

ترجمة، تخریج، تحقيق، نشر

قَارِي ظَهْرًا أَحْمَدُ فَيْضِي

مَكْتَبَةُ بَابِ الْعِلْمِ
لَا يُؤْمَرُ بِكَشْفِكَ

This image shows a single sheet of white paper with horizontal blue or grey ruling lines. The lines are evenly spaced and run across the width of the page. There is no handwriting or other markings on the paper.



